قوتِ اقتدار

ایک جدید معاشرتی تجزیہ

برٹرنڈرسل

ترجمہ: ریاض محمود انجم

قوتِ اقتدار

قوت اقتدار

ایک جدید معاشرتی تجزیہ

برٹرنڈ رسل

ترجمہ: ریاض محمود انجم

فکشن ہاؤس
18- مزنگ روڈ لاہور
فون: 7249218-7237430
E-mail:FictionHouse2004@hotmail.com

"Power" A New Social Analysis

BY BERTRAND RUSSELL

نام کتاب : قوتِ اقتدار

ایک جدید معاشرتی تجزیہ

مصنف : برٹرنڈ رسل

ترجمہ : ریاض محمود انجم

پبلشرز : فکشن ہاؤس

18-مزنگ روڈ، لاہور

فون:7249218-7237430

اہتمام : ظہور احمد خاں

کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور

پرنٹرز www.KitaboSunnat.com

سرورق : عباس

اشاعت : 2009ء

قیمت : 300/- روپے

ہیڈ آفس : 18-مزنگ روڈ لاہور، پاکستان

برانچ لاہور

124- ٹیمپل روڈ لاہور

فون:042-7321040

سب آفس حیدر آباد

52,53 رابعہ اسکوائر حیدر چوک گاڑی کھاتہ حیدر آباد

فون:022-2780608

فہرست

تعارف

اپنی زندگی کے آخری ایام تک برٹرنڈ رسل اپنے اصولوں اور نظریات پر چٹان کے مانند قائم رہا۔ برطانیہ کے سب سے زیادہ ممتاز طبقہ امراء کے ایک خاندان کی حیثیت سے ایک تو وہ اپنے سلسلہ ءنصب پر فخر کرتا تھا، اور دوسرے، وہ سرد اور بے مہر ملکہ کے ساتھ تقریباً تیس سالہ تعلقات کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتا تھا جس نے اسے ایک عہد آفریں نام عطا کیا۔ درحقیقت اپنے اصولوں اور نظریات پر چٹان کی مانند قائم، رسل کی زندگی کے حالات وواقعات مسلسل یہی بتاتے ہیں کہ نہ صرف وہ تاریخ عالم کا ایک حصہ تھا بلکہ اس کی اقدار اور ذہنی رویہ وطرز عمل کسی بھی زمانے کے افراد کے لئے قابلِ تکریم اور قابلِ ترجیح تھا۔ اپنے اصولوں اور نظریات کا محافظ یہ برطانوی خوشحال، اصولوں کا پکا اور پُر اعتماد شخص تھا اور انیسویں صدی کے عرصے کے دوران بلاشبہ اس نے انسانی عزم و ہمت کے ہر میدان میں شاندار کامرانی و کامیابی حاصل کی۔ اس زمانے میں جب سیاست، مطلق العنانی سے جمہوریت میں تبدیل ہو گئی تھی، اخلاقی اقدار کی ظالمانہ نوعیت شائستگی میں تبدیل ہو گئی تھی، خیالات کا افسانوی رنگ سائنس کی شکل اختیار کر چکا تھا، اور دولت بادشاہوں کے ہاتھوں سے نکل کر عوام تک پہنچ چکی تھی، رسل نے ہر معاملے اور پہلو کے متعلق اپنے مخصوص نظریات پیش کرنے میں چنداں پس وپیش نہ کی۔ یہ امر یقینی، رسل نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ یہ بہتری واصلاح، مایوسی کا مظہر نہ تھی، اور اس نے جلد ہی یہ اعتراف کر لیا کہ اس کا خصوصی سماجی وعلمی مرتبہ ایک خاص حد تک محدود ہو گیا تھا۔ بہر حال آخری دم تک رسل اپنے اس موقف پر قائم رہا کہ وکٹورین عہد کا برطانیہ ایک ایسے معاشرے پر مشتمل تھا جس کے افراد عظیم کامیابیاں حاصل کرتے تھے، ان کے اہداف ومقاصد بلند وبالا تھے اور انتہائی بالغ نظر بھی

تھے۔۔۔یعنی ایک ایسا معاشرہ جو کسی بھی سابقہ معاشرے سے برتر تھا اور وہ اس معاشرے میں پیدا ہونے پر بغیر ندامت محسوس کیے احساسِ تفخر محسوس کرتا تھا۔

رسل کی نظر میں ترقی، مثبت اور اثباتی رویوں، روشن خیالی اور کامیابیوں پر مشتمل بے غرض اور معصوم دور کا اختتام نہایت ہی ناخوشگوار اور افسوسناک انداز میں ہوا۔ کئی ایک ہم عصر اور بعد میں آنے والے مورخین کے مطابق، رسل کے لئے، جنگ عظیم، گلیڈسٹون کی اس آزاد خیال دنیا کے خاتمے کا ایک حقیقی اشارہ ثابت ہوئی جس دنیا میں رسل، اپنی بالغ عمر کو پہنچا تھا۔ طبقہء اشرافیہ کی نوعیت کے متعلق اس کے آزاد خیال نظریات کی جو کچھ بھی حقیقت ہو، رسل یہ سمجھنے میں مکمل طور پر حق بجانب تھا کہ پہلی جنگ عظیم کے باعث اس کی زندگی میں مکمل انقلاب رونما ہو گیا۔ اس جنگ عظیم کے باعث اس کے روزمرہ معمولاتِ زندگی میں تبدیلی واقع ہو گئی اور اس کی فوری عالمانہ مصروفیات میں تغیر و تبدل برپا ہو گیا بلکہ اس کی ذہنی اور عالمانہ توانائیوں نے ایک نیا راستہ اختیار کر لیا، اس کے سیاسی جذبات میں پختگی پیدا ہو گئی، اور عوام کی نظر میں اس کی ساکھ اور شہرت مزید بہتر ہو گئی۔ خاص طور پر، جنگ ——یا زیادہ صحیح طور پر، اس کی طرف سے جنگ کی شدید اور اٹل مخالفت کے باعث، اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ ایک علمی عالم کی حیثیت سے اپنی الگ تھلگ اور گوشہ نشینی پر مشتمل زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر کے ایک تو مخلص اور پُرعزم کارکن کے مانند اپنی زندہ اور مستعد حیثیت اور وجود کا ثبوت مہیا کرے اور دوسرے فلسفے اور منطق جیسے محدود مسائل و معاملات سے اپنی عالمانہ توجہ ہٹا کر سیاست، تعلیم اور تاریخ جیسے وسیع النظر اور فکر انگیز معاملات پر اپنی توجہ مرکوز کرے۔ اور ان وسیع النظر اور فکر انگیز معاملات و مسائل پر توجہ مرکوز کرنے کے باعث 1938ء میں یہ کتاب ''اقتدار'' منصۂ شہود پر آئی ——ایک ایسی کتاب جس کے لئے رسل کے دل میں حوصلہ مند خواہشات اور جرأت مندانہ توقعات مچل رہی تھیں۔

جنگ عظیم کے آغاز کے وقت رسل ہارورڈ یونیورسٹی میں اپنے چھ ماہ قیام کے بعد واپس کیمبرج پہنچ چکا تھا، اور وہ اس وقت اپنی عالمانہ اور فاضلانہ شہرت کے عروج پر تھا۔ کیمبرج میں اس نے منطق اور فلسفہء ریاضی کے مضامین میں مدرسی حاصل کر لی جبکہ یہ دونوں مضامین خاص طور پر کیمبرج میں صرف اسی کی خاطر متعارف کرائے گئے تھے، اور پھر یہاں اس نے دو دہائیوں تک مسلسل علمی کامیابیاں حاصل کیں۔ اس کا عالمانہ اور فاضلانہ کام میں مندرجہ ذیل کتب شامل ہیں:

- این اَیسے آن دی فاؤنڈیشن آف جیومیٹری(1897)

An Essay on the Foundation of the Geometry (1897)

2- اے کریٹیکل ایکسپوزیشن آف دی فلاسفی آف لیبنز (1900)

A Critical Exposition of the Philosophy of Leibniz (1900)

3- دی پرنسپلز آف میتھمیٹکس(1903)

The Principles of Mathematics (1903)

4- دی پرابلمز آف فلاسفی(1912)

The Problems of Philosophy (1912)

5- پرنسپیا میتھمیٹیکا(13-1910)

Principia Mathematica (1910-13)

ان کے علاوہ رسل نے برطانوی، فرانسیسی، اطالوی، جرمن اور امریکی جرائد میں تقریباً دو درجن سے زائد بڑے اور اہم مضامین لکھے۔ رسل نے نہ صرف محض نا قابلِ تقابل بہترین ماہر منطق کی حیثیت سے شہرت حاصل کی بلکہ اس نے عالمانہ فاضلانہ اور دانشورانہ مباحث ——— یعنی تجزیاتی فلسفے کے عظیم مبلغ کی حیثیت سے بھی ناموری حاصل کی۔ رائل سوسائٹی کے انتخاب سے لے کر ارسٹوٹیلین سوسائٹی کے صدر کا اعزاز کئی سالوں تک اسے مرحمت کیا جاتا رہا، جیسے کہ تمام شعبہ زندگی سے منسلک اس کے باصلاحیت شاگردوں مثلاً لڈوگ وٹ گنسٹین، نار برٹ ویز اور جین نکوڈ کو بھی یہ اعزاز حاصل ہوئے۔ ان افراد کا تعلق برطانیہ، یورپ اور شمالی امریکہ سے تھا۔ 1914ء کے موسمِ گرما تک رسل غیر متنازعہ طور پر ان ممالک میں ایک بہت ہی معزز، مشہور اور بارسوخ فلسفی کی حیثیت اختیار کر چکا تھا جہاں انگریزی زبان بولی جاتی تھی۔

اس اہم اور نتیجہ خیز موسم گرما میں رونما ہونے والے بلقان کے بحران اور اس کے باعث پیدا ہونے والی عمومی یورپی جنگ نے رسل کی زندگی تبدیل کر دی اور اس کے نقطہ نظر کو ایک نئی جہت بخشی۔ ''رسل ایک روایتی اور غیر موثر استاد اور عالم نہیں تھا——— پھر بھی اس نے 1903ء میں محصولات کی اصطلاحات کے مہم کے حوالے سے ایک فعال کردار ادا کیا'' پھر 1907ء سے خواتین کے سیاسی انتخابات کی تحریک میں جاندار انداز میں حصہ لیا، اور 1910ء میں پارلیمان کی

حمایت کے حوالے سے ایک ہلکا پھلکا اور غیر سنجیدہ رویہ اختیار کیا —— لہٰذا یہ ثابت ہو گیا کہ رسل ایک عام اور معمولی شخصیت کا مالک نہیں تھا اور نہ ہی اس کے سیاسی نظریے اور نقطہ نظر میں کوئی بڑی اور اہم تبدیلی واقع ہوئی تھی، اور یا پھر اس کی ذات ایک تجزیئے میں سے گزری تھی۔ اپنے گھرانے کی وراثتی آزاد خیالی سے بغیر سوچے سمجھے دوسروں کو آگاہ کرنے کے ذریعے ڈیوڈ لائیڈ جارج کی ''نئی آزاد خیالی'' کے حوالے سے ایک کٹر حمایتی کی حیثیت سے جنگ کے موقع پر اس کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا —— اس نے غیر مشروط طور پر خود کو برطانوی حکمران طبقے کی حیثیت سے تسلیم کر لیا، اور بلاشبہ اس کے دوست، رسل کا خود کو حکمران طبقے کی حیثیت سے ''ہم'' کہنے کی غیر شعوری اور یقینی عادت کا مذاق اڑاتے رہے۔

لیکن جب 1914ء کے موسم گرما کے اواخر میں برطانیہ، جنگ میں بے رحمانہ طور پر کود پڑا تو رسل، برطانیہ کے اس اقدام کی مخالفت کئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ جنگ ایک جدید معقول مہم کے معیار پر پورا نہیں اترتی تھی، رسل اس جنگ کو، حالانکہ یہ کوئی ایک مکمل جنگ نہیں تھی، شدید طور پر ایک مکروہ اور گھناؤنا عمل سمجھتا تھا، بے شک، اس کا یہ رویہ اور طرزِ عمل اس کے اخلاقی تصور، سوچ اور سیاسی تخیل کے عین مطابق تھا۔ اس لئے پہلے تو اس نے برطانیہ کے غیر جانبدار رہنے کے لئے شروع ہونے والی مہم میں حصہ لیا اور پھر اپنی تحریروں، تقریروں، تنظیمی صلاحیتوں اور مشاورتی رویوں کے ذریعے مخالف جنگ تحریک میں شامل ہو گیا اور جیسے جیسے یہ جنگ طول پکڑتی گئی اور برطانیہ اس میں نہایت شدومد سے ملوث ہوتا گیا تو پھر جنگ کے خلاف بولنے والے مخلص لوگوں کے ساتھ بدسلوکی، شہری حقوق اور آزادیوں پر قدغن، حکومت کی فریب کاری، ذرائع ابلاغ و اطلاعات کے کرتا دھرتا عہدیداروں اور برطانوی سپہ سالاروں کی ہلاکتوں کے خلاف رسل کی مخالفت مزید شدت اختیار کر گئی۔ اس کی طرف سے یہ مخالفت شدید طور پر نامقبولیت کا شکار ہو گئی اور اس کی زندگی کا ایک قطعی اور سنجیدہ تجربہ ثابت ہوئی۔ اس جنگ کی مخالفت میں رسل کے جذبات اس قدر شدید تھے کہ اس نے اپنے رویے اور طرز عمل کے مخالف دوستوں سے بھی علیحدگی اختیار کر لی، اپنے ساتھیوں پر برہم ہو گیا اور حکام کے ساتھ اپنی ناراضی کا اظہار کیا، لیکن اپنی پُرآسائش اور بہترین زندگی میں وہ پہلی بار مقتدر قوتوں کی دوستی اور حمایت کے بجائے ان کی تنقید کا نشانہ بنا۔ مثال کے طور پر، رسل کو اس وقت بے انتہا مایوسی اور نقصان کا سامنا کرنا پڑا

جب ٹرنٹی کالج کی انتظامیہ نے اس کے خیالات اور نظریات کو مزید پذیرائی بخشنے سے انکار کر دیا اور 1916ء میں اسے تدریسی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا گیا اور پھر 1918ء کے موسم خزاں میں برطانیہ کے نئے اتحادی امریکہ کے خلاف ناقابل برداشت اور تضحیک آمیز مضامین تحریر کرنے پر اسے چھ ماہ کے لئے قید کر دیا گیا۔

بہر حال، اس جنگ کے مکمل عرصے کے دوران، شاید اس کی علیحدگی اور مخالفت کے باعث، وہ اس برطانوی حکومت کی مسلسل تنقید اور انتقام کا نشانہ بنا رہا، جس حکومت نے دانستہ اور ندامت و شرمندگی محسوس کیے بغیر ملک کے عدالتی نظام، سیاسی اداروں اور معاشی ڈھانچے کو صرف اور صرف جنگ کی خاطر تباہ کر دیا تھا اور ان کے استحصال کے ذریعے ان کی افادیت، عزت و احترام اور اہمیت دو ٹکے کی بھی نہ رہنے دی تھی۔ اس جنگ کی مخالفت کے سبب نہ صرف حکومت کی جانب سے اس کا پاسپورٹ ضبط کر لیا گیا، اس کی نقل و حرکت پر پابندی لگا دی گئی، اس کی ڈاک اور خطوط برطانوی حکام پہلے کھولتے اور پھر اس کے حوالے کرتے، اس کی تقریروں کے انعقاد کو ناممکن بنا دیا گیا، اسے اظہار رائے سے محروم کر دیا گیا، اس کے ساتھیوں اور دوستوں کو ڈرایا دھمکایا گیا بلکہ عوام نے بھی حکومت نے ان اقدامات کی نہایت شد و مد کے ساتھ تصدیق و توثیق کی۔

جنگ کی مخالفت پر مبنی رسل کے عزم و ارادے اور غیر متزلزل طرز عمل اور رویے کے لئے، حکومت اور عوام کی طرف مشترکہ مخالفانہ رویہ، ایک دفعہ تو رسل کے لئے تکلیف دہ، اذیت ناک اور غیر متوقع و پریشان کن ثابت ہوا۔ رسل کے نزدیک یہ قیاسی نظریات اور فرضی رجحان، اور یہ انوکھی مخالفت، وضاحت کی محتاج تھی۔ لیکن رسل نے بھی ہمت نہیں ہاری اور جنگ کے دوران وہ جبری بھرتی کے قانون کی مخالفت کرتا رہا، اور نہ صرف جنگ کے فوری نشیب و فراز پر اس نے صفحات کے صفحات لکھ ڈالے بلکہ ذرائع ابلاغ و اطلاعات سے پوشیدہ گہرے تاریخی، نفسیاتی اور سیاسی حالات پر بھی فکر انگیز غور کرتا رہا اور پھر اس کے بعد اس نے سفارتکارانہ تاریخ، سیاسی فلسفے کے موضوعات پر The Policy of the Futente 1904-1914(1916) اور Principles of Social Reconstructions(1916) نامی دو کتب تصنیف کیں۔ اس کے علاوہ رسل نے سیاسی اور معاشی نظریات و خیالات کے موضوع پر دو تحقیقی اور تجزیاتی مقالے Political Ideals(1917) اور Roads & Freedom(1918) تحریر کیے۔

جنگ کے اختتام پر رسل نے محسوس کیا کہ وہ اچانک سیاسی اور سماجی طور پر تنہا ہو چکا ہے، اور اسے بادلِ نخواستہ اپنی عالمانہ اور تدریسی زندگی کی طرف واپس لوٹنا پڑا ہے اور پھر یہ یقینی امر ہے یہ بھی محسوس ہوا کہ ٹرنٹی کالج کی انتظامیہ نے بہت ہی وقار اور ساتھ ہی ساتھ بہت ہی زیادہ احساسِ ندامت کے ساتھ، رسل کی اس سے پہلے مدرسی سے سبکدوشی کے قانون میں تبدیلی کر کے اسے منطق اور فلسفہ، ریاضی کے مضامین کے لئے مدرس کی حیثیت سے تقرری کی پیشکش کی۔ اگرچہ اس پر یہ عہدہ قبول کرنے کے لئے بہت دباؤ تھا لیکن رسل نے محسوس کیا کہ اسے اپنی توانائیاں خاص طور پر جنگ کے بعد تعمیرِ نو اور بحالی امن کے لئے مختص کر دینا چاہئیں۔ نہ صرف یورپی معاشرے کو ایک انوکھے اور غیر متوقع سیاسی خطرے اور معاشرتی فساد اور یورش کے فوری انعقاد کا سامنا کرنا پڑا لیکن گزشتہ جنگ کے بعد یورپی معاشرے کی عارضی بحالی اور بقاء یقینی طور پر عملیت اور انقلاب کی ضمانت ثابت نہ ہوئی۔ رسل کو یہ محسوس ہو گیا کہ اس وقت سب سے ضروری امر یہ ہے کہ حقیقی طور پر امن بحال اور قائم کیا جائے۔ یعنی محض اختلافات کو ختم نہ کیا جائے بلکہ ایک ایسی دنیا تعمیر و تشکیل کی جائے کہ جہاں نہ تو کسی کے دل میں جنگ کی خواہش، امنگ و ترنگ پیدا ہو، یا پھر جنگ پھوٹ پڑنے کے ذرائع معدوم اور ختم کر دیئے جائیں۔ لہٰذا اب اس کا کام یہ ہونا چاہئے کہ 1918ء کے بعد استعاری و علامتی فلسفیانہ نظریات و تصورات کی تحریر پر توانائی صرف کرنے کے بجائے انفرادی، معاشرتی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر جنگ سے پاک دنیا کی تعمیر و تشکیل پر توجہ مرکوز کی جائے۔

بے شمار ذاتی مسائل و معاملات نے بھی رسل کو یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا کہ وہ ٹرنٹی کالج کی انتظامیہ کی طرف سے تدریس کے لئے وصول ہونے والی پیشکش ٹھکرا دے۔ اس امر کا اندازہ لگاتے ہوئے کہ اس کے اکثر مضبوط اور تصوراتی و تخیلاتی فلسفیانہ نظریات پر مبنی عرصہ اس کا اثاثہ ہے، اور یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کے سابقہ دوست وٹ گینسٹین نئی نسل کی فکری اور ذہنی راہنمائی کرے گا، رسل نے ہمیشہ سے اپنی معدوم ہوتی ہوئی فلسفیانہ مہارتوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنانے میں کچھ زیادہ کشش محسوس نہ کی۔ اور اگر زیادہ بے تکلفانہ انداز میں کہا جائے تو جنگ کے آخری مہینوں میں ایک نوجوان خاتون ڈورا بلیک (Dora Black) کے ساتھ تعلقات استوار کر لئے تھے۔ یہ خاتون تحریک آزادی نسواں کی زبردست حامی، ایک بہادر جرأت مند اور صلح جو خاتون اور کٹر

سوشلسٹ تھی۔ بہر حال یہ تعلقات 1921ء میں ان دونوں کی شادی پر منتج ہوئے۔ یہ امر بھی نہایت امر اور متاثر کن ہے کہ 1920ء میں روس جانے والے مزدوروں کے ایک وفد میں شمولیت، اور پھر اسی سال کے موسم خزاں میں پیکنگ یونیورسٹی کی طرف سے آئندہ تعلیمی سال یہیں صرف کر دینے کی ترغیب آمیز پیشکش کے باعث اس نے کیمبرج کو خیر باد کہہ دیا۔ پہلے 1921ء میں ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا اور پھر 1923ء میں بیٹی پیدا ہوئی، اور پھر اس وقت سے رسل کی ایک یادگار عالمانہ اور فاضلانہ پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز ہوا جس میں مختلف کتب پر جائزہ، مضامین اور کتب کی تصنیف، تدریس اور ٹوری چیلسیا کے متعلق پارلیمان کے لئے دودھواں دھار مہمات شامل تھیں۔ مزید برآں، جب ان کے بچے سکول جانے کی عمر کو ہوئے تو رسل اور ڈورا نے سسکس (Sussex) میں بیکن ہل (Beacon Hill) نامی ایک اسکول کھولنے کا فیصلہ کیا تا کہ زمانہ امن میں تعلیم کی فراہمی کا ایک مثالی نمونہ پیش کیا جا سکے۔

لیکن اس وقت رسل کی مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی جب ان کا سکول مالی طور پر کامیاب نہ ہو سکا۔ بہر حال رسل نے اپنی عالمانہ اور فاضلانہ سیاسی توانائیوں کو امن قائم کرنے کے اعلیٰ مقصد کی جانب مرتکز کرنے کا تہیہ کیا ہوا تھا، جلد ہی رسل کو معلوم ہو گیا کہ تدوین اور ولولہ انگیزی پر مبنی خواہشات کے حصول کے ضمن میں اس کی توانائیاں معدوم اور اس کی توجہ منتشر ہو رہی ہے۔

1920ء کی دہائی کے وسط اور 1930ء کی تمام دہائی کے دوران رسل نے تقریباً ہر ممکن موضوع پر ہر جریدے میں لکھا اور ہر شخص کی درخواست پر ان موضوعات پر اپنی عالمانہ اور فاضلانہ دانش کے موتی بکھیرے۔ اس دوران رسل نے مختلف کتب پر جائزاتی مضامین اور تبصرے لکھنے سے قطعی انکار نہیں کیا، ہر قسم کے موضوع پر مقالے کی صورت میں طبع آزمائی کی، کسی بھی کمیشن یا مجلس کا رکن بننے سے منہ نہیں موڑا، اور نہ ہی کسی تصنیفی، تخلیقی اور تدریسی دعوت کو ٹھکرایا۔ مندرجہ ذیل کتب کی مختصر فہرست سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے مختلف موضوعات پر کتب، مضامین اور مقالات تحریر کئے:

1- Icarus (1924)

2- What I Believe and The ABC of Relativity (1925)

3- On Education (1926)

4- An Outline of Philosophy and The Analysis of Matter (1927)

5- Marriage and Morals (1929)

6- The Conquest of Happiness (1930)

7- The Scientific Outlook (1931)

8- Education and the Social Order (1932)

9- Freedom and Organisation (1934)

10- Religion and Science (1935)

11- Which Way to Peace? (1936)

ان کے علاوہ رسل نے مختلف جائزوں اور مضامین کی شکل میں امریکی اور برطانوی جرائد میں الفاظ کا ایک طوفان برپا کر دیا۔ مثلاً

1- Atlantic Monthly

2- Harper's New Republic

3- Scribner's Magazine

4- Rotarian

5- Political Quarterly

6- New Stateman and Nation

7- London Mercury

رسل، ان جرائد و رسائل کے مدیران کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا، اس نے نہایت واضح طور پر اپنے نظریات و تصورات کا اظہار کیا، اپنی فصیح البیانی کو بھی کبھی کبھی استعمال کیا، اور کسی کسی موقع پر اپنے جانبدار رویے کو بھی عیاں کیا، مزید برآں، ان مدیران کے مطالبے پر تضحیک آمیز، اشتعال انگیز یا سنجیدہ تحریریں بھی تخلیق کیں۔

رسل کی مندرجہ بالا تحریروں نے عوام کی وسیع اکثریت کی توجہ حاصل کر لی، حالانکہ رسل نے شادی، جنسی معاملات اور بچوں کی پرورش جیسے متنوع موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی، لیکن عوام و خواص کی ایک کثیر تعداد نے اس کی تحریروں کی پذیرائی کی۔ بہرحال رسل کے نزدیک تصنیف و

تالیف پر مشتمل بے شمار اور محنت و مشقت پر مبنی تخلیقی کام، ایک دفعہ تو امن قائم کرنے کے اہم اور قیمتی فرض اور ذمہ داری پر ٹھیکے کا ذریعہ ثابت ہوا، اور مختلف موضوعات مثلاً ''کیا سوشلسٹوں کو اچھے سگار پینے چاہئیں'' یا ''کون لپ اسٹک لگا سکتا ہے'' جیسے وقت ضائع کرنے والے مضامین کے باعث اس کی صلاحیتیں رسل کے اصل مقصد یعنی ''امن کے قیام'' کی طرف زیادہ مرکوز نہ ہو سکیں۔ 1930ء کی دہائی کے اوائل میں اس کی شادی کی ناکامی اور بیکن ہل (Beacon Hill) کے دیوالیہ ہونے کے باعث اس کا یہ احساس دگنا ہو گیا کہ دنیائے عالم میں واقع ہونے والے تاریخی واقعات و حالات کا جائزہ لینے کے ضمن میں اس کی صلاحیتیں اور توجہ مناسب طور پر ارتکاز نہیں حاصل کر رہی۔

رسل کے نزدیک، 1930ء کی دہائی نہایت ہی واضح طور پر اس کے ہم وطنوں کے لئے نہایت ہی تلخ اور ناخوشگوار ثابت ہوئی۔ اگر ایک طرف تو بعد میں آنے والی تمام فوجی حکومتیں مطلق العنان ثابت ہوئیں اور انہوں نے بغیر کسی رد و قدح کے جنگ ہی کے راستے کو اپنایا، دوسری طرف ان قومی حکومتوں کی خارجی اور داخلی حکمتِ عملیوں کے باعث رسل ان سے دُور ہوتا گیا۔ چونکہ رسل خارجہ معاملات اور داخلی سیاست سے مکمل طور پر واقف تھا، اس لئے اسے برطانوی خارجہ معاملات کے علاوہ داخلی سیاست کی بے عملی اور منافقت کے باعث سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ مزید برآں رسل اس لئے بھی سخت مایوس اور دل گرفتہ ہوا کہ ایک تو برطانیہ کی خارجہ حکمت عملی نہایت ہی بودی اور بے عمل تھی، اور دوسرے داخلی اصلاحات نے اس حکمت عملی کو ناقابل عمل اور غیر موثر کر دیا تھا، اور اٹلی، جرمنی، روس اور سپین میں ظالمانہ حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ انتہائی مایوسانہ حالت میں کہ شاید جنگ سے بچا جا سکتا تھا، اور اس کا یہ یقین کہ یورپی ممالک کے درمیان اس قدر وسیع خلیج اور اختلاف، ایک نئے ظلم و ستم پر مبنی دور جہالت کا پیش خیمہ ثابت ہو گا، رسل نے اپنی اس مایوسی کا اظہار اپنی ایک تصنیف Which Way to Peace (1936) میں کیا، جس میں مصالحت اور خیر خواہی کا کوئی پہلو تو ظاہر نہیں کیا گیا تھا بلکہ شکست خوردگی اور بددلی اور حوصلہ شکنی کا ایک اظہار تھا۔

رسل ایک اعلیٰ فہم و فراست اور دانش کا مالک ہونے کے علاوہ جذباتی طور پر معتدل مزاجی کا ایک بہترین نمونہ تھا، بلاشبہ رسل اپنی دوسری شادی اور 1937ء میں اپنے دوسرے بیٹے کی شادی کے باعث ہمت و حوصلہ مجتمع کرنے میں کامیاب رہا، لہٰذا جلد ہی رسل نے نہ صرف ہٹلر، مسولینی، سٹالن اور فرانکو کی ظالمانہ حکمت عملیوں اور مجنونانہ نفسیات پر جلد ہی غور و فکر کا آغاز کر دیا اور ان کا

جائزہ لینا شروع کر دیا بلکہ اس نے نازی جرمنی، فسطائی اٹلی، سٹالن کے روس اور فسطائی سپین کی ناگزیر اور لازمی درخواست کو بھی زیرِ غور رکھا۔ رسل کے ذہن کے مطابق موجودہ نظامہائے حکومت یا تو ان نئی حکومتوں کی اصل حقیقت سے پردہ اٹھانے سے قاصر تھے اور یا تو داخلی اور خارجی طور پر ان حکومتوں کی مقبول اور غیر متنازعہ موقف کو عیاں کرنے کے ناقابل تھے۔ مارکس، فرائیڈ، برج سن، سورل، پیروٹو، پارسن، ان میں سے کوئی بھی مفکر موجودہ صورت حال کا صحیح طور پر ادراک کرنے سے قاصر تھا، اور نہ ہی یہ دانشور اس صورت حال کا مستقل عملی حل پیش کر سکتے تھے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے رسل نے نہایت ہی واضح اور صاف طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس وقت ایک نئے سماجی اور معاشرتی تجزیے کی ضرورت ہے جس کا اظہار اس نے 1937ء کے موسم گرما میں کر دیا۔

اپنے اس منصوبے کے حوالے سے اس نے اپنی کتابیں شائع کرنے والے ادارے کے مالک کو لکھا "اس منصوبے کے متعلق میں بہت مشتاق ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں ایک ایسا نیا طریقہ ڈھونڈ رہا ہوں جس طرح آدم سمتھ نے "دولتِ اقوام" کی صورت میں تلاش کیا تھا۔" ایک عالمانہ اور دانشورانہ آرزو اور تمنا یا تعلیمی و علمی خود اعتمادی سے لیس ہو کر رسل نے اعلیٰ توقعات اور بلند امیدوں کے سائے تلے اپنے اس منصوبے اور کام کا آغاز کیا، اور اس ضمن میں اپنی گزشتہ تاریخی تحریروں (مثلاً Freedom and Organisation 1934)، کتب کے جائزوں (مثلاً رچرڈ اوس بورن کی کتاب Freud and Marks 1937) اور صحافتی تصنیفات (مثلاً The Revolt Against Reason) سے بھی فائدہ اٹھایا۔ ایک ولولہ انگیز اور متحرک کیفیت کے تحت اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے استفادہ کرتے ہوئے اور یا پھر لازمی ضرورت کے دباؤ کے احساس کے تحت رسل نے 1938ء کے پہلے ہفتے میں 320 صفحات پر مشتمل ایک کتاب مکمل کی جس کے اقتباسات اس نے Political Quarterly اور New Statesman میں شائع کیے، اور لندن کے اکنامکس سکول میں "اقتدار کے طریقے" کے عنوان سے ایک تدریسی سبق کے ذریعے اپنی اس کتاب کا خلاصہ اور سرسری جائزہ پیش کیا۔

"اقتدار، ایک جدید معاشرتی تجزیہ" کے عنوان سے اس کی کتاب اکتوبر 1939ء کے اواخر میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب نئی تحقیقی کاوش کی بجائے رسل کی اپنی ذہنی اور دانشورانہ عملی کاوش کا نتیجہ تھی۔ اس کا یہ عمل، بہت حد تک، علمی، دانشورانہ اور سیاسی ادعا کی حیثیت رکھتا تھا اور اس امر کی تصدیق و

توثیق کرتا تھا کہ نہ تو اس نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے راہِ فرار حاصل کی اور نہ ہی سیاسی آگاہی اور انسانی فہم کے ذریعے حقیقی امن قائم کرنے کی خواہش سے مکمل طور پر دستبرداری حاصل کی۔

اس کی کتاب ''اقتدار'' کے آغاز میں ہی اس کتاب کا واضح اور جرأت مندانہ مقصد موجود ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے یہ ثابت کرنے میں مشکل پیش آئے گی کہ سماجی اور معاشرتی طور طریقوں کا اصل مقصد و تصور ''اقتدار'' ہے۔ ایسے ہی جیسے توانائی، طبیعات کے بنیادی تصور کی حیثیت رکھتی ہے، چونکہ مصنف پہلے ہی چند نظریات واصولوں کا تابع تھا، اس لئے رسل کو اپنی اس خواہش کے ضمن میں معاف کیا جاسکتا ہے کہ وہ سماجی طور طریقوں (سوشل سائنسز) کا نیوٹن بننا چاہتا ہے۔ اس بے باک اور دوٹوک اعلان واظہار کے مقصد کے قطع نظر، بہرحال رسل نے اس کتاب کے ابتدائی ابواب ''اقتدار کی ترنگ'' اور ''قائدین اور ان کے حامی''، درمیانی ابواب ''پادرانہ اقتدار'' اور ''شاہانہ اقتدار'' آخری ابواب، ''آدابِ اقتدار (اقتدار کے اسلوب وآداب)'' اور ''تربیتِ اقتدار (حصولِ اقتدار کے لئے مطلوبہ تربیت)'' میں نہایت جرأت مندانہ انداز میں اپنے اس دعوے اور خواہش کا اعادہ کیا۔ ان اور دیگر موضوعات کے متعلق رسل کی تحقیقی و تجزیاتی کاوشیں کئی صدیوں اور مختلف تہذیبوں تک پھیلی ہوئی ہیں اور ان کی افادیت اور اہمیت کو تاریخی تقابل، وسیع رابطوں اور اعلیٰ سطحی بصیرت کے ذریعے جلا بخشی گئی ہے اور ہمیشہ کی طرح انہیں نہایت ہی دانش، فہم، ولولہ انگیزی اور وضاحت سے تحریر کیا گیا ہے۔ خاص طور پر انقلابی قائدین کی نفسیات، جمہوری حکومتوں کے اختیارات کی حفاظت اور انہیں محدود کرنے سے پیدا ہونے والے مسائل، افسر شاہی کی منہ زوری، اقتدار و اختیار کی تخلیق اور اسے قانونی شکل میں ڈھالنے کے ضمن میں آزادی رائے کا کردار، جیسے اہم موضوعات پر اس کی سیر حاصل گفتگو، تجزیہ اور جائزہ، بہت ہی دقیق اور بصیرت افروز نوعیت کا حامل تھا، خاص طور پر آہستہ آہستہ جہالت کے اندھیرے میں ڈوبتے ہوئے یورپ کے تناظر میں اس کی سیر حاصل گفتگو، تجزیہ اور جائزہ بہت ہی اہم اور مفید ثابت ہوئی۔

بہرحال، رسل کی تصنیف ''اقتدار'' کچھ زیادہ مقبولیت نہ حاصل کرسکی۔ اگرچہ برطانیہ اور شمالی امریکہ میں اس کتاب پر وسیع پیمانے اور ہمدردانہ انداز میں غور ہوا، اور اس کا جائزہ لیا گیا، رسل کی شدید خواہش کے مطابق، اس کی تخلیق کو نہ ہی مختصر المدتی مقبولیت اور نہ ہی طویل المدتی اثر پذیری حاصل ہوسکی۔ اس کتاب کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ، بلاشک وشبہ، اس کتاب کی

اشاعت کا نامناسب اور ہنگامہ خیز پس منظر تھا، یعنی اس وقت ایک ایسا دور تھا جب اس کتاب کی طرف عوامی توجہ کا ارتکاز نہایت ہی نامبارک اور نامسعود محسوس ہو رہا تھا۔ بہرحال، اس کتاب کی ناکامی کی ذمہ داری بذات خود اس کتاب پر بھی عائد ہوتی ہے۔ چونکہ اس کتاب میں سیاسی نظریات کی بجائے سیاسی معاشرت کو موضوع بنایا گیا، اس لئے دراصل اس کتاب کے ذریعے نہ تو جامع جدید معاشرتی تجزیہ سامنے آتا ہے، اور نہ ہی تاریخ کے تمام ادوار اور مقامات میں اقتدار و اختیار کے مطالعے و جائزے کے ضمن میں مفید ثابت ہونے والے سماجی اور معاشرتی تحقیق کے نئے انداز طریقے سامنے آتے ہیں۔ رسل نے اپنی اس کتاب کے ذریعے مارکس (Marx)، فرائیڈ (Freud)، ڈُرکھم (Durkheim)، یا ویبر (Weber) کے پیش کئے گئے نظریات یا نظامہات کا متبادل مہیا کرنے کی کوئی دانستہ کوشش نہیں کی۔

رسل کی تصنیف ''اقتدار'' نہایت ہی بے مثال، قیمتی اور مفید نظریات و تصورات پیش کرتی ہے جن کے ذریعے دانش اور علم کے متعلق فہم حاصل ہوتی ہے۔ جب ہم اس مشکل اور مصائب و آلام سے بھرپور صدی کے اختتام کے قریب اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں، تو پھر ہمیں ذرائع ابلاغ و اطلاعات اور تشہیری مہم (اپنے مخصوص مقاصد کی تبلیغ کی خاطر) کے غلبے کے خطرات کا اندازہ ہوتا ہے، یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ فسطائیت، نازی ازم اور سٹالن ازم نے کس طرح ذرائع ابلاغ و اطلاعات کے غلط استعمال کی حوصلہ افزائی کی۔ مزید برآں یہ کتاب جمہوری حکومتوں کے تشدد اور عدم تحمل و برداشت کے پھیلاؤ اور خطرے سے بھی آگاہ کرتی ہے۔ اس لئے ''اقتدار'' ایک ایسی کتاب کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتی ہے جس میں درج قیمتی اور دانشورانہ معلومات اور انوکھی فہم و فراست، نہایت فصیح و بلیغ اور بصیرت افروز انداز میں ہمیں حقیقت حال سے بہرہ ور کرتی ہے۔

گرک ویلیس
جارجیا یونیورسٹی

پہلا باب

اقتدار کی ترنگ

انسان اور دیگر جانوروں کے درمیان مختلف پہلوؤں کے لحاظ سے مختلف فرق پائے جاتے ہیں، ان میں سے کچھ فرق ذہن اور عقل وفہم کے متعلق ہیں اور کچھ فرق جذباتی نوعیت کے حامل ہیں۔ان میں سے سب سے بڑا، اہم اور مرکزی جذباتی فرق یہ ہے کہ جانوروں کے برعکس، انسانی خواہشات و ضروریات بے شمار ہیں لیکن پھر بھی انسان کو مکمل تسکین اور طمانیت حاصل نہیں ہوتی۔ وہ اژدھا جو اپنے شکار کو اپنے کنڈل میں دبوچ کر ہلاک کر دیتا ہے، اپنے شکار کو ہضم کر کے اس وقت تک سویا رہتا ہے جب تک اسے دوبارہ بھوک محسوس نہیں ہوتی۔ فرض کریں کہ اگر دوسرے جانور ایسا نہیں کرتے، تو اس کی دو وجوہات ہیں: یا تو ان کی خوراک اس قدر زیادہ نہیں ہوتی، اور یا پھر وہ اپنے دشمنوں سے خوفزدہ ہوتے ہیں۔ جانوروں کی کچھ مخصوص سرگرمیوں سے قطع نظر، ان کی روزمرہ کی سرگرمیاں، بقائے نسل اور تولیدی عمل کی بنیادی ضروریات کے تحت پیدا ہوتی ہیں، اور ان کی یہ سرگرمیاں، ان کی ضروری اور لازمی ضروریات وخواہشات کی تسکین اور طمانیت کے لئے کافی ہوتی ہیں۔

اس لحاظ سے انسانی معاملات مختلف نوعیت کے حامل ہیں۔ درحقیقت، انسانوں کی ایک کثیر تعداد اپنی زندگی کی خواہشات وضروریات کے حصول کے لئے اس قدر محنت ومشقت میں مصروف رہتی ہے کہ ان کی زندگیوں کے دیگر مقاصد کی تکمیل اور حصول کے لئے ان کے پاس بہت کم توانائی اور ہمت باقی رہ جاتی ہے۔ لیکن جن افراد کے لئے ان خواہشات وضروریات کا حصول بغیر کسی خاص محنت ومشقت کے یقینی ہوتا ہے، وہ اپنی زندگیوں میں ہر وقت مستعد، فعال اور توانا رہتے ہیں۔ جب زرغس (Xerxes)[1] نے ایتھنز پر حملہ کرنے کے لئے مہم جوئی کی تو اس کے پاس نہ تو اشیائے خوردونوش کی کمی تھی، نہ ہی اس کی پوشاکوں (لباس) کی تعداد کم تھی اور نہ ہی اس کی

بیویاں بہت ہی تھوڑی تھیں۔ جب نیوٹن کو ٹرنٹی کالج کی فیلوشپ دی گئی تو وہ مادی طور پر بہت آسودہ اور خوش حال تھا، لیکن اس کے بعد اپنی کتاب ''Principia'' تصنیف کی۔ سینٹ فرانسس اور اگنائٹس لاؤلا کو اپنی مرضی سے فرار ہونے کے لئے کسی 'حکم' کی ضرورت نہ تھی۔ یہ تو بہت ممتاز اور مشہور شخصیات تھیں لیکن ایک قلیل تعداد کو چھوڑ کر تقریباً ایک ہی قسم کی خصوصیات اور خوبیاں، کم یا زیادہ عام انسانوں میں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں۔ 'بیگم الف' جسے اپنے شوہر کی کاروباری کامیابیوں کا قطعی یقین ہے، اور وہ اپنے گھریلو کام کاج کے سلسلے میں متفکر نہیں ہے، ''بیگم ب' سے زیادہ اچھا اور شاندار لباس پہنتی ہے، حالانکہ اسے بہت کم رقم خرچ کر کے نمونیا کے خطرے سے آزاد ہو جانا چاہئے۔ 'الف صاحب اور بیگم الف' اس وقت دونوں خوش ہو جاتے ہیں اگر 'الف صاحب' کو نائٹ کا خطاب مل جاتا ہے، یا اسے پارلیمان کا رکن منتخب کر لیا جاتا ہے۔ جاگتی آنکھوں سے فتح و کامیابی کے خواب دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے، اور اگر یہ فتح و جیت ممکن ہے تو اس کے حصول کے لئے کوشش کی جائے گی۔ فتح و نصرت کا تصور و تخیل ایک ایسا محرک ہے جس کے لئے انسان لازمی طور پر انتھک کوشش میں مصروف رہتا ہے حالانکہ اس کی بنیادی ضروریات و خواہشات پہلے ہی پوری ہو چکی ہوتی ہیں، ہم میں سے اکثر انسان، ان چند لمحات سے واقف ہیں جب ہم نے مندرجہ ذیل الفاظ کہے تھے:

اگر مجھے ابھی موت آ جاتی
تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی
میری روح اس موجودہ کیفیت میں
احساسِ طمانیت سے لبریز ہے
مجھے یہ خوف لاحق ہے
کہ یہ عین ممکن ہے
کہ میں آئندہ کبھی شاید
اس قدر آسودگی کی کیفیت میں
انجانی قسمت کے ان لمحوں میں
اس قدر شاداں و کامران نہ ہوں گا

اور جب ہمیں کبھی کبھار خوشی، راحت، سکون اور طمانیت کے چند لمحات نصیب ہوتے بھی ہیں تو ہم، اوتھیلو[2] (Othello) کی مانند موت کی تمنا اور آرزو کرنے لگتے ہیں کیونکہ ہمیں یہ علم ہوتا ہے کہ خوشی، راحت، سکون اور طمانیت کے یہ لمحات دائمی نہیں ہیں۔ اگر انسان یہ چاہتا ہے کہ اسے دائمی خوشی، راحت اور طمانیت حاصل ہو کیونکہ یہ امر قطعی ناممکن ہے: صرف خدا ہی دائمی اور مکمل خوشی، راحت اور طمانیت کا مالک ہے کیونکہ خدا کی ذات ہی طاقت، اختیار، اقتدار اور عظمت کے عالم کی فرمانروا ہے۔ ارضی اور دنیوی عالم، دیگر تمام دنیاؤں کے مقابلے میں فانی حیثیت رکھتے ہیں، ارضی اور دنیوی جاہ وجلال، اختیار اور اقتدار کا عرصہ اور مدت محض موت تک محدود ہوتا ہے، دنیوی جاہ وجلال، اختیار اور اقتدار کے دور میں اگرچہ ہم اہرام تعمیر کرتے ہیں، ہمارے اختیار و اقتدار کا ذکر غیر فانی تاریخ میں ملتا ہے لیکن یہ جاہ وجلال، طاقت، اختیار و اقتدار پھر بھی صدیوں کی دھول میں کہیں گم ہو جاتا ہے۔ جن افراد کے پاس اختیار، اقتدار اور عظمت کا بہت تھوڑا حصہ موجود ہوتا ہے، یہ لوگ اسی تناسب سے بہت ہی کم خوشی، راحت، سکون اور طمانیت محسوس کرتے ہیں، لیکن ان کی یہ سوچ غلط فہمی پر مبنی ہے کیونکہ یہ خواہشات نا قابلِ تشفی اور نا قابلِ تسکین ہوتی ہیں اور پھر خدا کی ازلی اور ابدی نوعیت و ماہیت ہی ہے جہاں ان خواہشات کی بے قراری کو قرار نصیب ہو سکتا ہے۔

اس دنیا میں موجود مختلف جانور اپنی بقائے نسل اور تولیدی عمل پر ہی قانع ہوتے ہیں۔ جب انسانی خواہشات و ضروریات لامحدود ہوتی ہیں اور اس ضمن میں ان کی خواہشات و ضروریات صرف ان کے تصور و تخیل تک ہی محدود ہو سکتی ہیں۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو ہر انسان خدا ہی کی طرح بننا پسند کرتا، پھر بھی کچھ لوگ مشکل ہی سے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ ناممکن ہے۔ یہ وہ لوگ جنہوں نے اپنی زندگیاں ملٹن (Milton) کے ''شیطان''[3] (Satan) کے مانند ڈھال لی ہیں جس میں ''گناہگاری'' بدچلنی اور پرہیزگاری و نیک چلنی میں چنداں فرق روا نہیں رکھا گیا۔ گناہگاری اور بدچلنی سے میری مراد ایک ایسی چیز ہے جو دینی اقدار کے مطابق نہیں ہے، یعنی میرا موقف یہ ہے کہ میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ انسانی انفرادی خواہش محدود ہے۔ پرہیزگاری، نیک چلنی اور گناہگاری و بدچلنی کی یہ یکجائیت اور امتزاج عظیم فاتحین میں بھی بدرجہ اتم موجود رہا ہے لیکن یہ عنصر کچھ نہ کچھ حد تک عام انسانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے انسانوں کے درمیان

معاشرتی مدد، معاونت اور تعاون ایک مشکل امر کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے کیونکہ ہر انسان خود کو خدا کے مقام پر رکھتے ہوئے اس تعلق کو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان تعلقات کے مانند رکھنا چاہتا ہے۔ مزید برآں، مصلحت پسندی اور حکومت، مسابقت کی ضرورت کی محتاج ہے جبکہ عدم استحکام اور تشدد کے سلسلہ وار واقعات، باغیانہ رجحان کو جنم دیتے ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ناپائیداری اور غیر فانی حیثیت کی ضرورت منتشر ادعائے ذات کے آگے بند باندھ دیتی ہے۔

انسان کی لامحدود خواہشات میں سے سب سے بڑی اور اہم خواہش، اختیار، اقتدار اور عظمت کا حصول ہے۔ ان تمام عناصر کی نوعیت یکساں نہیں ہے حالانکہ یہ عناصر باہمی طور پر نہایت شدت سے منسلک ہیں۔ ایک وزیراعظم عظمت کی بجائے قوت و اقتدار کا مالک ہوتا ہے۔ جبکہ ایک بادشاہ یا شہنشاہ، قوت و اختیار کی بجائے عظمت اور جاہ و جلال کا مالک ہوتا ہے۔ بہر حال، ایک حکمران کی حیثیت سے عظمت کے حصول کا آسان ترین طریقہ اقتدار و اختیار کا حصول ہے، یہ معاملہ خاص طور پر ان افراد کے متعلق ہے جو عوامی معاملات کے ضمن میں فعال اور مستعد کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لئے عظمت کے حصول کی خواہش اسی طرح پیدا ہوتی ہے جس طرح اقتدار و اختیار کے حصول کی خواہش جنم لیتی ہے، اور عملی لحاظ سے ان دونوں خواہشات کے مقاصد یکساں ہو سکتے ہیں۔

روایت پسند ماہرین معاشیات کے علاوہ مارکس، جو اس ضمن میں ان کا ہمنوا نظر آتا ہے، غلط فہمی میں مبتلا ہو کر یہ سمجھ رہے تھے کہ مفاد پرستی کو سماجی اور معاشرتی علوم کا بنیادی مقصد سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر ضروریات زندگی کی خواہش کو عظمت و اقتدار کی خواہش سے الگ کر دیا جائے تو اس خواہش کی ضرورت محدود نوعیت میں ڈھل جاتی ہے اور اس کا مکمل حصول، اور اس کی مکمل تکمیل، ایک معمولی کوشش کے ذریعے ممکن ہو سکتی ہے۔ درحقیقت مادی آرام و آسائش سے لگاؤ اور محبت کے ذریعے حقیقی گراں قیمت خواہشات جنم نہیں لیتیں۔ اس قسم کی مادی آرام و آسائش اور اشیاء یا تو بدعنوانی کو قانونی حیثیت دینے کے باعث وجود میں آتی ہیں، یا پھر ماہرین کی منتخب شدہ پرانے اساتذہ کی تصویری جائے مقام کے تحت ابھرتی اور پیدا ہوتی ہیں، انہیں بھی آرام و آسائش کی جگہوں میں رہنے کی بجائے اقتدار و اختیار اور عظمت کے حصول کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ جب معمولی اور مناسب آرام و آسائشات کا حصول یقینی ہو جاتا ہے تو پھر دونوں افراد اور اشیائے ضرورت،

دولت کی بجائے اقتدار اور اختیار کے حصول میں سرگرداں ہو جائیں گے، یہ بھی ممکن کہ یہ دونوں عناصر دولت کو اقتدار و اختیار کے حصول کا ذریعہ بنالیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دونوں عناصر، دولت میں اضافے کی قربانی دے کر اقتدار و اختیار میں اضافے کے لئے کوشش کریں، لیکن بعدازاں موخرالذکر معاملے میں ان کا بنیادی مقصد معاشی نہیں ہوتا۔

روایت پسند اور مارکسی ماہرین معاشیات کی یہ غلطی نظریاتی یا تصوراتی نہیں ہے بلکہ ان کی یہ غلطی بہت ہی زیادہ اہمیت کی حامل ہے، اور اس کے باعث حالیہ دور میں کچھ ایسے اہم واقعات رونما ہوئے جنہیں غلط انداز میں سمجھا گیا۔ یہ محض اس ادراک اور احساس کے ذریعے ہی ممکن ہے کہ دولت سے لگاؤ اور محبت ان سرگرمیوں کا باعث ہے جو قدیم یا جدید تاریخ جیسے معاشرتی معاملات کی تشریح و ترجمانی کے ضمن میں بہت ہی اہم ہیں۔

اس کتاب کے حوالے سے مجھے یہ فکر ہے کہ آیا میں یہ ثابت کر سکوں گا کہ معاشرتی و سماجی علوم کا بنیادی تصور ''اقتدار و اختیار'' ہے، بعینہ جس طرح علم طبیعات کا بنیادی تصور و اساس ''توانائی'' ہے۔ ''توانائی'' کے مانند اقتدار و اختیار کی بھی بے شمار اقسام ہیں، مثلاً دولت، سامانِ آرائش، حکومتی اختیار اور دوسروں کی رائے پر اثر و رسوخ وغیرہ۔ ان میں سے کوئی بھی قسم ایک دوسرے کی محتاج نہیں ہے اور نہ ہی یہ اقسام ایک دوسرے کے باعث پیدا ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر دولت کو دوسری تمام اقسام سے علیحدہ کر کے اس کے متعلق معاملات طے کئے جائیں، تو محض جزوی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے، بالکل ایسے ہی جیسے بعض معاملات میں توانائی کی دوسری اقسام کا جائزہ لئے بغیر توانائی کی ایک قسم کا مطالعہ اور تجزیہ درست اور صحیح نتیجے کا ضامن نہیں ہوگا۔ دولت، عین اسی طرح فوجی طاقت یا دوسروں کی رائے پر اثر انداز ہونے کے ذریعے حاصل کی جا سکتی ہے جس طرح یہ دونوں عناصر، دولت کے ذریعے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ معاشی تغیر کے قوانین، وہ اصول ہیں جنہیں اقتدار و اختیار کی کسی دیگر قسم کے بجائے صرف اور صرف ''اقتدار و اختیار'' کی اصطلاح ہی کے ذریعے بیان کیا جا سکتا ہے۔ گزشتہ ادوار میں، فوجی طاقت الگ و تنہا تھی، جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ فتح یا شکست کا انحصار سالاروں کی اتفاقیہ صلاحیتوں پر ہوتا تھا۔ آج کل کے زمانے میں عام طور پر معاشی قوت و اختیار ہی کو دیگر تمام اقسام کے اقتدار اور اختیار کا ماخذ سمجھا جاتا ہے، لیکن میں تو یہ کہوں گا کہ یہ اس قدر عظیم غلط فہمی ہے کہ جس طرح صرف ان فوجی مورخین کے لئے

یہ امر غلط ہے جنہیں یہ سب کچھ ناکارہ اور فضول معلوم ہوتا ہے۔ اور پھر ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اپنے نظریات و افکار کی تشہیر و تبلیغ کو اقتدار و اختیار کی بنیادی شکل سمجھتے ہیں۔ بہرحال، یہ ایک نیا موقف اور نظریہ ہے، اور اس روایت کے عین مطابق ہے جس میں یہ کہا گیا ہے ''شہیدوں کا خون'' چرچ کی بنیاد ہے۔ یہ امر، جھوٹ اور سچ کی تمیز کرنے کا ویسا ہی معیار ہے جس طرح فوجی نقطہ نظر اور معاشی نقطہ نظر میں امتیاز کا معیار ہے۔ اگر اپنے موقف اور نظریئے کی تشہیر و تبلیغ کے ذریعے تقریباً متفقہ رائے تخلیق کی جاسکتی ہے، تو اس کے ذریعے ناقابل شکست اقتدار اور اختیار بھی حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن جن لوگوں کے ہاتھ میں فوجی یا معاشی طاقت مرتکز ہوتی ہے، اگر وہ چاہیں تو وہ اس طاقت کو اپنے موقف اور نظریئے کی تبلیغ و تشہیر کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ اگر ہم علم طبیعات کی مثال کو سامنے رکھنا چاہتے ہیں تو پھر ''توانائی'' کے مانند ہمیں اقتدار و اختیار کو ایک ایسے عنصر کی حیثیت سے تسلیم کرنا ہوگا جو مختلف شکلیں اختیار کر رہا ہے، اور اس قسم کی تبدیلیوں کے حوالے سے مختلف اصول و قوانین کی تلاش کے ضمن میں اس عنصر کو معاشرتی علم کی بنیاد تسلیم کرنا ہوگا۔ آج کل کے دور میں اقتدار کی کسی بھی قسم خاص طور پر معاشی قوت کو ایک دوسرے سے الگ اور جدا کرنے کی کوشش، عملی طور پر ایک عظیم غلطی کا ماخذ رہی ہے، اور ابھی بھی ہے۔

اقتدار و اختیار کے حوالے سے مختلف اقوام کے درمیان مختلف اقسام کے تضادات موجود ہیں۔ پہلے تو یہ کہ مختلف اقوام میں انفرادی افراد یا اداروں/تنظیموں کے پاس موجود اقتدار و اختیار کی درجہ بندی کے لحاظ سے اختلاف موجود ہے۔ مثال کے طور پر، یہ تو صاف ظاہر ہے کہ تنظیم/ادارے کے اضافے کے باعث، گزشتہ ادوار کی نسبت ریاست/حکومت کے پاس زیادہ طاقت مرتکز ہو جاتی ہے۔ اور پھر یہ اختلاف اور تضاد تنظیم/ادارے کی قسم/نوعیت کے لحاظ سے بھی موجود ہوتا ہے جو بہت ہی پُراثر اور موثر ہے، یعنی فوجی آمریت، مذہبی حکومت اور طبقہ امرا کی حکومت، ایک دوسرے سے یکسر مختلف اقسام ہیں۔ پھر یہ بھی کہ مختلف اقوام کے درمیان، اقتدار و اختیار کے حصول کے مختلف طریقوں کے حوالے سے مختلف تضادات اور اختلافات موجود ہیں۔ مثلاً وراثتی شہنشاہیت کے باعث ایک قسم کا ممتاز حکمران فرد سامنے آتا ہے، ایک عظیم پادرانہ حکومت کے لئے درکار خوبیوں کے باعث ایک اور قسم کی حکومت جنم لیتی ہے، پھر نظام جمہوریت، ایک علیحدہ قسم کی حکومت تشکیل دیتا ہے، اور پھر جنگ کے باعث ایک نئی قسم کی حکومت وجود میں آتی ہے۔

جن افراد کو اقتدار یا اختیار تفویض کیا جا سکتا ہے، ان کی تعداد محدود کرنے کے لئے جہاں سماجی ادارے مثلاً طبقہ امراء یا وراثتی شہنشاہیت کی حکومت موجود نہیں ہے، وہاں اگر وسیع تناظر کے لحاظ سے دیکھا جائے، جن لوگوں کو اقتدار کی سب سے زیادہ خواہش دہوس ہوتی ہے، ان کے لئے اس کا حصول زیادہ ممکن نظر آتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک ایسا معاشرتی نظام جہاں ہر شخص کو اقتدار کے حصول کا حق حاصل ہو تو پھر ایک عمومی اصول کے تحت، اقتدار کے مراکز کے تمام عہدوں اور مراتب ان لوگوں کے قبضے میں ہوں گے جو خاص طور پر حُبّ اقتدار کے لحاظ سے اوسط درجہ کے اختلاف اور تضاد کے حامل ہوں گے۔ اگرچہ حُبّ اقتدار، انسانی خواہشات میں سے سب سے عظیم اور زبردست خواہش ہے، لیکن اس کی تقسیم عدم مساوات پر مبنی ہے اور یہ دیگر انسانی خواہشات و مقاصد مثلاً آرام و آسائش سے لگاؤ، خوشی و مسرت سے پیار اور کبھی کبھی حُبّ ذات تک ہی محدود رہ جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بزدل افراد کے دل میں اس قیادت کے آگے سر جھکانے اور ان کی تابعداری کرنے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے جس کے باعث بہادر، دلیر اور جرأت مند افراد میں اقتدار و اختیار کی ترنگ و امنگ وسیع پیمانے پر ابھر آتی ہے۔ مزید برآں جن افراد میں اقتدار و اختیار کی لگن اور ترنگ زیادہ موجود نہیں ہوتی، ان کا حالات و واقعات پر زیادہ اثر بھی مرتب نہیں ہوتا۔ جو لوگ سماجی اور معاشرتی تبدیلیاں لانے کی قدرت رکھتے ہیں، وہ لوگ فطری طور پر ایسے ہوتے ہیں جن میں حالات کو تبدیل کرنے کی شدید اور ناقابل شکست خواہش موجود ہوتی ہے۔ اس لئے اقتدار و اختیار سے لگن، محبت اور اس کی ترنگ و امنگ ان افراد کی خصوصیت ہوتی ہے جو عام طور پر کسی بھی اہمیت کے حامل نہیں ہوتے۔ درحقیقت ہمیں صرف اس وقت غلط فہمی میں مبتلا ہونا چاہئے کہ اگر ہم اقتدار و اختیار سے لگن، ترنگ و امنگ کو انسان کا واحد مقصدِ حیات سمجھیں، لیکن اس غلطی کے باعث ہم اس قدر گمراہ نہیں ہوتے جس کی ہم سے معاشرتی علوم کے بے مثال قوانین و اصولوں کی تلاش کے وقت توقع تھی، کیونکہ اقتدار و اختیار سے لگن، اس کی ترنگ و امنگ وہ سب سے بڑا انسانی مقصد ہے جس کے باعث وہ تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جن کے متعلق معاشرتی علوم کے تحت جائزہ اور تجربہ لازمی ہو جاتا ہے۔

اس لئے میں یہاں یہ کہنا چاہوں گا کہ سماجی اور معاشرتی متغیرات کے اصول و قوانین وہ ہیں، جنہیں اقتدار کی اصطلاح اور ان کی مختلف اقسام کے ذریعے بیان کیا جا سکے۔ ان اصول و قوانین کو

دریافت کرنے کے لئے، یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے اقتدار کی مختلف اقسام کی تشریح کی جائے، ان کی تفصیل مہیا کی جائے، اور پھر ان مختلف اہم تاریخی مثالوں کا جائزہ لیا جائے کہ کن کن طریقوں کے ذریعے اداروں اور افراد نے عوام الناس کی زندگیوں پر اپنی گرفت مضبوط کی ہے۔

بہر حال، دورُخی مقصد کو زیر غور رکھتے ہوئے مجھے اس قسم کی رائے دینی ہوگی جس کے ذریعے ماہرینِ معاشیات کی طرف سے کئے گئے معاشرتی تبدیلیوں کے تجزیے کی بجائے میرے خیال کے مطابق عمومی طور پر معاشرتی تبدیلیوں کا زیادہ بہتر طور پر تجزیہ کیا جانا چاہئے۔ مزید برآں میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ ان معاشرتی تبدیلیوں کے تجزیے اور جائزے کے ذریعے حالیہ دور اور مستقبل قریب کو اٹھارہویں اور نویں صدی میں موجود افراد کے نظریات و تصورات کی نسبت زیادہ سے زیادہ قابلِ فہم، روشن اور منور بنانا چاہئے۔ یہ صدیاں کئی لحاظ سے بے مثال تھیں اور ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں یہ صدیاں کئی پہلوؤں کے لحاظ سے اپنی تاریخ کو دہرا رہی ہیں کہ ابتدائی زمانوں میں زندگی کی کون سی اقسام اور نظریات، تصورات و خیالات کی کون سی اشکال مروج تھیں۔ اپنے اس دور اور اس کی ضروریات کے متعلق فہم و آگاہی حاصل کرنے کے لئے اور قدیم و پرانی تاریخ کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے ہمارے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ ہم ترقی کی اس شکل اور قسم کے متعلق علم حاصل کر سکیں جو نہایت ہی صحیح طور پر انیسویں صدی کے مسلمہ اصولوں کے زیر اثر ہو۔

حوالہ جات

-1 زرغس، ایرانی شہنشاہ (465BC-519BC) جس نے ایتھنز پر حملہ کر کے اسے جلا دیا تھا۔

-2 ولیم شیکسپیئر کا تصنیف کردہ المیہ کھیل جو پہلی دفعہ 1604-05 کو پیش کیا گیا۔ اوتھیلو (Othello) ایک فوجی جرنیل جسے یہ معلوم ہوا کہ اس کی بیوی، اس کے دوست کے ساتھ محبت میں مبتلا ہو چکی ہے، لیکن جب اسے اپنی بیوی کی بے گناہی کا ثبوت مل گیا تو اس (اوتھیلو) نے مارے ندامت کے خودکشی کر لی۔

-3 جان ملٹن (John Milton) کی تصنیف ''شیطان'' (Satan)۔

دوسرا باب

قائدین اور ان کے حامی

اقتدار و اختیار کی ترنگ و امنگ اور خواہش، دو طرح کی ہوتی ہے۔ پہلی خواہش و ترنگ کا اظہار براہِ راست اور واضح طور پر کیا جاتا ہے اور یہ اکثر قائدین ہی کا خاصا ہوتی ہے، اس کے برعکس اقتدار و اختیار کی ترنگ و خواہش کا اظہار بالواسطہ اور ضمنی طور پر کیا جاتا ہے اور یہ عمل عام طور پر ان قائدین کے حامیوں اور پیروکاروں کی طرف سے اختیار کیا جاتا ہے۔ جب کچھ افراد اپنی مرضی اور رضامندی کے ذریعے ایک قائد کی حمایت کرتے ہیں، اس کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں، تو ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اس جماعت کے کندھوں پر سوار ہو کر اقتدار حاصل کریں جو اپنے قائد کے احکامات کی پابندی کرتی ہے، اور پھر یہ جماعت یہ محسوس کرتی ہے کہ ان کے قائد کی جیت اور فتح ان کی اپنی فتح اور کامیابی ہے۔ اکثر افراد اور جماعتیں خود میں اس قدر صلاحیتیں موجود نہیں پاتیں کہ وہ خود کو کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار کر سکیں، اس لئے وہ ایک قائد تلاش کر لیتی ہیں جس میں مطلوبہ کامیابی و کامرانی حاصل کرنے کے درکار مناسب ذہانت، دانش اور ذکاوت موجود ہوتی ہے۔ مزید برآں، کسی بھی دین اور مذہب میں بھی اقتدار کی یہ ترنگ و امنگ بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ نٹراشے [1] نے مسیحیت کو غلامانہ اخلاقیات کی پرورش اور نشونما کا موردِ الزام ٹھہرایا۔ لیکن بہرحال، حتمی مقصد عام طور پر اور ہمیشہ اقتدار کا حصول ہی ہوتا ہے۔ اس ضمن میں انجیل مقدس میں مذکور ایک فرمان ”مبارک ہیں وہ جو نہایت حلیم ہیں کہ وہ اس روئے زمین پر ہمیشہ قائم و دائم رہیں گے اور دھرتی کی تمام نعمتوں کے وہ وارث ہوں گے“ اور یا پھر مندرجہ ذیل مشہور حمدیہ اشعار، اس صورت حال کو نہایت واضح طور پر بیان کر دیتے ہیں۔

خدا کا فرستادہ
شاہانہ تاج کے حصول کے لئے
جہاد کے لئے میدانِ عمل میں اتر رہا ہے
اس کے بعد، خون رنگ سرخ پرچم
اب اس کے لئے لہراتا رہے گا

کون ہے جو غموں کے جام پیئے گا
اور الم وغم، دکھ درد پر قابو پائے گا
اب کون ہے، جو صبر و ہمت کے ساتھ
اس کے مشن کو جاری رکھے گا

اگر یہ صورت حال غلامانہ اخلاقیات کی علامت ہے، تو پھر ہر سپاہی جو جانفشانی سے جنگ کرتا ہے، اور ہر قسم کا سیاستدان، جو انتخابات کے لئے سخت محنت کرتا ہے، وہ ''غلام'' کے مفہوم میں شامل ہے۔ لیکن اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے کہ ہر اصلی اور حقیقی باہمی تعاون کے ادارے کے لحاظ سے اس کا حمایتی اور پیروکار، قائد کی نسبت، نفسیاتی طور پر ایک ''غلام'' کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اقتدار کے سینے میں دل نہیں ہوتا، دوسرے الفاظ میں اقتدار کے حصول کا عمل کسی اخلاقیات، اصول وقوانین کا پابند نہیں اور یہ امر ایک ناگزیر حیثیت اختیار کر جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرے کی اساسی اور آئینی حیثیت میں اضافہ ہونے کے باعث اقتدار کے متعلق اس قسم کا رویہ معدوم ہونے کے بجائے پھلتا پھولتا ہے۔

اگر ماضی اور حال کے ادوار کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ انسانی معاشروں میں اقتدار و اختیار کی غیر منصفانہ تقسیم ہمیشہ سے ہی موجود رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو بیرونی ضرورت ہے اور دوسری وجہ انسانی فطرت ہے۔ اکثر اجتماعی اداروں کا وجود صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب یہ کسی انتظامی فرد یا ڈھانچے کے زیر اثر کام کرتے ہیں۔ روزمرہ معمولات زندگی میں بھی اس قسم کی مثالیں موجود ہیں۔ اگر ایک گھر تعمیر کرنا ہو تو لازمی طور پر ایک شخص کو اس کی منصوبہ بندی کے

لئے مامور کیا جاتا ہے، اگر ریل گاڑیوں کے نظام کا آغاز کرنا ہو تو ان کے نظام الاوقات کے تعین کو ریل گاڑیوں کے ڈرائیوروں کے سپرد نہیں کیا جا سکتا، اگر نئی سڑک تعمیر کرنی ہو تو کسی نہ کسی فرد کو تو یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ یہ سڑک کہاں سے کہاں تک تعمیر کی جائے گی۔ حتیٰ کہ ایک جمہوری منتخب شدہ حکومت بھی ایک ایسی حکومت ہے جہاں زمینی حقائق کو مدنظر رکھا جاتا ہے، اور اگر اجتماعی اداروں کی کامیابی مقصود ہے تو ایک فرد کی طرف سے احکامات اور ہدایات کے اجراء اور اس کے حامیوں اور پیروکاروں کی طرف سے ان احکامات اور ہدایات کی تعمیل اور پابندی لازمی اور ناگزیر عمل ہے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ ممکن ہے، اور اس سے بھی زیادہ حقیقت یہ ہے کہ مختلف افراد کی علیحدہ علیحدہ نفسیاتی اور جسمانی عادات اور رویوں کے باعث اقتدار و اختیار کے بارے اس ناہموار اور غیر متوازن کیفیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بعض افراد میں فطری طور پر قائدانہ صلاحیتیں پائی جاتی ہیں اور بعض افراد قدرتی طور پر فرمانبرداری اور اطاعت کے مظہر ہوتے ہیں، اور پھر ان دو قسم کے افراد کے علاوہ افراد کی ایک تیسری قسم بھی موجود ہے جو بعض اوقات تو ایک قائد کی حیثیت سے اپنا کردار نبھاتے ہیں اور بعض اوقات وہ ایک اطاعت گزار اور فرمانبردار کارکن کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

اپنی کتاب ''انسانی فطرت سے آگاہی'' (Understanding Human Nature) میں ''ایلڈر'' (Alder) افراد کی دو مرکزی اقسام یعنی اطاعت گزار و فرمانبردار اور حاکمانہ اور قائدانہ صلاحیت کے حامل افراد کے درمیان فرق کو واضح کر کے بیان کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ''فرمانبردار اور اطاعت گزار فرد'' دوسروں کے وضع کردہ احکامات، اصول و قوانین کی پابندی اور تعمیل کرتا ہے اور اس قسم کا فرد فطری طور پر ایک خاکسارانہ اور خدمت گزارانہ عہدے اور مرتبے کا طالب ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، حاکمانہ اور تحکم آمیز فطرت کا حامل شخص ہے جو یہ پوچھتا ہے کہ 'میں ان سب سے بہتر اور برتر کیسے ہو سکتا ہوں' اس وقت منظر عام پر آتا ہے جب ایک ہدایت کار درکار ہوتا ہے، اور وہ ان تبدیل شدہ حالات میں سب سے بلند اور اعلیٰ عہدے اور مرتبے تک پہنچ جاتا ہے۔ ایلڈر کے مطابق، افراد کی یہ دونوں اقسام اپنی انتہائی نوعیت کی فطرت کے باعث ناپسندیدہ گردانی جاتی ہیں۔ مزید برآں، ایلڈر یہ سمجھتا ہے کہ تعلیم ہی کے باعث یہ دونوں قسم کے افراد وجود میں آتے ہیں۔ ایلڈر کے مطابق تحکمانہ شعور اور عادت پیدا کرنے والی تعلیم کا سب

سے بڑا نقصان یہ حقیقت ہے کہ اس کے ذریعے بچے میں اقتدار و اختیار کے متعلق پسندیدگی اور لگاؤ کے جذبات واحساسات پیدا ہو جاتے ہیں اور اسے وہ خوشی و مسرت حاصل ہوتی ہے جو اقتدار واختیار کے حصول کے باعث پیدا ہوتی ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ تحکمانہ شعور اور عادت پیدا کرنے والی تعلیم کے ذریعے غلامانہ ذہنیت وفطرت کے حامل افراد بھی منصۂ شہود پہ آتے ہیں اور حاکمانہ وتحکمانہ ذہنیت وفطرت کے حامل افراد بھی منظرِ عام پر آتے ہیں کیونکہ اس قسم کی تعلیم کے باعث یہ احساس وشعور بیدار ہوتا ہے کہ باہمی طور پر معاونت کرنے والے دو افراد کے درمیان صرف حاکم ومحکوم ہی کا تعلق ممکن اور موجود ہو سکتا ہے۔

حالانکہ اقتدار/ واختیار سے محبت، لگاؤ اور خواہش کی مختلف اقسام موجود ہیں، لیکن اس پر تقریباً عالمگیر نوعیت کی حامل ہے لیکن اپنی مکمل اور قطعی شکل میں اس کا وجود کہیں کہیں پایا جاتا ہے۔ مثلاً جو خاتون اپنے گھریلو انتظامی معاملات میں کُلّی طور پر بااختیار ہے، اس کے سامنے وزیراعظم کی سیاسی قوت واختیار ہیچ ہے، اس کے برعکس، ابراہم لنکن، امریکہ کی صدارت سے تو خوف زدہ نہیں ہوا لیکن وہ اپنے گھریلو اختلافات اور تنازعات کا سامنا نہیں کر سکا۔ مزید برآں، اگر بیلوروفون (Bellorophone) کا بحری جہاز تباہ ہو جاتا تو وہ کشتیوں کے ذریعے فرار ہونے کے بجائے انگریز افسران کی بلا چوں چراں تعمیل کرتا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ افراد کو اس وقت ہی اقتدار واختیار سے لگاؤ اور وابستگی پیدا ہوتی ہے جب وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی قائدانہ صلاحیتوں کے ذریعے الجھے مسائل سلجھا لیں گے، لیکن جن افراد کو خود میں قائدانہ صلاحیتوں کے فقدان کا احساس ہوتا ہے، وہ اطاعت گزاری اور فرمانبرداری پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

جس طرح اقتدار کی خواہش و ترنگ ایک حقیقت ہے، اسی طرح اطاعت گزاری اور فرمانبرداری کا احساس وخواہش بھی حقیقی نوعیت کی حامل ہے، اور یہ خواہش اور احساس، خوف اور ڈر کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ وہ بچے جنہیں ہم فرمانبردار اور گستاخ کہہ سکتے ہیں، ایک خطرناک صورت حال، مثلاً آتش زدگی کی صورت میں، ایک باصلاحیت قائد کے آگے سرنگوں کر سکتے ہیں۔ جب جنگ شروع ہوئی تو وہ خواتین جو انتخابات میں حق رائے دہی کے لئے مہم چلا رہی تھیں، انہوں نے وزیراعظم لائیڈ جارج کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ اسی طرح، ایک شدید خطرے کی حالت میں، اکثر لوگ اطاعت گزاری اور فرمانبرداری پر مبنی رویہ اختیار کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، اور ایسے موقع پر چند

ہی افراد خود کو قائد کے طور پر پیش کرنے کا خطرہ مول لیتے ہیں۔ اور پھر جب جنگ چھڑ جاتی ہے تو پھر حکومت کے متعلق تمام لوگوں کے جذبات واحساسات ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔

ضروری نہیں کہ مختلف قسم کے ادارے اور تنظیمیں خطرات سے نمٹنے کے لئے تشکیل دیئے جائیں۔ بعض اوقات ''کوئلے کی کانوں'' جیسے معاشی ادارے اور تنظیمیں، خطرے کا باعث ہوتے ہیں، لیکن ان کے باعث پیدا ہونے والے خطرات حادثاتی ہوتے ہیں، اور اگر ان خطرات کو دور کر لیا جاتا تو یہ ادارے اور تنظیمیں بھی پھل پھولتیں۔ عمومی طور پر معاشی اداروں کے لئے یہ لازمی نہیں ہے کہ وہ خطرات سے نمٹیں، اور یا پھر حکومتی ادارے اور تنظیمیں داخلی اور اندرونی معاملات میں ملوث اور مدخل ہوں۔ لیکن بری اور بحری افواج کے مانند بعض حکومتی ادارے مثلاً سمندر میں ڈوبنے والوں کی زندگی بچانے کے لئے تیار کی گئی کشتیاں اور آگ بجھانے والا محکمہ صرف اور صرف خطرات سے نمٹنے کے لئے تشکیل دیئے جاتے ہیں۔ اگر ہم سمجھنا چاہیں تو درحقیقت تو مذہبی اداروں اور تنظیموں کا مقصد بھی ہمارے (انسانوں) کی فطرت میں پوشیدہ مافوق الفطرت خطرات اور خدشات دور اور کم کرنے کے لئے وجود میں آتے ہیں۔ اگر اس ضمن میں کسی شخص کے ذہن میں کسی قسم کا سوال پیدا ہوتا ہے تو اسے چاہئے کہ مندرجہ ذیل حمدیہ اشعار پر غور وفکر کرے:

اے زمانہء حجر کی عظیم چٹانو!
اپنا سینہ کھولو
اور کسی بڑے شگاف میں
مجھے وہاں چھپ جانے دو

اے یسوع مسیح!
میری روح کے شیدائی
جب سیلاب طغیانی بپا کرے
اور طوفان بہت بلند ہو جائے
مجھے وہ اذنِ پرواز عطا کر
کہ میں تیری آغوش میں آجاؤں

رضائے الٰہی کے سامنے اطاعت گزاری اور وفا شعاری پر مبنی طرز عمل میں مکمل تحفظ اور سلامتی کا احساس پوشیدہ ہے، اور اسی احساس کی بدولت، کئی بادشاہتیں جو محض کسی ارضی مخلوق کے سامنے سر جھکانا نہیں چاہتی تھیں، مذہبی اقدار کے آگے سرنگوں ہو گئیں۔ ہر قسم کی اطاعت اور فرمانبرداری خطرے اور خدشے کے احساس کے باعث جنم لیتی ہے خواہ اس اطاعت گزاری اور وفا شعاری کا مرکز انسانی ذات ہو یا ذاتِ باری تعالیٰ ہو۔

یہ حقیقت بھی اب عمومی حیثیت و نوعیت اختیار کر چکی ہے کہ جارحیت یا جارحانہ طرز عمل بھی خطرے کے احساس کے باعث جنم لیتا ہے۔ میری رائے کے مطابق یہ نظریہ بعید از قیاس ہے۔ بہر حال، یہ نظریہ مختلف اقسام کی جارحیت، مثلاً ڈی۔ ایچ۔ لارنس[2] (D.H.Lawrence) کے حوالے سے توہیچ ہے۔ لیکن میں شدید طور پر اس شک وشبہے میں مبتلا ہوں کہ جو لوگ قزاقوں کے سردار بن جاتے ہیں، وہ لوگ ہیں جو خطرے کا احساس اپنے آباء واجداد سے ادھار لیتے ہیں، یا یہ خطرہ اور خوف انہیں اپنے آباء واجداد کی وراثت کے طور پر منتقل ہوتا ہے، اور یا پھر، فرانسیسی فوجوں کے ہاتھوں روس کی شکست کے موقع پر نپولین خود کو مادام مائری کے ہم پلہ سمجھتا ہے۔ مجھے اٹیلا[3] کی ماں کے متعلق قطعی کچھ معلوم نہیں ہے، لیکن مجھے قدرے شک ہے کہ اس (ماں) نے اس ننھے بچے کو تباہ کر دیا جس نے بالآخر یہ سمجھا کہ دنیا مصیبتوں کا گھر ہے کیونکہ بعض اوقات وہ اپنی کئی خواہشات کی تکمیل سے محروم رہا۔ اس قسم کا جارحانہ رویہ، جو بزدلی کے باعث پیدا ہوتا ہے، میرے خیال کے مطابق، وہ نہیں ہے جو عظیم راہنماؤں اور قائدین میں حوصلہ اور ولولہ پیدا کرتا ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسا غیر معمولی اعتماد جوان راہنماؤں اور قائدین کے انداز واطوار سے ہی ظاہر نہیں ہوتا بلکہ ان کے تحت الشعور میں بھی گہرے طور پر موجود ہوتا ہے۔

ایک راہنما اور قائد کے لئے درکار خود اعتمادی، مختلف انداز اور طریقوں کے ذریعے وجود میں آسکتی ہے۔ اگر ہم تاریخی حوالے سے اس خود اعتمادی کی بیداری کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کی سب سے بڑی اور عام قسم وہ ہے جو آباء واجداد کے سابقہ حاکمانہ اور آمرانہ رویے اور طرز عمل کے باعث وراثت کے طور پر اگلی نسلوں میں منتقل ہوتی ہے۔ مثلاً اگر ہم بحرانی حالات میں ملکہ الزبتھ کی تقریروں کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ ملکہ اپنے آپ کو ایک برتر اور فائق خاتون ثابت کرتے ہوئے، خود کو اور اپنی قوم کو یہ یقین دلاتی ہے اور قائل کرتی ہے کہ

ایک عام شخص کی نسبت اسے یہ معلوم ہے کہ اب اس موقع پر کون سا قدم اٹھانا چاہئے اور کون سا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے۔ اس معاملے میں قوم کے مفادات اور خود مختاری ایک دوسرے سے بالکل ہم آہنگ تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ ایک "اچھی ملکہ" تھی۔ وہ مشتعل اور برہم ہوئے بغیر اپنی تعریف کر سکتی تھی۔ یہ حقیقت بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ حاکمانہ اور تحکمانہ عادت اور فطرت کے باعث ایک شخص کے لئے مختلف ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونا اور کسی فوری فیصلے پر پہنچنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ ایک گروہ یا قبیلہ جب اپنے موروثی سردار کی اطاعت اور فرمانبرداری کرتا ہے، شاید اس گروہ یا قبیلے کا یہ طرز عمل اور رویہ اس (سردار) کے بارے اس لحاظ سے زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اسے اکثریت منتخب کرے۔ اس کے برعکس، چرچ کے مانند اگر کسی ادارے کے قابل قدر تجربے اور سابقہ انتظامی مناصب پر کام کرنے کے باعث اگر کسی شخص کو اپنا قائد اور راہنما مقرر کر لیا تھا تو اس قائد یا راہنما نے اپنی سربراہی کی مدت کے دوران کسی بھی موروثی بادشاہ کی نسبت زیادہ بہتر نتائج اور کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

تاریخِ عالم کے کچھ ذہین اور قابل ترین قائدین اور راہنما، انقلابی اور غیر معمولی صورت حال کے باعث منظر عام پر آئے ہیں۔ اس ضمن میں ایک لمحے کے لئے ہم کروم ویل (Cromwell)، نپولین (Napoleon) اور لینن (Lenin) کی ان خوبیوں اور صلاحیتوں پر غور کرتے ہیں جن کے باعث یہ تینوں قائدین اور راہنما کامیاب اور فاتح ٹھہرے۔ ان تینوں نے نہایت ہی بحرانی اور مشکل حالات میں اپنے اپنے ملکوں کی قیادت کی اور اپنی قائدانہ صلاحیتوں اور خوبیوں کی بنا پر ان افراد کا تعاون اور مدد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جن کی فطرت غلامانہ نہیں تھی اور نہ ہی وہ اطاعت گزاری اور فرمانبرداری کی عادت میں مبتلا تھے۔ یہ تینوں افراد، بے تحاشا حوصلے اور خود اعتمادی سے مالا مال تھے اور ان میں مشکل اور بحرانی حالات میں بہتر فیصلہ کرنے کی صلاحیت اور قوت موجود تھی۔ بہر حال، ان تینوں میں سے کروم ویل اور لینن ایک ہی قسم کے افراد تھے جبکہ نپولین ایک دوسری قسم کا فرد تھا۔ کروم ویل اور لینن مذہبی طور پر راسخ العقیدہ تھے اور ان کا خیال تھا کہ وہ کسی مافوق الفطرت قوت کے فرستادہ ہیں۔ اس لئے ان میں موجود اقتدار کی خواہش اور امنگ، بلاشک وشبہہ فطری اور درست معلوم ہوتی تھی اور انہوں نے اقتدار کے باعث حاصل ہونے والی عیش وعشرت کی بھی نہایت کم پروا کی، جوانی کے ، حانی

اور غیر دنیوی مقصد اور خواہش سے مطابقت بھی نہیں رکھتی تھی۔ خاص طور پر لینن کے حوالے سے یہ نظریہ مکمل حقیقت اور سچ ہے، اور یہ کرومویل کے لئے بھی کہ وہ اپنے اقتدار کے آخری سالوں میں اس احساس میں مبتلا ہو گیا تھا کہ کہیں وہ کسی گناہ یا غلط کاری میں مبتلا نہ ہو جائے۔ بہر حال، کرومویل اور لینن کے حوالے سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں موجود مذہبی ایمان اور غیر معمولی ذہانت و قابلیت کے باعث وہ اپنے حامیوں اور پیروکاروں کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گئے کہ وہ ان میں موجود قائدانہ صلاحیتوں پر اعتماد کریں اور قومی و ملکی معاملات کو سلجھانے کے ضمن میں ان پر بھروسہ کریں۔

کرومویل اور لینن کے برعکس، قسمت کے دھنی ایک سپاہی کی اعلیٰ اور بہترین مثال ہے۔ انقلاب آفرین حالات اس کی سپاہیانہ فطرت کے عین مطابق ثابت ہوئے کیونکہ ان حالات کے باعث وہ اپنے میلانِ طبع کے مطابق مواقع سے فائدہ اٹھا سکا اور اگر اس قسم کے حالات پیدا نہ ہوتے تو وہ کچھ بھی نہ کر سکتا۔ اگرچہ نپولین حب الوطنی کے جذبے سے سرشار تھا، اور اسی جذبے پر ہی اس کے سپاہیانہ میلان کا انحصار تھا، بصورت دیگر انقلاب ہی مانند، فرانس بھی محض اس کے لئے ایک موقع (لاحاصل) ثابت ہوتا، حالانکہ اپنی جوانی کے زمانے میں نپولین اکثر کورسیکا[4] (Corsica) کی طرف سے فرانس کے خلاف جنگ کرنے کے تصور سے خود کو بہلایا کرتا تھا۔ اگرچہ نپولین میں کوئی خاص صلاحیتیں اور خوبیاں موجود نہ تھیں، لیکن جنگی فنی مہارت کی موجودگی میں بہر حال کامیابی اس کے لئے مقدر بن چکی تھی، اور ان حالات میں اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو وہ کامیاب نہ ہو سکتا۔ لیکن اپنی جنگی فنی مہارت اور صلاحیتوں کے بل بوتے پر کامیاب ہو گیا۔ 18 برومائر (18 Brumaire) اور مارینگو (Marengo) جیسے مشکل اور بحرانی حالات میں اس نے کامیابی حاصل کرنے کے لئے دوسروں کا کندھا استعمال کیا، لیکن یہ اس کی شاندار خداداد صلاحیتیں ہی تھیں جس کے باعث اس نے اپنے حامیوں اور مددگاروں کے ذریعے کامیابی اور فتح اپنے نام کرالی۔ فرانسیسی فوج پُر جوش نوجوان سپاہیوں پر مشتمل تھی، لہٰذا اس نے اپنی نفسیاتی طبع کے ذریعے نہیں بلکہ اپنی ہوشیاری اور ذہانت کے ذریعے وہ قوت حاصل کر لی جو اس کی فتح کا باعث بنی، حالانکہ اگر اس موقعے پر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو کامیابی کا تصور بھی محال تھا۔ اپنے ستارے اور اپنی قسمت پر اس کا یقین جس کے باعث اسے بالآخر شکست کا سامنا کرنا پڑا، اس کی

کامیابیوں کی وجہ نہیں بلکہ اس کا اثر تھا۔

اگر ہم اپنے دور اور عہد کے حوالے سے جائزہ لیں تو نفسیاتی طور پر ہٹلر، کرومویل اور لینن ایک جیسے تھے جبکہ مسولینی، نپولین جیسا تھا۔

قسمت کا دھنی ایک فوجی سپاہی، یا قزاقوں کا ایک سردار "فنی" مورخین کے اندازے سے کہیں زیادہ تاریخی لحاظ سے اہم ہے۔ نپولین کے مانند، بعض اوقات اس قسم کا سپاہی، ان افراد کی قیادت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جو بے غرضانہ اور مخلصانہ طور پر اس کے مقصد سے اتفاق کرتے ہیں۔ یعنی فرانسیسی انقلابی افواج خود کو یورپ کی آزادی کی علمبردار سمجھتی تھیں، اس کے علاوہ وہ اٹلی اور مغربی جرمنی کی آزادی کو بھی اپنا فرض سمجھتی تھیں، لیکن نپولین کو ان ممالک کی آزادی سے زیادہ اپنا پیشہ وارانہ مستقبل عزیز تھا۔ عام طور پر اس ضمن میں ذاتی مفاد پیش نظر نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ سکندر مشرق کو یونانی تہذیب وتمدن میں ڈھالنا چاہتا ہو لیکن یہ امر شک پر مبنی ہے کیا اس کے مقدونی ہم وطن بھی اس کے ارادوں اور مہمات میں زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ جمہوریہ کے آخری سو سالوں کے دوران رومی سپہ سالاروں کے پاس نقد رقم بالکل بھی نہیں تھی، اس لئے انہیں زمینوں، جاگیروں اور مختلف قسم کے خزانوں کے عوض اپنے سپاہیوں کی وفاداری خریدنا پڑی۔ سیسل رہوڈز[5] (Ceicil Rhodes)، برطانوی سلطنت پر ایک عارفانہ انداز میں اعتقاد رکھتا تھا، لیکن اس کا یہ ایمان اور اعتقاد رنگ لایا، اور ماتابیلی لینڈ (Matabele land) کو فتح کرنے کے لئے اس نے جو سپاہی اور فوجی بھرتی کیے، انہیں کثیر تعداد میں مالی مفاد اور مراعات کی پیشکش کی گئی۔ مزید برآں، خفیہ یا اعلانیہ طور پر نہایت ہی منظم انداز میں مختلف قسم کے لالچ، مفادات اور ترغیبات نے دنیا میں برپا ہونے والی جنگوں میں نہایت ہی اہم کردار ادا کیا۔

ہم پہلے بھی یہ کہہ چکے ہیں کہ ایک عام شہری، مختلف قسم کے خوف کے باعث ہی کسی قائد یا راہنما کی وفاداری یا اطاعت کا دم بھرتا ہے۔ لیکن قزاقوں کے ایک گروہ کے بارے میں یہ نظریہ بمشکل اس وقت حقیقت اور سچ ثابت ہوتا ہے جب تک کہ وہ کوئی دوسرا اطمانیت بخش پیشہ اختیار نہیں کر لیتے۔ جب ایک قائد، ایک دفعہ اپنے اختیار، اقتدار اور قوت کا مسلمہ اظہار کر دیتا ہے تو پھر باغی اور سرکش افراد میں اپنی قوت، اختیار اور اقتدار کے ذریعے دہشت اور خوف پیدا کر سکتا ہے، لیکن یہ افراد اس کے اس وقت تک وفادار اور حامی رہتے ہیں جب تک وہ ایک راہنما کی حیثیت

سے ان کے سامنے موجود رہتا ہے، ورنہ یہ لوگ اس کی دہشت اور خوف سے دامن چھڑا لیتے ہیں۔ ایک قائد اور راہنما کی حیثیت حاصل اور برقرار رکھنے کے لئے، اسے اپنے اندر وہ صلاحیتیں اور خوبیاں جلد از جلد پیدا کرنا ہوں گی جن کے ذریعے وہ اپنی قوت، اختیار اور اقتدار کا اظہار کر سکے۔ خود اعتمادی، فوری فیصلہ سازی اور صحیح طریقوں کے ذریعے فیصلہ کرنے کی مہارت، چند ایسی خوبیاں اور صلاحیتیں ہیں جو ایک شخص کو قائد اور راہنما کے مرتبے پر فائز کرتی ہیں۔ قیادت اور اس کے پیروکاروں کا چولی دامن کا ساتھ ہے یعنی صرف سیزر (Ceaser) ہی انٹونی (Antony) کو اپنی اطاعت اور وفاداری پر مجبور کر سکتا تھا، کسی دیگر شخص کے بس کا یہ روگ نہیں تھا۔ اکثر لوگ سیاست کو پُر خار راستہ سمجھتے ہیں، اسی لئے وہ یہی چاہتے ہیں کہ وہ کسی قائد اور راہنما کے حامی بن جائیں، اور ان کا یہ رویہ اسی طرح جبلی اور لاشعوری ہوتا ہے، جس طرح کتے اپنے مالکوں کی وفاداری کا دم بھرتے ہیں۔ اگر ایسی صورت حال اور معاملہ نہ ہوتا تو پھر سیاسی طور پر اجتماعی قدم اٹھانا شاذ ہی ممکن ہوتا۔

لہٰذا قوت، اختیار اور اقتدار کی خواہش اور اس کے ساتھ لگاؤ، ایک ایسا مقصد ہے جو بزدلی کے زمرے میں آتا ہے اور جب افراد اپنے اندر مناسب صلاحیتیں اور خوبیاں نہیں پاتے تو وہ اپنی اس محرومی، کمزوری اور بزدلی کے باعث قوت، اختیار اور اقتدار کے حصول کی خاطر کسی قائد یا راہنما کے حامی بن جاتے ہیں، اس طرح وہ اپنے قائد اور راہنما کی مرضی اور خواہش کے تابع ہو جاتے ہیں۔ چونکہ قوت، اختیار اور اقتدار کے باعث، کسی بھی اور طریقے کی نسبت ہم اپنی خواہشات کی بہتر طور پر تکمیل کر سکتے ہیں، اور ہم دوسروں کی بھی پروا نہیں کرتے، تو پھر بزدلی، محرومی کے باوجود اقتدار کی خواہش اور تمنا ایک فطری میلان اور رجحان کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ جب ایک بزدل فرد میں ذمہ داری کا احساس کرنے اور اسے محسوس کرنے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر بزدلی کا یہ عنصر معدوم ہو جاتا ہے اور اس کی بجائے اقتدار اور اختیار کی خواہش میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ پھر ظالمانہ اور غیر دوستانہ طرز عمل اور رویہ دو طرح سے روبہ عمل ہوتا ہے۔ پہلے تو یہ کہ کچھ لوگ اس قسم کے رویے اور طرز عمل سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں، اور وہ منظر سے ہٹ جانا چاہتے ہیں، اس کے برعکس بہادر اور دلیر افراد اس قسم کے سرایت اور مناصب کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتے ہیں جن کے ذریعے وہ ظلم وستم سہنے کے بجائے دوسروں کو اپنے ظلم وستم کا

نشانہ بنا سکیں۔

جب کسی ادارے، ملک یا گھر میں سے بدنظمی اور افراتفری کا خاتمہ ہوتا ہے تو پھر فطری طور پر مطلق العنانیت اس کی جگہ لے لیتی ہے کیونکہ یہ عمل انسان کی طرف تسلط یا محکومیت کے جبلی نظام کے تحت وجود میں آتا ہے، اس ضمن میں ایک گھر، ایک ملک اور ایک کاروباری ادارہ بہترین مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آمریت اور مطلق العنانی کی نسبت اختیارات کی مساوی تقسیم بہت ہی مشکل ہے کیونکہ یہ امر انسانی جبلت کے قریب نہیں ہے۔ جب مختلف افراد اختیارات میں یکساں حصہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو پھر ہر ایک فرد اپنے طور پر اختیارات کا مکمل مالک بن جانا چاہتا ہے کیونکہ اس وقت اطاعت اور محکومیت کی خواہش قطعی موجود نہیں ہوتی۔ پھر ان حالات میں یہ امر قدرے ضروری ہو جاتا ہے کہ تمام متعلقہ فریق، کسی تیسرے فریق کے ساتھ وفاداری اور اطاعت گزاری پر مبنی رویہ اور طرزِ عمل اپنائیں۔ چین میں خاندانی کاروبار اس لئے کامیاب ہے کہ سب لوگ اس خاندان کی وفاداری کا دم بھرتے ہیں جبکہ اجتماعی طور پر قائم شدہ تجارتی ادارے اس لئے کامیاب نہیں ہوتے کیونکہ کوئی بھی شخص کسی حصے دار سے مخلصانہ اور بے غرضانہ وفاداری کا رویہ اور طرزِ عمل اپنانے پر مجبور نہیں ہوتا۔ جب مختلف افراد باہمی رضامندی، غور و فکر اور تدبر کے ذریعے ایک حکومت کا قیام عمل میں لاتے ہیں، تو پھر اس حکومت کی پائیداری اور کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ سب فریق عمومی طور پر قانون کا احترام کریں، قوم کو بھی وقار عطا کریں اور کسی ایک اصول و قانون کو اپنے لئے قابلِ احترام سمجھیں۔ مثال کے طور پر، جب کچھ دوست کسی مسئلے کے متعلق فیصلہ کرنا چاہتے ہیں تو وہ نہ تو اس مسئلے کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں اور نہ ہی اکثریت کے فیصلے کی پابندی کرتے ہیں، بلکہ اس معاملے پر اس وقت تک اس کے ہر پہلو کے لحاظ سے بات چیت اور گفتگو کرتے ہیں جب تک وہ اپنی اس ''بحث اور گفتگو'' کی روح اور مقصد تک نہیں پہنچ جاتے جو صرف اور صرف ''نیک نیتی'' ہی کے ذریعے پیدا ہوتی ہے۔ اس صورت حال میں صرف ایک غیر معمولی مساوات پر مبنی معاشرے کے متعلق کچھ خدشات ابھرتے ہیں، لیکن حکومتی سطح پر کسی حد تک باہمی رضامندی اور مساوات کے بغیر باہمی گفت وشنید کی عدم موجودگی میں حکومتی نظام چل نہیں سکتا۔

مزید برآں، باہمی گفت وشنید، رضامندی اور بحث و مباحثے کے ذریعے قائم ہونے والی

حکومت کی پائیداری اور استحکام کا تصور اور احساس، مختلف قسم کے گھرانوں، مثلاً فگرز (Fuggers) یا روتھس چائلڈز (Roths Childs)، کویکرز (Quackers) کے مانند ایک چھوٹے سے مذہبی ادارے، ایک ظالم قبیلے یا پھر وہ قوم جو حالت جنگ میں ہو یا جنگ کے خطرے سے دوچار ہو کے حوالے سے زیادہ مشکل نہیں ہے۔ لیکن اس ضمن میں بیرونی دباؤ ناگزیر ہے اور اس کی موجودگی سے انکار بھی ممکن نہیں ہے کہ اس کے باعث فریقین علیحدہ ہو جانے کے تصور سے خوف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ کسی ایک مشترک فوری اور شدید خطرے کو مرکز توجہ بنا کر اتحاد و اتفاق قائم رکھا جا سکتا ہے۔ بہر حال مجموعی طور پر، اس دنیا میں طاقت و اختیار کے باعث پیدا ہونے والے مسائل اس طرح حل کرنے مشکل ہیں۔ اس مرحلے پر اس قسم کے شدید اور فوری خطرے یعنی جنگ کو ختم ہو جانا چاہئے جس سے باہم قوم میں اتحاد و اتفاق پیدا ہو جاتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ سماجی تعاون اور معاونت بھی موجود رہنی چاہئے۔ یہ مسئلہ نفسیاتی اور سیاسی لحاظ سے بہت ہی مشکل ہے اور اگر ہم اسے تمثیل کی نظر سے دیکھیں، تو پھر کم از کم کسی ایک قوم کے غلبے اور تسلط کے ذریعے یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ کسی مجبوری یا دباؤ کے تحت بین الاقوامی مفاہمت اسی طرح ایک مشکل امر ہے، جس طرح تقسیم سے پہلے پولینڈ کی مطلق العنانیت کے تحت مشکل تھی۔ اس حوالے سے بین الاقوامی طور پر تباہ و برباد ہو جانے یا تباہ و برباد کر دینے کا تصور، عام فہم و سمجھ بوجھ کے حوالے سے قابل ترجیح ہے۔ دنیا میں رہنے والے انسانوں کو ایک منظم زندگی بسر کرنے کے لئے ایک باقاعدہ حکومت درکار ہوتی ہے، لیکن ان ممالک میں جہاں بدنظمی اور افراتفری کا دور دورہ رہا ہو، باقاعدہ حکومت کے قیام سے پہلے وہاں کے عوام کو آمریت اور مطلق العنانی قبول کرنا پڑتی ہے۔ لہذا پہلے ہمیں ایک حکومت، خواہ آمریت ہی کیوں نہ ہو، کو قائم کرنا چاہئے، اور جب یہ حکومت ایک نظام کے تحت آ جائے، تو پھر ہم ایک جمہوری حکومت کے کامیاب قیام کی امید کر سکتے ہیں۔

اپنی کتاب "The Modern Corporation and Private Property" صفحہ 353 پر صنعتی اداروں کے متعلق اپنے موقف کا اظہار کرتے ہوئے اے۔اے۔ برلے (A.A.Berle) اور جی۔سی۔ مینز (G.C.Means) کہتے ہیں:

"ایک ادارے کے قیام اور استحکام کے لئے مکمل قوت و اختیار بہت ہی

مفید ہے۔ آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر، یہ سماجی دباؤ بھی پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے کہ تمام متعلقہ فریقین کے مفاد کے لئے اقتدار واختیار کی موجودگی ضروری ہے۔ یہ سماجی دباؤ، جو اس سے قبل مذہبی اور سیاسی اداروں میں موجود رہا ہے، معاشی شعبے میں بھی پہلے سے موجود ہے۔''

میں نے یہاں دو قسم کے افراد کا ذکر کیا ہے، پہلی قسم ان افراد کی ہے جو احکامات جاری کرتے ہیں، اور دوسری قسم ان افراد کی ہے جو احکامات کی تعمیل کرتے ہیں، لیکن افراد کی ایک تیسری قسم بھی موجود ہے، جو بحرانی، مشکل اور خطرناک حالات میں نہ تو قائدانہ کردار کرتے ہیں، اور نہ ہی محکومانہ کردار ادا کرتے ہیں، بلکہ معاملات سے الگ ہو جاتے ہیں۔ ان افراد میں اس قدر حوصلہ موجود ہوتا ہے حاکمانہ رویے کی موجودگی کے باوجود جو قائدانہ کردار ادا کرنے کا باعث بنتا ہے، اطاعت اور فرمانبرداری سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے افراد معاشرتی ڈھانچے میں فوری طور پر اپنی جگہ نہیں بنا سکتے اور پھر کسی نہ کسی طرح اور اس وقت وہ اپنے لئے پناہ اور حفاظت کی تلاش میں ہوتے ہیں جب وہ زیادہ سے زیادہ یا کم سے کم انفرادی آزادی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ بعض اوقات اس قسم کے مزاج کے افراد عظیم تاریخی اہمیت اختیار کر لیتے ہیں: اس ضمن میں یاد رہے کہ ابتدائی مسیحی اور ابتدائی امریکی افراد، افراد کی دو اقسام کا ظاہر کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ ذہنی طور پر پناہ اور حفاظت کی تلاش میں ہوتے ہیں، بعض اوقات وہ جسمانی طور پر پناہ اور حفاظت کی تلاش میں ہوتے ہیں، بعض اوقات وہ ایک خانقاہ میں تنہائی کے طلب گار ہوتے ہیں اور بعض اوقات وہ معاشرے سے الگ تھلگ ہو کر زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ ذہنی تنہائی یا پناہ کی تلاش میں وہ لوگ ہوتے ہیں جو کسی نامعلوم عقیدے سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی دلچسپیاں معمولی خبط اور انوکھی سوچ میں گرفتار ہوتی ہیں، اور جو خود کو عالم فاضل سمجھتے ہیں لیکن ان کی فضیلت قطعی غیر اہم ہوتی ہے۔ مزید برآں، جسمانی تنہائی اور پناہ کی تلاش میں وہ لوگ ہوتے ہیں جو معاشرے سے دور دور رہنا چاہتے ہیں اور ان افراد کی بہترین مثال بیٹس[6] (Bates) ''ایک فطرت نگار'' کی ہے جس نے ہندوستانیوں کے معاشرے سے علیحدہ ہو کر پندرہ برس ہنسی خوشی بسر کر دیئے۔ کسی تارک الدنیا کی طبع اور مزاج، اس ضمن میں بہترین کردار ادا کرتا ہے جس کے باعث وہ شہرت اور مقبولیت کی تحریص وترغیب سے خود کو محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تا کہ وہ رائے عامہ کی

طرف سے تنقید سے صرف نظر کرتے ہوئے اپنی اہم اور عظیم ذمے داری اور فرض کو بغیر کسی رکاوٹ کے نبھاتا رہے اور مروجہ غلط روایات اور عقائد کے باوجود ایک قابل قدر صحیح اور درست رائے، موقف اور نظریے کی تخلیق کر سکے۔

اس قسم کے افراد میں سے کچھ لوگ، درحقیقت اقتدار و اختیار کی خواہش سے لاتعلق اور بیزار نہیں ہوتے لیکن مروجہ طریقوں کے ذریعے اسے حاصل کرنے کی ان میں صلاحیت نہیں ہوتی۔ اس قسم کے لوگ ولی، بزرگ بن سکتے ہیں، یا ایک نئے عقیدے کے بانی ثابت ہو سکتے ہیں، اور یا پھر ایک نئے مذہبی عقیدے اور یا پھر فن یا ادب کے مضامین کی درسگاہوں کے قیام میں بانیانہ کردار ادا کر سکتے ہیں۔ وہ خود کو پیروکاروں کے ایک ایسے گروہ کے ساتھ منسلک کر لیتے ہیں جو ایک طرف تو اطاعت و فرمانبرداری کو پسند بھی کرتا ہے لیکن اس میں بغاوت اور سرکشی کی تمنا اور آرزو بھی موجود ہوتی ہے۔ موخر الذکر قسم کے افراد روایت پسندی کے خلاف ہوتے ہیں جبکہ اول الذکر قسم کے افراد نئے عقائد اور نظریات کو بلاچون وچراں قبول کر لیتے ہیں۔ ٹالسٹائی اور اس کے حمایتی اور پیروکار اسی زمرے میں آتے ہیں۔ درحقیقت حقیقی تنہا زندگی بہت ہی مختلف ہوتی ہے۔ اس کی ایک بہترین مثال اس خبطی جیکوئس (Jacques) کی ہے جو پہلے تو نیک ڈیوک (Duke) کے ساتھ جلاوطن ہو جاتا ہے، اور پھر عدالت میں حاضر ہونے کے بجائے بدکار ڈیوک (Duke) کے ساتھ جنگلوں میں مارا مارا پھرتا ہے۔ بہت سے قدیم امریکی افراد طویل مشکلات اور تنہائی کی زندگی برداشت کرنے کے بعد اپنے گھر بار اور کاروبار فروخت کر کے اس وقت دور کہیں مغرب کی طرف منتقل ہو گئے جب تہذیب نے انہیں چھونے کی کوشش کی۔ اس قسم کے مزاج اور طبع کے افراد کو دنیا میں بہت کم مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ جرائم کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، کچھ لوگ اکھڑ مزاج اور چڑچڑے ہو جاتے ہیں اور معاشرے مخالف رویوں کو اپنے ذہنوں میں بٹھا لیتے ہیں۔ مزید برآں جب اس قسم کے افراد کے درمیان روابط میں اضافہ ہو جاتا ہے تو ان میں مردم بیزاریت بڑھ جاتی ہے، اور جب وہ تنہائی کی زندگی بسر نہیں کر سکتے تو وہ فطری طور پر تشدد کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

بزدل افراد کا گروہ نہ صرف ایک قائد اور راہنما کی اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے مزید منظم ہو جاتا ہے بلکہ، چونکہ ان کا مزاج اور طبع بھی ایک جیسی ہوتی ہے، اس لئے وہ ایک تنظیم کی

صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک پُر جوش عوامی جلسے میں، جن کا مقصد صرف اور صرف ہمدردی میں مضمر ہوتا ہے، تو پھر انہیں، گرم جوشی، تحفظ کے ساتھ ساتھ خوشی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ پھر ان کے درمیان موجود جذبات زیادہ سے زیادہ ہوتے جاتے ہیں، اور ان جذبات کی موجودگی میں دیگر تمام قسم کے جذبات و احساسات غائب ہو جاتے ہیں اور پھر تمام افراد کی مفاد پرستی اور انا مل کر اقتدار اور اختیار کے ایک خوش کن احساس کو جنم دیتے ہیں۔ یہ اجتماعی جوش وخروش ایک پُر لطف نشے کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے جہاں فہم وفراست، عقل و دانش، انسانیت حتیٰ کہ تحفظ ذات کا تصور واحساس بھی بآسانی فراموش کر دیا جاتا ہے اور جہاں ناجائز قتل عام اور جرات مندانہ شہادت وقربانی، یکساں طور پر ممکنات میں شامل ہو سکتے ہیں۔ دیگر تمام نشوں کے مانند، جب اس نشے کے لطف اور فرحت سے آشنائی ہوتی ہے تو پھر اس سے مزاحمت بہت ہی مشکل ہو جاتی ہے لیکن بالآخر یہ نشہ بیگانگی، لاتعلقی، افسردگی اور پریشانی کی طرف لے جاتا ہے، اور اگر پہلے جیسی گرمجوشی، لطف اور فرحت دوبارہ درکار ہو تو ایک نئے طاقتور اور مضبوط محرک کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

موسیقی کے ایک ساز ینے یا دُھن کے باعث پیدا ہونے والے ولولے، جوش و امنگ کے لئے اگرچہ کسی راہنما یا قائد کی ضرورت نہیں ہے، مزید برآں، کسی گروہ یا ہجوم کی طرف دیکھے گئے ایک خوشگوار اور پُر تجسس منظر کے لئے بھی کوئی قائد یا راہنما درکار نہیں ہے، کیونکہ اس موسیقی کے ساز ینے میں جوش پیدا کرنے کے لئے محض ایک گلوکار/گلوکارہ اور گروہ یا ہجوم یا مجمع میں جوش وخروش پیدا کرنے کے لئے محض ایک خطیب کے الفاظ ہی کافی ہیں۔ اس لئے اجتماعی خوشی ومسرت کا لطف، قائدین کی صلاحیتوں، اس کے اقتدار کا ایک اہم عنصر ہے۔ اس قائد اور راہنما کو اپنے اندر پیدا ہونے والے احساسات سے کسی دوسرے کو آگاہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ ان احساسات سے خود اپنے وجود اور ذات کو آگاہ کر سکتا ہے، جیسے شیکسپیئر کے ایک کردار انٹونی (Antony) کے کہے تھے:

فتنہ وفساد برپا نہ ہونے دو
کہ تم تو پہلے ہی
بے سروسامانی کی حالت میں ہو
جب تک تم خود کمزور و نحیف ہو

پہلے اپنے آپ کی فکر کرو

پہلے خود کو سنبھالو

لیکن ایک قائد اور راہنما اس وقت تک بمشکل ہی کامیاب ہوتا ہے جب تک وہ اپنے حامیوں اور ساتھیوں پر اپنے اقتدار واختیار کا اظہار نہیں کر لیتا۔ اس لئے ترجیحی طور پر وہ دانستہ طور پر اس قسم کی صورت حال تخلیق کرے گا، اور اپنے حامیوں اور ساتھیوں کا ایک ایسا گروہ تشکیل دے گا جو اس کی کامیابی کے راستے کو آسان کر دے۔ اس ضمن میں وہ صورت حال بہترین معلوم ہوتی ہے جس میں ایک ایسا مناسب خطرہ سامنے لایا جاتا ہے جس کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ لوگ خود کو دلیر اور بہادر سمجھ سکیں، لیکن اس قدر شدید خطرناک صورت حال پیدا نہیں کی جاتی جو ان پر خوف و ہراس مسلط کر دے، مثلاً اپنے کسی دشمن ملک کے ساتھ ایک خوفناک جنگ کا آغاز جو ناقابل تسخیر ہو۔ جب ایک ماہر مقرر اپنے سامعین کے جنگجویانہ جذبات واحساسات ابھارنا چاہتا ہے تو وہ ان لوگوں میں دو قسم کے اعتقادات اور یقین پیدا کرتا ہے۔ پہلا ایک مافوق الفطرت یقین اور اعلیٰ درجے کا، کہ جس کے لئے یہ مقرر اپنے دشمن کی طاقت کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے تاکہ سامعین میں ایک غیر معمولی حوصلہ اور جرات پیدا ہو جائے، دوسرا ایک معمولی اور کم درجے کا یقین، کہ جس کے لئے یہ مقرر اپنے سامعین میں کامیابی کا قطعی تصور پیدا کر دیتا ہے۔ بہرحال، ان دونوں قسم کے اعتقاد اور یقین کے لئے صرف ایک ہی مقولہ استعمال ہوتا ہے، یعنی

''طاغوتی طاقت کے مقابلے میں ہمیشہ حق کی فتح ہوتی ہے۔''

علاوہ ازیں یہ خطیب اور مقرر اپنے ساتھیوں اور حمایتیوں میں دو قسم کے جذبات پیدا کرنا چاہے گا، ایک وہ جذبہ جس میں خوف و ہراس، اور اس کے باعث پیدا ہونے والی نفرت موجود ہو، اور دوسرا وہ جذبہ جس میں دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے آہستہ آہستہ اشتعال انگیز رویے کو ہوا دی جائے اور امید کی راہ دکھائی جائے۔ اگر یہ مقرر، مکمل طور پر خبطی نہیں ہے تو وہ ایسے اصول وقوانین وضع کرے گا جو اس کی سرگرمیوں اور کارکردگی کو سند مقبولیت عطا کر دیں گے۔ وہ اس نہج پر سوچے گا کہ استدلال کے بجائے اس کا اپنا خیال اور موقف ہی اس کے لئے مفید ہے، کہ ان کی رائے کا تعین دماغ کے بجائے خون کے ذریعے ہونا چاہئے، اور یہ بھی کہ انسانی زندگی میں بہترین عناصر، انفرادی کے بجائے اجتماعی ہیں۔ اگر ملک کا تعلیمی نظام بھی اس کے زیر اثر ہے تو وہ نظم وضبط اور

جوش و جذبے پیدا کرنے والے تمام طریقوں کو بدل دے گا جبکہ علم اور انصاف غیر انسانی طریقوں کے بے حس حامیوں کے لئے مختص کر دیا جائے گا۔

بہر حال، اقتدار و اختیار کے خواہشمند افراد، تمام کے تمام خطیب یا مقرر قسم کے نہیں ہوتے۔ افراد کی ایک ایسی قطعی مختلف قسم بھی موجود ہے جن کی خواہش اقتدار، ملکی نظام پر ان کی گرفت سے مشروط ہے، اس ضمن میں برونو مسولینی (Bruno Mussolini) کی مثال دی جا سکتی ہے جس نے جنگ ابی سینیا میں اپنے دشمن کے لئے فضا میں سے استحصالی حالات پیدا کئے:

> ''ہمیں پہاڑوں، میدانوں اور دیہاتوں میں موجود درختوں کو آگ لگانا پڑی، یہ سب کچھ بہت ہی تباہ کن تھا...... بموں کے زمین پر پہنچنے سے پہلے ہی یہ فضا میں پھٹ جاتے، سفید دھواں پھیل جاتا، آگ کے شعلے بھڑک اٹھتے اور خشک گھاس دھڑا دھڑ جلنا شروع ہو جاتی۔ اف میرے خدا، جانوروں میں کیسی بھگدڑ مچ گئی اور وہ کس بُری طرح بھاگے...... جب بم پھینکنے والی مشینیں بموں سے خالی ہو گئیں تو ہاتھوں سے بم پھینکے جانے لگے...... یہ بہت ہی پُر لطف منظر تھا۔ جھاڑیوں میں گھرے ہوئے اونچے درختوں کو نشانہ بنانا مشکل تھا۔ گھاس پھوس کی بنی ہوئی چھت کا نشانہ لینے میں، میں نے نہایت احتیاط سے کام لیا اور بمشکل تیسری کوشش میں مجھے کامیابی نصیب ہوئی۔ گھاس پھوس کی چھتوں والی جھونپڑیوں کے قابلِ رحم مکین آگ لگتے دیکھ کر چھلانگیں لگاتے ہوئے باہر آئے اور پاگلوں کی طرح بھاگنے لگے۔
>
> تقریباً پانچ ہزار اہل ابی سینا کے اردگرد لگی آگ نے سب کچھ جلا کر بھسم کر دیا اور آخر میں ایک خوفناک نظارہ باقی رہ گیا، ایسے ہی تھا جیسے دوزخ زمین پر اتر آئی ہو......''

ایک مقرر یا خطیب کو اپنی کامیابی کے لئے ایک بصیرت افروز نفسیاتی عمل درکار ہوتا ہے لیکن برونو مسولینی جیسے ہوا باز کو خوشی و مسرت اور لطف حاصل کرنے کے لئے کسی بھی قسم کے نفسیاتی عمل کی ضرورت نہیں ہوتی، اور اسے محض یہ علم ہوتا ہے کہ آگ میں جل کر مرنے کا نظارہ اور عمل،

ناخوشگوار ہوتا ہے اور طبع پر ناگوار گزرتا ہے۔ ایک خطیب یا مقرر، پرانی قسم کا ہوتا ہے، یعنی وہ شخص جس کی قوت و طاقت کا انحصار جدید نظام پر ہے۔ لیکن یہ سب ایسا نہیں ہے، مثال کے طور پر کارتھاجینی[7] (Carthajinion) ہاتھیوں کو ''پہلی پیونک[8] جنگ'' (First Punic War) کے اختتام پر کیسے ٹرائے کے باغی سرکشوں کو کچلنے کے لئے کیسے استعمال کیا گیا جہاں جنگ کا نفسیاتی طریقہ کار وہی تھا جو برونو مسولینی نے استعمال کیا تھا۔ لیکن اگر بلحاظِ تقابل دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے گزشتہ کسی دور کی نسبت آج کے عہد میں میکانکی قوت کہیں زیادہ خصوصیات کی حامل ہے۔

طبقہء امرا کے کسی فرد کی اقتدار پر غلبے اور بالا دستی میں پوشیدہ نفسیاتی عوامل، جن کا انحصار میکانکی قوت پر ہے، دنیا بھی کہیں بھی ابھی مکمل طور پر پھل پھول نہیں سکی۔ بہرحال، یہ عمل مستقبل قریب کے ممکنات میں سے ہے، اور صفاتی اعتبار کی نسبت کمیتی اعتبار سے ایک قطعی نئی نوعیت کا حامل ہے اور اب کسی تکنیکی طور پر تربیت یافتہ مطلق العنان حکمران کے لئے یہ امر قابلِ عمل ثابت ہوتا کہ وہ ہوائی جہازوں، بحری جہازوں، توانائی اور وسائل مراکز، ذرائع آمدورفت پر قبضہ کر کے ایک ایسی آمریت قائم کر لے جس کے تحت دوسرے تمام فریقوں کے ساتھ مصالحت کا امکان نہ ہو۔ ''سلطنتِ لیپوٹا'' (Empire of Laputa) نے سورج اور اپنے باغی صوبے کے درمیان مداخلت کے باعث اپنی قوت قائم رکھی جو سائنسی تکنیک کاروں کے اتحاد کے لئے جو یکساں طور پر تباہ کن ثابت ہوئی۔ وہ اس باغی اور سرکش علاقے کے مکینوں کو خوراک کی قلت میں مبتلا کر سکتے تھے اور روشنی، گرمائش اور بجلی جیسے ذرائع آسائش پر قبضہ کرنے کے بعد اہلِ علاقہ کو ان سے محروم کر سکتے تھے، وہ اس علاقے میں زہریلی گیس یا جراثیم پھیلا سکتے تھے۔ مزاحمت کی تو قطعی امید نہ ہوتی اور میکانکی طور پر تربیت یافتہ اس علاقے پر قابض افراد، انسانوں کو اپنے میکانکی کل پرزوں کے لحاظ سے تصور کرتے، جس طرح احساس سے عاری قوانین کے ذریعے ایک ظالم اور استبدادی حکمران فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس قسم کی حکومت انسانیت کے بارے سرد مہری پر مبنی ان خصوصیات سے مزین ہوتی جو گزشتہ ظالم حکمرانوں کا خاصا تھی۔

اس کتاب میں، میں نے اپنا یہ نقطہ نظر بیان کیا ہے کہ اقتدار و اختیار مادی چیزوں پر نہیں بلکہ انسانوں پر ہونا چاہئے۔ لیکن اس مرحلے پر مادی چیزوں پر اقتدار و اختیار کی بنیاد پر یہ بھی ممکن ہے کہ انسانوں پر تکنیکی طور پر اقتدار و اختیار قائم کر دیا جائے۔ جو لوگ ایک مضبوط نظام کار کو اپنی

گرفت میں رکھنے کے عادی ہیں، اور اس غلبے کے باعث انہوں نے انسانوں پر اقتدار و اختیار قائم کر لیا ہے، تو پھر ان سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے محکوموں کے متعلق ایک ایسا تصوراتی نقطہ نظر اور موقف اختیار کریں جو ان افراد سے قطعی مختلف ہو جو جدوجہد پر انحصار کرتے ہیں، خواہ یہ جدوجہد بے ایمانی اور دھوکے بازی پر مبنی ہو۔ ہم میں سے اکثر افراد کبھی کبھی دانستہ طور پر چیونٹی کے بل کو اکھیڑ دیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی پریشانی اور خوف و ہراس سے مسکراتے ہوئے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ نیویارک میں بلند و بالا عمارتوں پر کھڑے ہو کر اگر نیچے سڑک پر گاڑیوں اور انسانوں کی آمد و رفت دیکھیں، تو انسان، انسان نہیں نظر آتے اور ان کے متعلق ہم یہ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ کیا ہیں۔ اگر ایک شخص ''جووی'' (Jove) کے مانند کسی شخص کے ہاتھ میں آتشیں اسلحہ ہوتا، تو وہ اسی تناظر میں انسانوں کے ہجوم پر اندھا دھند گولیاں چلا دیتا جیسے ہم میں سے اکثر افراد ارادی طور پر چیونٹی کے بل کو تہس نہس کر دیتے ہیں۔ جب برونو مسولینی نے اپنے ہوائی جہاز میں سے ابی سینا کے مکینوں کا جائزہ لیا تو اس کے بھی عین مین یہی احساسات تھے۔ اس تکنیکی حکومت کا تصور کریں، جو تباہ ہو جانے یا قتل ہو جانے کے خوف کے پیش نظر خاص خاص مواقعوں کے علاوہ ہمیشہ ہوائی جہازوں، بلند و بالا عمارتوں اور سمندر میں موجود حفاظتی کشتیوں میں زندگی بسر کرتی ہو۔ اس صورت میں کیا یہ ممکن ہے کہ یہ حکومت اپنے عوام کی خوشی اور خوشحالی کے لئے کسی بھی قسم کا کوئی قدم اٹھائے گی؟ یقیناً نہیں، بلکہ اس کے بجائے، عملی طور پر ایسا ہوگا کہ حالات صحیح ہونے پر یہ حکومت اپنے عوام کے ساتھ اسی طرح غیر انسانی رویہ اور طرز عمل اختیار کرے گی جس طرح مشینوں کے ساتھ رویہ روا رکھا جاتا ہے، لیکن جب اس حکومت کو کوئی شخص یہ بتاتا ہے کہ یہ عوام، مشینیں نہیں ہیں بلکہ انسان ہیں، تو پھر یہ حکومت غیض و غضب میں مبتلا ہو کر کم از کم مزاحمت کے ذریعے عوام کو نیست و نابود کرنے پر مبنی قدم اٹھائے گی؟

ممکن ہے کہ اس کتاب کے قاری کے نزدیک یہ تمام کچھ محض ایک غیر ضروری خوفناک خواب ہو۔ کاش میں اس نقطہ نظر اور موقف سے متفق ہوتا۔ مجھے یہ اعتراف ہے کہ میکانکی قوت، ایک نئے انداز فکر کو جنم دیتی ہے جس کے ذریعے کسی بھی گزشتہ دور کی نسبت یہ امر اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ حکومت پر گرفت مضبوط رکھنے کے راستے اور طریقے تلاش کئے جائیں۔ ممکن ہے کہ تکنیکی ترقی اور ارتقاء کے باعث جمہوریت زیادہ مشکل محسوس ہوتی ہو لیکن جمہوریت کا وجود پہلے

سے زیادہ اہم ہے۔ جس شخص کے ہاتھ میں وسیع میکانکی طاقت آ جاتی ہے وہ خود کو ایک قسم کا دیوتا سمجھنے لگتا ہے، وہ خود کو مسیحیت کا "محبت کا دیوتا" نہیں بلکہ ایک بے دین، مادہ پرست، گرج چمک اور آگ کا دیوتا سمجھنے لگتا ہے۔

لیوپارڈی[9] مندرجہ ذیل اشعار میں یہ بیان کرتا ہے کہ ویسویئس[10] (Vesuvius) کی ڈھلانوں پر کیسا آتش فشانہ عملی قدم اٹھایا گیا:

یہ خطہ ہائے ارض
اب بھر بھرا جڑ گئے ہیں
اُبلتی، جلتی اور کھولتی ہوئی راکھ
اور آتش فشانی لاوا
جو منجمد ہو کر
تہہ بہ تہہ چٹان بن گیا ہے
شعلوں کی دمک ارتعاش کے مانند ہے
جو تنہا زائر کے تلووں کی بازگشت
کی طرح سنائی دیتی ہے
دھوپ میں کنڈلی مارے سانپ کے مانند
پوری چٹان میں غار در غار
دراڑیں پڑ گئی ہیں
کبھی یہاں، اسی جگہ
لہلہاتے کھیت ہوا کرتے تھے
اور تاحد نظر، سنہری فصلیں ہوتی تھیں
ممیاتی بکریوں اور ڈکارتی گائیوں
کی صدا گونجتی تھی
یہاں کبھی باغات اور محلات ہوتے تھے
جہاں صاحب اقتدار نواب اور راجے

فارغ اوقات میں
دل بہلایا کرتے تھے
یہاں کبھی معروف بستیاں آباد تھیں
لیکن اب سنگدل چٹانیں
پگھلتے لاوے کی ندیاں اگل رہی ہیں
جنہوں نے اس علاقے
کے مکینوں کو ہلاک کر دیا ہے
اب تو سب کچھ تباہ ہو چکا ہے
اور بہت کچھ تو
زیرِ زمیں دفن ہو چکا ہے!!

اس قسم کے نتائج اب مختلف قسم کے افراد بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس قسم کے نتائج پہلے گیور نیکا (Guernica) میں حاصل کئے گئے، اور شاید بہت عرصہ پہلے یہی حالات و واقعات یہاں بھی رونما ہوتے ہوں گے جہاں اس وقت لندن (London) واقع ہے۔ اس مطلق العنان حکمران سے کس اچھائی اور بھلائی کی امید کی جا سکتی ہے جو اس قسم کی تباہی و بربادی کے ذریعے اقتدار کی بلندیوں پر پہنچ جانا چاہتا ہو گا؟ اور اگر یہ شہر لندن اور پیرس کے بجائے برلن اور روم ہوتے، جو نئے دیوتاؤں کی تباہ کاریوں سے تباہ ہو گئے، تو اس قسم کے تباہ کن قدم کے بعد کیا انسانیت اس روئے زمین پر موجود اور زندہ رہ سکتی؟ کیا انسانی ہمدردی سے لبریز دل ظالموں کے پاگل پن کا شکار نہ ہو جاتے اور اُن سے بھی بدتر ہو جاتے جنہیں اپنے ساتھیوں پر ظلم ڈھانے کی قطعاً ضرورت نہ تھی؟

قدیم ادوار میں اکثر لوگ طلسمی قوت حاصل کرنے کے لئے خود کو شیطان کے ہاتھ فروخت کر ڈالتے تھے، اور آج کے جدید دور میں یہ لوگ سائنس سے یہ قوت حاصل کرتے ہیں اور وہ شیطان کے روپ میں ڈھل جاتے ہیں۔ اس دنیا میں نیکی اور بھلائی کی اس وقت تک قطعی کوئی امید نہیں ہے جب تک اختیار و اقتدار کو انسانیت کی بھلائی کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا، اور نسلی،

سیاسی، معاشی اور معاشرتی امتیاز کے قطع اسے انسانیت کی خدمت کے لئے مختص نہیں کیا جاتا، کیونکہ سائنس کے باعث یہ امر ناگزیر حیثیت اختیار کر چکا ہے کہ انسانیت یا تو زندہ رہے اور یا پھر ہلاک ہو جائے۔

حوالہ جات

1- نٹراشے ایک جرمن دانشور اور عالم (1844-1900) تھا جس نے مسیحیت کی جانب سے اخلاقی اقدار اور غلامانہ اخلاقیات کو یکسر مسترد کر دیا۔

2- ڈی ایچ لارنس D.H.Lawrence (1901-1988)۔ لارنس ڈیوڈ ہربرٹ، ایک انگریز مصنف جس کے خیال کے مطابق جذباتی اور جنسی امنگ و خواہش، انسانی فطرت کے لئے تخلیقی اور حقیقی نوعیت کی حامل ہے۔

3- اٹیلا Attila (406-453) ہنز Hunz کا بادشاہ جسے ''خدائی قہر'' کہا جاتا تھا، اس نے اس دور میں دنیا کے بہت سے علاقے فتح کئے لیکن ایک دو جگہ اسے شکست کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

4- کورسیکا (Corsica): سارڈینا (Sardina) کے شمال میں اٹلی کے مغربی ساحل کے بالمقابل بحراوقیانوس کے علاقے میں فرانس کا مختلف جزائر پر مشتمل خطہ۔

5- سیسل رہوڈز (Ceicil Rhodes) (1853-1902) انگلستان میں پیدا ہونے والا جنوبی افریقہ کا سیاست دان، کیپ کالونی کا وزیر اعظم (1890-96) رہا۔ اس کے مقاصد میں کیپ سے قاہرہ تک جنوبی افریقہ کا وفاق اور برطانوی اتحادی خطے کا قیام شامل تھا۔

6- بیٹس (Bates)، ہنری والٹر (Henry Walter) (1825-1892)۔ انگریز ناول نگار اور محقق جس نے مختلف حشرات کی 8000 نئی اقسام دریافت کیں۔

7- کارتھیج (Carthage)۔ شمال افریقہ کی ایک قدیم بندرگاہ/شہر۔

8- روم اور کارتھیج کے درمیان ہونے والی تین جنگیں ''پیونک جنگیں'' (Punic War)

کہلاتی ہیں۔ پہلی جنگ (264-241BC)، دوسری جنگ (218-210BC)، تیسری جنگ(169-146BC)۔

9- لیوپارڈی(Leopardy):(1798-1837)ایک اطالوی رومانوی شاعر

10- نیپلز(Naples) میں موجود زندہ آتش فشاں۔ اونچائی1277m(4190فٹ)

تیسرا باب

اقتدار کی اقسام

اقتدار و اختیار، ایک ایسی چیز/ شئے ہے جو افراد کے طبعی اثرات میں سے جنم لیتی ہے لہٰذا یہ ایک کمیتی اور ٹھوس تصور ہے: یعنی اگر دو افراد کی خواہشات یکساں ہوں، اگر ایک شخص، دوسرے شخص کے مانند اپنی تمام خواہشات حاصل کر لیتا ہے، اور دوسرے بھی اپنی خواہشات حاصل کر لیتے ہیں، تو اسے دوسرے شخص کی نسبت زیادہ اختیار و اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن ان دو افراد کے اقتدار و اختیار کے درمیان تقابل کرنے کا کوئی بالکل صحیح طریقہ موجود نہیں ہے کہ جن میں سے ایک اپنی تمام خواہشات کی تکمیل کر لیتا ہے اور دوسرا بھی اپنی تمام خواہشات کو عملی شکل میں ڈھال لیتا ہے۔ مثال کے طور پر دو مصوروں میں سے ہر ایک مصور یہ چاہتا ہے کہ وہ ایک اچھی تصویر بنائے اور دولت مند ہو جائے، اور ان میں سے ایک جو ایک اچھی تصویر بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے، اور دوسرا دولت کمانے میں کامیاب ہو جاتا ہے، تو ان کے درمیان یہ تقابل مشکل ہے کہ کس کے پاس زیادہ قوت و اختیار ہے۔ بہرحال، اندازاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''ب'' کی نسبت ''ا'' کے پاس زیادہ قوت و اختیار ہے، بشرطیکہ ''ا'' اپنی زیادہ خواہشات کی تکمیل کرے اور ''ب'' اپنی چند خواہشات کی تکمیل کر سکے۔

اقتدار کی اقسام کی مزید تشریح کرنے اور انہیں مفصل طور پر بیان کرنے کے مختلف طریقے استعمال کئے جاتے ہیں اور ہر طریقہ اپنی جگہ اپنی مخصوص افادیت سے بھرپور ہے۔ اس ضمن میں اقتدار کی اقسام کو مزید دو ذیلی اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1- بنی نوع انسان پر اقتدار و اختیار

2- بے جان اجسام یا زندگی کے غیر انسانی وجود پر اقتدار و اختیار

اس وقت تو میں خاص طور پر ''بنی نوع انسان پر اقتدار و اختیار'' کے متعلق اپنی گزارشات پیش کرنا چاہوں گا لیکن یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جدید دنیا میں تغیر و تبدل کی سب سے بڑی وجہ ''بے جان اجسام یا زندگی کے غیر انسانی وجود پر اقتدار و اختیار'' ہے جس کے لئے ہم سائنس کے احسان مند ہیں۔

مزید برآں ''بنی نوع انسان پر اقتدار و اختیار'' کی مزید تقسیم درج ذیل عناصر کے مطابق کی جاسکتی ہے:

1- انسانوں پر اثر انداز ہونے کا طریقہ

2- متعلقہ انسانی ادارے یا تنظیم کی قسم

ایک انفرادی فرد پر کچھ یوں اثر انداز ہوا جاسکتا ہے:

ا۔ وجود انسانی پر براہ راست جسمانی قوت کے ذریعے: یعنی جب کسی فرد کو قید کرلیا جاتا ہے یا اسے ہلاک کر دیا جاتا ہے۔

ب۔ ایک فرد یا افراد کو سزا دینے یا فائدہ پہنچانے کے ذریعے: یعنی جب کسی فرد کو ملازمت (روزگار) مہیا کی جاتی ہے یا اسے ملازمت (روزگار) مہیا نہیں کی جاتی۔

ج۔ رائے یا موقف پر اثر انداز ہونے کے ذریعے: یعنی اس فرد کے خلاف منظم تشہیری مہم چلائی جاتی ہے۔ بعض اوقات، دوسرے افراد میں اپنی پسندیدہ عادات بھی پیدا کی جاتی ہیں، مثلاً فوجی اٹھک بیٹھک۔ اس صورت میں ایک فرد بغیر کچھ سوچے سمجھے دوسرے فرد کی ہدایات اور احکامات پر عملدرآمد کرتا ہے۔

جانوروں کے ساتھ ہمارے معاملات میں اقتدار کی یہ اقسام نہایت واضح انداز میں انجام پاتی نظر آتی ہیں جہاں تصنع، بناوٹ اور دکھاوے کی قطعی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ جب ایک چیختے چلاتے سور کے گلے میں رسی ڈال کر اسے کھینچتے ہوئے بحری جہاز میں سوار کرایا جاتا ہے، تو یہ عمل براہ راست اس کے بدن پر جسمانی قوت کے اقتدار و اختیار کا مظہر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جب ہم کسی گدھے کو کسی قسم کا لالچ (گاجر) دے کر کسی کام کی ترغیب دیتے ہیں تو ہم اسے یہ بتا رہے ہوتے ہیں کہ اس کام میں اس کا فائدہ (گاجر) موجود ہے۔ جانوروں کی ان دو اقسام کے درمیان میں وہ جانور آتے ہیں جنہیں کوئی کرتب وغیرہ سکھایا جاتا ہے اور سزا اور انعام کے ذریعے

ان کی عادتیں تشکیل اور پختہ کی جاتی ہیں۔ اور پھر ایک اور طریقے کے ذریعے بھیڑ کو بحری جہاز پر چڑھنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے، اور جب چرواہا، ایک بھیڑ کو جہاز کی راہداری میں سے لے کر جاتا ہے تو باقی بھیڑیں بھی اپنی رضامندی سے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑتی ہیں۔

جانوروں کے حوالے سے اقتدار کی یہ تمام اقسام انسانوں کے لئے بطور علامت استعمال ہوتی ہیں اور انسانوں کے لئے بطور مثال بھی استعمال ہوتی ہیں۔

سؤر کی مثال انسانوں کے حوالے سے فوج اور پولیس کی طاقت کی علامت ہے۔

لالچ (گاجر) کے زیر اثر گدھے کی مثال انسانوں کے حوالے سے منظم تشہیری مہم کی علامت ہے۔

کرتب دکھانے والے جانوروں کی مثال انسانوں کے حوالے سے "تعلیم" کی علامت ہے۔

ہچکچاہٹ اور پس و پیش میں مبتلا ایک راہ نما کی قیادت میں چلتے ہوئی بھیڑ کی مثال، انسانوں کے حوالے سے "جماعتی سیاست" کی علامت ہے، ایسے ہی جیسے، ایک قابلِ احترام راہ نما اپنی جماعت کے قائدین سے وابستہ ہوتا ہے۔

آیئے، اب ہم حیوانوں کی اس مثال کو ہٹلر کے عروج اور کامیابی پر منطبق کرتے ہیں۔ اس حوالے سے لالچ (گاجر) نازی پروگرام تھا۔ گدھا، نچلا متوسط طبقہ تھا۔ بھیڑیں اور ان کا چرواہا، سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے ارکان اور ہنڈن برگ[1] (Hinden burg) تھا۔ اور پھر سؤر (محض جہاں تک ان کی بدقسمتی کا تعلق ہے)، جنگی قیدیوں میں تشدد کا نشانہ بننے والے افراد تھے، اور کرتب دکھانے والے جانور وہ لاکھوں لوگ ہیں جو نازی ازم کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔

اکثر اداروں اور تنظیموں کی کافی حد تک شناخت ان کے ہاتھ میں موجود اقتدار و اختیار کی قسم کے ذریعے ہو جاتی ہے۔ مثلاً، فوج اور پولیس کے ادارے، افراد پر ایک زبردستی بلکہ ناجائز اقتدار و اختیار کے حامل ہیں۔ پھر، خاص طور پر معاشی ادارے کسی کو فائدہ یا نقصان پہنچانے کے ضمن میں انعام اور سزا کا طریقہ استعمال کرتے ہیں جبکہ تعلیمی درسگاہیں، عبادت گاہیں اور سیاسی جماعتیں اپنے اقتدار و اختیار کے باعث عوام الناس کی رائے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ لیکن مختلف اداروں کے درمیان موجود اقتدار کی قسم کے لحاظ سے یہ امتیاز زیادہ واضح نہیں ہے کیونکہ ہر ادارہ اپنی نوعیت کے مطابق مخصوص اقتدار و اختیار رکھنے کے باوجود اقتدار و اختیار کی دیگر اقسام بھی استعمال کرتا ہے۔

''قانون کی طاقت'' کے ذریعے ان پیچیدگیوں کی وضاحت بخوبی ہو جاتی ہے۔ قانون کی سب سے زیادہ موثر اور قوت بخش، طاقت اور اختیار ریاست کے ہاتھ میں ہوتی ہے جس کے ذریعے یہ اختیار اور طاقت ہر فرد کے خلاف زبردستی اور ناجائز طور پر بھی استعمال ہوتی ہے۔ عام طور پر مہذب معاشروں کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ ریاست کی طرف سے طاقت و اختیار کے زبردستی (کچھ حدود و قیود کے ساتھ) استعمال کے حوالے سے اسے خصوصی استحقاق حاصل ہوتا ہے، اور ہر قانون اصولوں کا ایک ایسا مجموعہ ہوتا ہے جن کے ذریعے ریاست اپنے خصوصی اختیارات اور استحقاق کے ذریعے اپنی ہی رعایا کے معاملات طے کرتی ہے۔ لیکن ریاست، سزا کا ''قانون'' نہ صرف مجبوراً اٹھائے گئے اقدامات کو ممکن بنانے کے لئے استعمال کرتی ہے بلکہ ترغیب و تحریص یا جرمانے کے لئے استعمال میں لاتی ہے، مثلاً ریاست سزا کے ''قانون'' کے ذریعے اپنے کسی حکم کو ناخوشگوار تو ظاہر کر سکتی ہے لیکن اسے عملاً نافذ کر دیتی ہے۔ مزید برآں، ان سب سے اہم معاملہ یہ ہے کہ رعایا کی طرف سے اس قانون پر جذباتی آمادگی کے بغیر سزا کا یہ ''قانون'' بے اختیار ہو جاتا ہے، جس طرح امریکہ میں 33-1920 کے عرصے کے دوران شراب نوشی کی ممانعت کے قانون کے حوالے سے حالات پیش آئے، یا جس طرح 1980 کی دہائی میں آئرلینڈ میں باقاعدہ ملازمت کے ساتھ جز وقتی ملازمت کرنے والے ملازمین کو عوام کی اکثریت کی حمایت حاصل ہو گئی۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ قانون پولیس کے اختیارات کی نسبت عوام کے جذبات اور رائے کے باعث ہی ایک موثر قوت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ عوام کی طرف سے ''قانون'' کی حمایت کا مخصوص معیار معاشرے کی ایک بہت ہی اہم خصوصیت ہے۔

اس کے ذریعے ہم روایتی اختیار و اقتدار اور نئے حاصل شدہ اقتدار و اختیار کے مابین خصوصی طور پر امتیاز کر سکتے ہیں۔ روایتی طاقت و اقتدار، انسانی عادت اور رویے کے باعث پیدا ہوتی ہے، اسے ہر دفعہ جائز ثابت کرنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی اور نہ ہی ہر دفعہ یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کوئی خاص مخالفت درکار نہیں ہوئی۔ مزید برآں اس قسم کے اقتدار و اختیار کا تعلق ناگزیر طور پر مذہبی یا نیم مذہبی اعتقادات کے ساتھ ہوتا ہے جن کے مطابق اقتدار (حکومت) کے خلاف جدوجہد اور مزاحمت و مخالفت انتہائی قبیح فعل ہے۔ لہٰذا اس کا انحصار کافی حد تک عوامی رویے اور موقف پر ہو سکتا ہے لیکن انقلابی یا غاصبانہ طریقے اس سے

لگا نہیں کھاتے۔ اس مرحلے پر کم و بیش دو متضاد اور مخالف نتائج سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ، چونکہ اس قسم کا اقتدار خود کو محفوظ محسوس کرتا ہے، اس لئے یہاں غداروں پر نظر نہیں رکھی جاتی اور نہ ہی چن چن کر ان کی نشاندہی کی جاتی ہے اور پھر اس طرح زیادہ سے زیادہ حد تک عملی لحاظ سے سیاسی استحصال سے گریز کیا جاتا ہے، دوسرا یہ کہ جہاں قدیم ادارے اور تنظیمیں موجود ہوتی ہیں، وہاں اربابِ اقتدار و اختیار، قدیم روایات اور رسوم کے تحت ہی عوام کے ساتھ ناانصافیاں روا رکھتے ہیں، عوامی اور مقبول حمایت کی توقع کے ذریعے قائم ہونے والی نئی طرزِ حکومت کی نسبت اس کی اپنی ہی ایک مخصوص شان اور وقار ہوسکتا ہے۔ خوف و دہشت کی بنیاد پر قائم ہونے والی فرانسیسی حکومت، ظلم و استبداد کی انقلابی قسم کی ایک نہایت واضح مثال ہے۔

روایات، رسومات یا اتفاق و اتحاد کی بنیاد پر قائم نہ ہونے والی حکومت (اقتدار) میرے نزدیک "جارحانہ اور استبدانہ" نوعیت کی حامل ہوتی ہے۔ اس کی خصوصیات اور روایتی قسم کے اقتدار کی خصوصیات میں بہت زیادہ تضاد اور فرق پایا جاتا ہے۔ مزید یہ کہ جہاں ایک روایتی قسم کی حکومت (اقتدار) قائم ہوتی ہے، اس کا کردار، تحفظ اور عدم تحفظ کے احساسات کے لحاظ سے لامحدود نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔

جارحیت اور استبداد کی بنیاد پر قائم ہونے والی حکومت (اقتدار) عام طور پر فوجی حکومت (اقتدار) ہوتی ہے اور یہ حکومت اکثر داخلی استبداد و ظلم و ستم یا بیرونی فتوحات کے ذریعے وجود میں آتی ہے۔ خاص طور پر موخر الذکر نوعیت کی صورت میں اس کی اہمیت بلاشبہ بہت زیادہ ہوتی ہے، بلکہ میرے نزدیک بہت ہی زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ جدید دور کے اکثر "تکنیکی مورخین" اس حقیقت کو قبول کرنے پر تیار ہوتے ہیں کہ سکندر اعظم اور جولیس سیزر نے اپنی جنگوں کی بدولت تاریخ عالم کا دھارا موڑ دیا۔ لیکن جہاں تک سکندر اعظم کا تعلق ہے، مذہبی صحیفے یونانی (زبان) میں نہیں لکھے جاتے رہے، اور اس طرح رومی سلطنت میں مسیحیت کا پرچار نہ ہو سکا۔ لیکن موخر الذکر کے معاملے میں، فرانسیسی ایک ایسی زبان نہ بول سکتے جو لاطینی سے اخذ کی گئی تھی، اور کیتھولک مسیحیت شاید ہی اس طرح قائم رہ سکتا۔ ہندوستانی نژاد امریکیوں پر سفید فام افراد کی فوجی برتری اور حکومت، تلوار سے قائم شدہ حکومت کی ایک ناقابل انکار مثال ہے۔ کسی اور ادارے یا تنظیم کی نسبت، تہذیب و ثقافت کے پھیلاؤ کا عمل اسلحے کی طاقت کے بغیر ممکن نہ تھا۔ بہر حال عام طور پر،

فوجی حکومت (اقتدار) کا انحصار، اختیار و اقتدار کی ایک دوسری شکل، مثلاً دولت یا فنی مہارت اور علم، اور یا پھر تعصب پر ہوتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہمیشہ اسی طرح ہوتا ہے، مثال کے طور پر سپین کی جانشینی کی جنگ میں مطلوبہ نتائج کے حصول کے لئے مارل بورو[2] (Marlborough) کی غیر معمولی ذہانت و فطانت لازمی طور پر درکار تھی۔ لیکن یہ مثال عمومی نظریے کے لحاظ سے ایک استثنائی حیثیت رکھتی ہے۔

جب روایتی قسم کے اقتدار و اختیار کا خاتمہ ہوتا ہے تو اس کی جگہ نہ صرف ایک جارحانہ اور استبدادی حکومت قائم ہو جاتی ہے بلکہ ایک ایسی انقلابی حکومت تشکیل پا جاتی ہے جو عوام میں سے اس حکومت کی حامی اکثریت یا ایک وسیع اقلیت پر اپنے احکامات نافذ کر سکتی ہے۔ مثال کے طور پر، امریکہ کی جنگ آزادی کے موقع پر ایسی ہی صورت حال معرضِ وجود میں آئی۔ واشنگٹن کے تحت قائم ہونے والی حکومت ایک جارحانہ اور استبدادی حکومت کی خصوصیات سے محروم تھی۔ اسی طرح اصلاحات کے دور میں کیتھولک چرچ کے بجائے ایک نیا چرچ قائم کیا گیا اور یہ کامیابی قوت و طاقت کے استعمال سے کہیں زیادہ عوام کی رضامندی کا نتیجہ تھی۔ اگر ایک انقلابی حکومت کم از کم جارحیت اور استبداد کے ذریعے خود کو قائم کرنا چاہتی ہے، تو اسے روایتی قسم کی حکومت (اقتدار) کی نسبت عوام کی طرف سے زیادہ سے زیادہ اور شدید حمایت درکار ہوتی ہے۔ 1911 میں جب عوامی جمہوریہ چین کا اعلان کیا گیا تو غیر ملکی تعلیم یافتہ افراد (سیاستدانوں) نے فوراً ہی ایک پارلیمانی آئین نافذ کرنے کا اعلان کر دیا، لیکن عوام نے اسے تسلیم نہ کیا۔ لیکن یہ حکومت جنگجو فوجی منتظم ٹوشان (Tuchuns) کے زیر نگرانی ایک جارحانہ اور متشدد حکومت کی صورت اختیار کر گئی۔ پھر عوام کی طرف سے اس قسم کی حمایت بعد میں کیومن تنگ (Kuo-Min-Tang) کو حاصل ہو گئی جس نے پارلیمانی نظام کے بجائے قوم پرستی کو اپنی حکومت کی بنیاد ٹھہرایا۔ لاطینی امریکہ میں بھی نہایت تیزی کے ساتھ اسی قسم کے واقعات و حالات رونما ہوئے ہیں۔ اقتدار و اختیار کے حصول کے ان تمام معاملات میں اگر پارلیمان کو اپنی حکومت قائم اور کامیاب کرنے کے لئے مناسب عوامی مقبول جماعت حاصل ہو جاتی تو پھر یہ حکومت انقلابی نوعیت کی ہوتی، لیکن، اگر عوامی مقبولیت کے بغیر کامیاب ہونے والی خالص فوجی حکومت جارحانہ اور استبدادی نوعیت کی حامل تھی؟

ایک روایتی انقلابی اور ایک جارحانہ واستبدادی حکومت (اقتدار) کے درمیان فرق اور امتیاز ،نفسیاتی نوعیت کا حامل ہے۔میرے نزدیک محض قدیم روایات اور رسوم کی بنیاد پر اقتدار و اختیار کو روایتی قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ اسے لازمی طور پر اس عزت و احترام کا بھی مظاہرہ کرنا چاہیئے جو اسے جزوی طور پر قدیم روایات اور رسوم کے باعث حاصل ہوتی ہے۔ جب یہ حکومت ملک میں انحطاط پذیری کا وطیرہ اختیار کر لیتی ہے،عوام کے معاملات سے لاتعلق ہو جاتی ہے تو یہ حکومت (اقتدار) بھی آہستہ آہستہ استبدادی اور جارحانہ طرز حکومت کی شکل اختیار کرنا شروع کر دیتی ہے۔اس قسم کے حالات روس میں اس وقت رونما ہوتے نظر آئے جب انقلابی تحریک آہستہ آہستہ کامیابی کی طرف بڑھنے لگی اور آخرکار 1917 میں اس انقلابی تحریک کو فتح نصیب ہوئی۔

میرے نزدیک اقتدار و اختیار کی وہ قسم انقلابی نوعیت کی کہلا سکتی ہے جب اس کے قیام و استحکام کے لئے ایک یکسر قسم کے عقیدے،منصوبے،یا جذبات مثلاً پروٹسٹنٹ،کمیونسٹ کے حامل بے شمار افراد باہم اکٹھے اور متحد ہو جاتے ہیں،اور یا پھر یہ بے شمار افراد قومی آزادی کے مقصد اور خواہش کی خاطر باہم مل جل کر کام کرتے ہیں۔ مزید برآں، میں اس حکومت (اقتدار) کو جارحانہ اور استبدادی قرار دیتا ہوں جب اس کی بنیاد محض اقتدار کی ہوس ہوتی ہے اور عوام اس حکومت کی اطاعت اپنی رضامندی سے نہیں بلکہ خوف و دہشت کے باعث کرتے ہیں۔ دریں اثناء اس امر کی بھی مناسب وضاحت ہو جائے گی کہ اقتدار (حکومت) کا جارحانہ اور استبدادی رویہ مختلف حالات کے مطابق مختلف نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ ایک جمہوری ملک میں، سیاسی جماعتوں کی مخالفت کے لحاظ سے حکومت کی طاقت و قوت کو جارحانہ اور استبدادی تصور نہیں کیا جا سکتا،لیکن حکومت کا رویہ اور طرز عمل اس وقت جارحانہ اور ظالمانہ کہا جا سکتا ہے جب ایک راسخ العقیدہ اور کٹر انقلابی کی مخالفت کی جاتی ہے۔ اسی طرح، جب کسی حکومت میں ظلم و ستم کا سلسلہ جاری ہوتا ہے،تو پھر بدعقیدہ افراد کے حوالے سے مذہب کی طرف سے کارروائی کو جارحیت اور استبداد پر محمول کیا جا سکتا ہے،لیکن روایت پسند گنہگاروں کے ضمن میں مذہب کے اس رویے اور طرز عمل کو جارحانہ اور متشدد نہیں کہا جا سکتا۔

مزید برآں، اقتدار و اختیار میں تنظیمی اقتدار (ادارے یا تنظیم کا اقتدار اور حکومت) اور انفرادی اقتدار (انفرادی افراد کا اقتدار اور حکومت) کی حیثیت سے بھی امتیاز اور فرق قائم کیا جا

سکتا ہے۔ یہ دونوں، ادارہ یا تنظیم اور انفرادی افراد ایک دوسرے سے یکسر مختلف انداز میں اقتدار حاصل کرتے ہیں اور بلا شبہ یہ دونوں باہمی طور پر ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ مثلاً اگر آپ وزیر اعظم بننا چاہتے ہیں تو آپ کو لازمی طور پر اپنی سیاسی جماعت کی سربراہی حاصل کرنا ہوگی۔ لیکن اگر آپ موروثی حکومت کے اختتام سے پہلے موجود تھے تو پھر آپ کو اپنی قوم کا سربراہ بننے کے لئے ایک بادشاہ کا وارث اور جانشین بننا ہوگا، لیکن اس طریقے کے ذریعے آپ دوسری اقوام کو فتح کرنے یا ان کا سربراہ بننے کی صلاحیتوں سے محروم رہے تھے کیونکہ عام طور پر بادشاہوں اور شہنشاہوں کے بیٹوں میں اس قسم کی صلاحیتیں اور استعدادیں موجود نہیں ہوتیں۔ موجودہ عہد میں یہ صورت حال معاشی میدان میں بدرجہ اتم موجود ہے جہاں موروثی طور پر مطلق العنانی (طبقہ امراء کی حکومت) قائم ہے۔ ان دوسو مطلق العنان (طبقہ امراء) خاندانوں کے متعلق غور کیجئے جن کے خلاف فرانس میں فرانسیسی سوشلسٹوں نے احتجاج برپا کیا۔ لیکن مطلق العنان طبقہ امراء کے درمیان حکومتی اقتدار کی موجودگی اس تسلسل کے ساتھ موجود نہیں رہی جس طرح اول الذکر کو تختِ شاہی پر تسلط حاصل تھا کیونکہ وہ عوام الناس کی طرف سے اپنے لئے ''الٰہی استحقاق'' کی سند حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ کوئی بھی شخص اس امر کو برا نہیں سمجھتا کہ ایک بارسوخ شخص کسی باپ کے بیٹے کو اختیارات سے محروم کرنے کے لئے رقوم جمع کرے بشرطیکہ یہ طریقہ قواعد وضوابط کے مطابق اختیار کیا جائے اور باغیانہ تحریصات سے اجتناب کیا جائے۔

مختلف قسم کے ادارے، مختلف قسم کے افراد کو اعلیٰ سطحی مرتبے تک لے کر جاتے ہیں، اور اسی طرح معاشرے کے مختلف طبقے بھی یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ تاریخ میں ایک زمانہ ایسا آتا ہے جب اس عہد کے ممتاز افراد کے باعث اس زمانے کو یاد رکھا جاتا ہے اور انہی ممتاز اور مشہور افراد کے کردار، خوبیوں اور خصوصیات کے باعث اس عہد کے کردار، خوبی اور خصوصیت کا تعین ہوتا ہے۔ جب اس امتیاز کے حصول کے لئے درکار کردار، خوبی اور خصوصیت میں تبدیلی واقع ہوتی ہے، اس لئے افراد کی ممتاز حیثیت میں بھی تبدیلی رُونما ہو جاتی ہے۔ اس موقع پر فرض یہ کر لیا جاتا ہے کہ بیسویں صدی میں اس طرح کے افراد لینن کی طرح ہیں اور موجودہ زمانے میں اس قسم کے افراد رچرڈ کو یئرڈی لاٹن کے مانند ہیں لیکن تاریخ عالم نے انہیں فراموش کر دیا ہے۔ آیئے اب ایک لمحے کے لئے مختلف قسم کے افراد کے متعلق غور کریں جو اقتدار کی مختلف اقسام کے باعث

منظرِ عام پر آئے۔

موروثی اقتدار کے باعث ہماری اصطلاح ''شریف آدمی'' کو عروج حاصل ہوا ہے۔ یہ اصطلاح، ایک ایسے تصور کی کم تر شکل ہے جس کی تاریخ بہت طویل ہے، یعنی سرداروں کی جادوئی اور طلسماتی خصوصیات، پھر شہنشاہوں کی الوہی حیثیت، اور پھر قرونِ وسطیٰ کے امراء اور اعلیٰ نسل طبقہ امراء کے افراد۔ جہاں قوت و اختیار موروثی طور پر موجود ہو تو ان خصوصیات کو بہت پسند کیا جاتا ہے، مثلاً عیش و عشرت اور کسی کی مداخلت کے بغیر مکمل بالادستی اور برتری۔ جب شہنشاہیت کی بجائے طبقہ امراء کی حکومت (اقتدار) قائم ہو جائے تو پھر حکومتی نظام کے انتظام و انصرام کا بہترین طریقہ یہ ہے عوام الناس کے ساتھ معاملات طے کرتے وقت حاکمانہ رویے کے ساتھ ساتھ معتدل اور مہذب و شائستہ رویہ اپنایا جائے۔ لیکن حکومت کا انتظام و انصرام کرنے کے موجودہ تصور کے قطع نظر، خواہ حکومت موروثی ہو، حکومت (اقتدار) پر قابض افراد اپنے حکومت کا انتظام و انصرام کرنے کے طور طریقوں ہی کے ذریعے پہچانے جاتے ہیں۔ جب متوسط طبقے (بورژوا) کا کوئی فرد، مرد و خواتین کے اس معاشرے میں مداخلت کرتا ہے جو عمرانی اور سماجی پیچیدہ معاملات کا ادراک رکھتا ہے اور ان کا جائزہ لیتا ہے تو اس بورژوا قسم کے فرد پر ہنسنے اور اس کی تضحیک کرنے کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے۔ اس ''مردِ شریف'' کی تعریف و توصیف کا انحصار صرف اس کی موروثی دولت پر ہی رہ جاتا ہے، اور یہ دولت ہر حال اور ہر قیمت پر نہایت تیزی کے ساتھ ختم ہو جانی چاہئے جب یہ معاشی اور سیاسی اقتدار (حکومت) باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی ہے۔

مزید برآں، جب اقتدار علم یا فہم و فراست (حقیقی یا مصنوعی) کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے تو اس وقت ایک نہایت ہی مختلف قسم کا کردار (طور طریقے) سامنے آتا ہے۔ اس قسم کے اقتدار کی دو اہم ترین مثالیں ''روایتی چین'' اور ''کیتھولک چرچ (مذہب)'' کی ہیں۔ جدید دور میں اب اس قسم کے اقتدار (حکومت) کا تصور بہت ہی کم ہے، صرف انگلستان میں چرچ (مذہب) کی حکومت اور اقتدار پر بالادستی کے باعث اقتدار کی یہ قسم خال خال موجود ہے۔ یہ نہایت ہی عجیب و غریب اور انوکھا نظریہ درست معلوم ہوتا ہے کہ علم و دانش کے ذریعے حاصل کئے جانے والا اقتدار (حکومت) وحشی اور غیر مہذب معاشروں میں زیادہ پایا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ مگر مسلسل اور بتدریج وہاں تہذیب کی نشو و نما رک جاتی ہے۔ جب میں ''علم'' کی بات کرتا ہوں،

تو بلاشبہ میرے نزدیک علم کے معروف طریقے یعنی جادوگر، ساحر اور مختلف ٹوٹکوں اور جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے والے افراد شامل ہیں۔ لاہاسہ یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے بیس سال پڑھنا پڑتا ہے اور اس ڈگری کے ذریعے دلائی لامہ کے علاوہ ہر قسم کا اعلیٰ عہدہ اور منصب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ صورت حال انگلستان میں سال 1000ء میں بدرجہ اتم قائم تھی جب پوپ سلویسٹر دوم، ایک جادوگر اور ساحر کے طور پر مشہور تھا کیونکہ اس نے مختلف کتب کا مطالعہ کیا تھا اور پھر وہ اس طرح مابعد الطبیعاتی اور مافوق الفطرت صلاحیتوں کے باعث چرچ (مذہب) کی قوت وطاقت بڑھانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

جیسا کہ ہم ایک ''دانشور اور عالم فاضل'' سے واقف ہیں، مذہبی پیشوائیت کی ایک روحانی شکل اور سلسلہ ہے۔ لیکن تعلیم اور علم کے فروغ نے اس سے اقتدار اور حکومت چھین لی ہے۔ ایک دانشور اور عالم فاضل فرد کی طاقت واقتدار کا انحصار، ایک مقدس ومتبرک کتاب کی روایتی معنوں اور سحر کاری کے لئے مافوق الفطرت نوعیت اور عزت واحترام پر ہے۔ اس قسم کی حکومت (اقتدار) کے کچھ آثار ان ممالک میں پائے جاتے ہیں جہاں انگریزی (زبان) بولی جاتی ہے جس کا اظہار برطانیہ میں رسم تاج پوشی اور امریکہ میں آئین کے احترام کے ذریعے ہوتا ہے، اسی طرح، کنٹربری کے بشپ اعظم اور سپریم کورٹ کے ججوں کے پاس ابھی بھی ''عالم وفاضل افراد'' کی کچھ روایتی طاقت وقوت موجود ہے۔ لیکن قوت واقتدار کا یہ نمونہ مصری راہبوں یا چینی فلسفہ کنفیوشس کے علماء کا ایک جعلی عکس ہے۔

اب جبکہ ایک ''مرد شریف'' کی خاص اور روایتی خوبی اور خصوصیت، اپنی ذات کے لئے ''عزت وانا'' ہے جو عقل ودانش اور فہم وفراست کے ذریعے اقتدار (حکومت) حاصل کرتا ہے۔ ایک عقلمند اور دانشور شخص کی حیثیت سے مقبولیت اور شہرت حاصل کرنے کے لئے ایک شخص کے پاس اعلیٰ تعلیم اور معلومات کا خزانہ ہونا چاہئے، اپنے جذبات پر قابو ہونا چاہئے اور مردانہ انداز واطوار اور انتظام وانصرام کے ضمن میں خاصا طویل تجربہ ہونا چاہئے۔ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ ''عمر'' بھی کچھ حد تک اہمیت رکھتی ہے کیونکہ ایک ''مذہبی بزرگ''، ''وزیر ومشیر''، ''بزرگ شہری'' عزت واحترام کی علامات واصطلاحات ہیں۔ ایک چینی بھکاری، بھیک طلب کرتے وقت، راہ گیر کو ''جناب عالی'' کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ لیکن جب دانشمند اور عقلمند افراد کی

طاقت وقوت منظم ہو جاتی ہے تو پھر وہاں عالم فاضل یا تعلیم یافتہ افراد کی ایک تنظیم بن جاتی ہے جن کے درمیان علم وحکومت اور فہم ودانش مرتکز ہو جاتی ہے۔ یہ عقلمند، دانا اور جہاں دیدہ افراد، طبقہ امراء کے جنگجو افراد سے یکسر مختلف رویہ اور طرز عمل اختیار کرتے ہیں جہاں یہ افراد، ایک بہت ہی مختلف اور انوکھے معاشرے پر حکومت کرتے ہیں۔ چین اور جاپان کی مثالیں اس فرق کو بہت اچھی طرح واضح کر دیتی ہیں۔

ہم پہلے ہی یہ عجیب وغریب حقیقت محسوس کر چکے ہیں کہ اگر چہ گزشتہ ادوار کی نسبت، حالیہ دور میں تعلیم، تہذیب کی نشو ونما میں ایک بڑا اور اہم کردار ادا کرتی ہے، لیکن جو لوگ نئے نئے علوم حاصل کرتے ہیں، انہیں اقتدار حاصل کرنے کا موقع حاصل نہیں ہوتا۔ اگر چہ بجلی اور ٹیلیفون کے کاریگر ہمارے آرام وآسائش (یا زحمت وتکلیف) کے لئے ہمارے لئے انوکھے کام سرانجام دیتے ہیں لیکن ہم انہیں ''مسیحا یا معالج'' کا درجہ نہیں دیتے، یا ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ اگر وہ ہم سے ناراض ہو گئے تو غیض وغضب کا مظاہرہ کریں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنسی علم اگر چہ مشکل اور دقیق ہے، لیکن اس میں پراسراریت کا عنصر موجود نہیں ہے اور تمام لوگ تھوڑی سی محنت کے ذریعے یہ علم حاصل کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید زمانے کے علماء اور دانشور کسی قسم کے انقلاب کو دعوت نہیں دے سکتے، اور چند مخصوص عہدوں مثلاً کنٹربری کا بشپ اعظم کے علاوہ محض ملازم ہی رہتے ہیں۔

سچائی اور حقیقت یہ ہے کہ عالم فاضل افراد کو ان کے اصلی علم کے باعث عزت واحترام کا مستحق نہیں ٹھہرایا جاتا، لیکن صرف ان کے پاس انوکھی، عجیب اور جادوئی طاقتوں کے باعث انہیں عزت وتکریم مہیا کی جاتی ہے۔ جب سے سائنس کے باعث افراد کو قدرتی مراحل کے متعلق آگاہی ہوئی ہے، لوگوں کا جادو اور طلسم پر سے اعتقاد اٹھ گیا ہے اور اسی طرح عالم اور فاضل افراد کی عزت وتکریم بھی نہیں کی جاتی۔ بہر حال، یہ تو سامنے کی بات ہے کہ اس دور کے سائنسدان، مستقبل میں تبدیلیوں کے بنیادی طور پر ذمہ دار ہیں جن کے باعث ہمارے حالیہ اور گزشتہ ادوار میں فرق نظر آتا ہے اور ان کی ناقابل یقین اور ناقابل پیمائش ایجادات اور دریافتوں نے حالات وواقعات پر گہرا اثر مرتب کیا ہے، لیکن پھر عالم فاضل اور دانشمند افراد کی حیثیت سے انہیں وہ عزت واحترام اور توقیر میسر نہیں، جو توقیر اور عزت ہندوستان کے ایک بے لباس اور برہنہ

صوفی اور سادھو یا مغربی بحرالکاہل کے مجمع الجزائر (ملائیشیا کا اکثریتی قبیلہ) کے جڑی بوٹیوں کے ذریعے علاج کرنے والے ایک معالج کو حاصل ہے۔ یہ دانشور اور عالم فاضل، جب اپنی کارکردگی اور سرگرمیوں کے باعث اپنی شہرت اور مقبولیت سے محروم ہونا شروع ہو جاتے ہیں، اس جدید دنیا سے اپنی بیزاریت اور بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ دانشور اور عالم فاضل کم از کم حد تک بے اطمینانی اور بیزاری محسوس کرتے ہیں، اشتراک کی پناہ میں آ جاتے ہیں اور جو عالم فاضل اور دانشور اس بے اطمینانی اور بیزاری کے گہرے احساس میں مبتلا ہوتے ہیں، وہ اپنے ''ہاتھی دانت سے بنے ہوئے گنبدوں'' اور ''شیشے کے گھروں'' میں بند ہو جاتے ہیں۔

بڑے بڑے معاشی اور تجارتی اداروں کے قیام کے باعث ''بااختیار اور طاقتور افراد'' کی ایک نئی قسم دریافت ہوئی ہے، انہیں امریکہ میں ایگزیکٹیو (Executive) (تجارتی ادارے کا افسر اعلیٰ) کہا جاتا ہے۔ یہ مثالی ''افسر اعلیٰ'' مستعد فیصلہ سازی، معاملات میں بصیرت اور ادراک کا اظہار اور پختہ عزم و ارادہ جیسی صلاحیتوں اور خصوصیات کے باعث دوسرے لوگوں کو متاثر کر دیتا ہے۔ مزید برآں، یہ ''افسر اعلیٰ'' زبردست استدلالی رویہ اختیار کرتا ہے، کم بولتا ہے، دوسروں کی باتیں نہایت غور سے سنتا ہے اور پھر مختصر اور جامع الفاظ میں اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے۔ وہ اپنے ماتحت عملے کے ساتھ برابری کا سلوک کرتا ہے، ان پر اعتماد اور بھروسا کرتا ہے، اور ماتحت عملہ اپنی ذاتی انا کو پس پشت ڈال کر ہر حال اور ہر قیمت پر اپنے ''افسر اعلیٰ'' کے احکامات کی دل و جان سے پابندی کرتا ہے۔ وہ اپنے ماتحت عملے کی بہترین صلاحیتوں کو مشترکہ طور پر استعمال کرتا ہے، ماتحت عملے سے کام لیتے اور دفتری امور سرانجام دیتے وقت کوتاہی یا غیر ذمہ داری کا نہ خود مظاہرہ کرتا ہے اور نہ ہی اپنے ماتحت عملے کو کوتاہی، غیر ذمے داری، تساہل پسندی یا نااہلی کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن کاروباری امور کے متعلق گاہکوں یا اپنے رفقاء سے بات چیت کرتے وقت نہایت ماہرانہ اور مہذب انداز اختیار کرتا ہے۔ انہی خصوصیات اور خوبیوں کی بدولت مختلف قسم کے افراد تجارتی اداروں کا انتظام سنبھال لیتے ہیں۔

طرز حکومت کی حیثیت سے جمہوریت کے تحت، سیاسی قوت، ایسے افراد کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو مندرجہ بالا بیان کردہ افراد کی تین اقسام سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ جمہوریت کے تحت اگر کوئی سیاستدان کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہے تو پہلے تو اسے عوام کا اعتماد حاصل کرنا چاہئے اور پھر

رائے دہندگان کی اکثریت میں اپنی حمایت کے لئے جذبہ وجوش پیدا کرنا چاہئے۔ طاقت واقتدار کے حصول کے ضمن میں درکار یہ دونوں خصوصیات، کسی نہ کسی طرح یکساں نوعیت کی حامل ہیں اور اکثر افراد ان میں سے صرف ایک خوبی اور صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں۔ امریکہ میں صدارتی امیدوار اگرچہ اپنی جماعت کے کرتا دھرتا افراد کے سامنے اپنی خوبیوں اور صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کے ہنر میں ماہر ہوتے ہیں لیکن پھر بھی خال خال ان میں سے ایسے افراد نہیں ہوتے جو عوامی جذبات وتصورات میں ہلچل نہ پیدا کرسکیں۔ عمومی اصول کے تحت، ایسے افراد کی شکست اظہر من الشمس ہوتی ہے لیکن جماعت کے کرتا دھرتا افراد اس شکست کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ بہرحال کبھی کبھی عوام کی اکثریت ان افراد کی ''کشش'' کی عدم موجودگی میں بھی انہیں کامیابی سے سرفراز کردیتی ہے، ان حالات میں انتخابات کے بعد، اسے عوام کی رائے اور موقف کا احترام کرنا پڑتا ہے اور وہ کبھی بھی حقیقی اقتدار سے لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔ اس کے برعکس ایک شخص اپنے طور پر عوام کی حمایت حاصل کرلیتا ہے، اس ضمن میں نپولین سوئم، مسولینی اور ہٹلر بہترین مثالوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حالانکہ ایک سیاستدان اپنی کامیابی اور اقتدار واختیار کے حصول کے لئے عوامی حمایت کی سیڑھی استعمال کرتا ہے لیکن آخرکار وہ اپنی فراست، حکمت عملی کے ذریعے اسی عوام کو اپنے تابع کرلیتا ہے۔

جمہوری نظام کے تحت جن خوبیوں اور صلاحیتوں کے باعث ایک سیاستدان کامیابی حاصل کرتا ہے، وہ وقت اور حالات کے لحاظ سے مختلف نوعیت کی حامل ہوتی ہیں۔ امن اور جنگ کے زمانے کے تقاضوں کے تحت یہ خوبیاں اور صلاحیتیں مختلف انداز میں سامنے آتی ہیں۔ انقلابی اور غیر معمولی حالات میں بھی یہ خوبیاں اور صلاحیتیں علیحدہ اور الگ حیثیت رکھتی ہیں۔ زمانہء امن میں اس شخص سے پختہ عزم وارادے اور مضبوط قوت فیصلہ کی توقع کی جاتی ہے لیکن پریشان کن حالات میں اس سے کہیں زیادہ معاملہ فہمی اور دانشمندی درکار ہوتی ہے۔ ان حالات میں اس شخص کو خطیبانہ صلاحیتوں کا مالک تو نہ ہی مگر ایک متاثر کن مقرر تو ضرور ہونا چاہئے۔ اگرچہ رابسپیر ی (Rabespierre) اور لینن (Lenin) فصاحت وبلاغت کے ساتھ تقریر تو نہیں کرسکتے تھے مگر وہ اپنے ارادے کے پکے، جوش وجذبے سے بھرپور اور جرأت مند ودلیر تھے۔ یہ جذبہ وجوش سرد اور محدود ہوسکتا ہے لیکن ضروری امر یہ ہے کہ یہ جذبہ وجوش لازمی طور پر محسوس ہو۔ پریشان کن اور

بحرانی حالات میں ایک سیاستدان کو نہ تو استدلالی قوت چاہیئے اور نہ ہی غیر متعلقہ مسائل وحقائق کی طرف توجہ مرکوز کرنی چاہیئے اور نہ ہی عقلمندی جھاڑنی چاہیئے۔اس وقت ضرورت صرف اس امر کی ہوتی ہے کہ مختلف طریقوں کے ذریعے مطلوبہ مقاصد کیسے حاصل کیئے جائیں اور اس ضمن میں اس کا پختہ اور مضبوط عزم وارادہ ہی مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔

سب سے زیادہ کامیاب جمہوری سیاست دان وہ ہوتے ہیں جو جمہوریت کو پس پشت ڈال کر آمر بن جانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔اگرچہ بعض حالات میں صرف یہی امکان باقی رہ جاتا ہے لیکن انیسویں صدی کے دوران انگلستان میں کوئی شخص یہ مقصد حاصل نہیں کر سکا۔لیکن جب صورت حال اس قسم کے اقدام کے موافق ہو تو پھر ایک شخص میں کمال درجے کی اپنی خوبیوں اور صلاحیتوں کی ضرورت ہے، جو عام حالات میں، یا پریشان کن اور بحرانی حالات میں جمہوریت کے لئے درکار ہوتی ہیں۔لینن، مسولینی اور ہٹلر نے جمہوریت ہی کی بدولت عروج حاصل کیا۔

جب ایک دفعہ آمریت اپنے پنجے گاڑھ لیتی ہے، تو وہ خصوصیات اور خوبیاں جن کے باعث ایک شخص مر جانے والے آمر کا جانشین بنتا ہے، ان خصوصیات اور خوبیوں سے یکسر مختلف ہوتی ہیں جن کے باعث ابتدا میں آمریت قائم ہوئی تھی۔جب موروثی جانشینیت مفقود ہو جاتی ہے تو پھر پسِ پردہ رہ کر خفیہ سازشیں اور حکومت کی جائز و ناجائز حمایت اور گٹھ جوڑ وغیرہ ہی بہت ہی اہم تراکیب اور طریقوں کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ایک جانشین آمر میں یقینی طور پر اپنے بانی آمر کے مرنے کے بعد بہت زیادہ تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں۔اور چونکہ ایک بانی آمر کے جانشین بننے کے لئے درکار خصوصیات وخوبیاں، ان خوبیوں اور خصوصیات سے کہیں کم اہم اور موثر ہوتی ہیں جن کے باعث ابتدائی آمریت وجود میں آئی، تو پھر ملک میں عدم استحکام، محلاتی انقلاب وسازش، اور یا پھر کسی دوسرے نظام کے قیام کا بہت زیادہ امکان نظر آتا ہے۔بہر حال اس امر کا بھی امکان ہے کہ منظم تشہیری مہم کے جدید طریقوں کے باعث اس رجحان اور میلان کا کامیابی سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔اس ضمن میں سربراہ مملکت کی خاص خوبیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے منظم تشہیری مہم کے ذریعے سربراہ مملکت کے لئے مقبولیت اور شہرت تخلیق کی جاسکتی ہے۔یہ طریقے اور تراکیب کس حد تک کامیاب ہیں، اس کے متعلق ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔

مزید برآں، انفرادی افراد کے حوالے سے حکومت واقتدار کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس کے متعلق ہم نے ابھی غور نہیں کیا اور نہ ہی اسے اپنے زیر بحث لائے ہیں یعنی پس پردہ اقتدار، درباریوں کی حکومت واقتدار، خفیہ سازشیں، گٹھ جوڑ اور پوشیدہ رہ کر اقتدار کی ڈوریاں ہلانے والوں کی حکومت۔ ہر اس بڑے ادارے میں جہاں بہت زیادہ اقتدار و اختیار کے حامل افراد ادارے پر قابض ہوتے ہیں، وہاں ان کے علاوہ وہ افراد (مرد وخواتین) بھی ہوتے ہیں جو مختلف ذاتی اور نجی طریقوں کے ذریعے اپنے قائدین پر اثر ورسوخ حاصل کر لیتے ہیں، لیکن وہ منظر عام پر نظر نہیں آتے۔ اگرچہ پس پردہ رہ کر ڈوریاں ہلانے والے اور جماعتی کرتا دھرتا افراد ایک ہی قسم سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کا طریقہء واردات مختلف ہوتا ہے۔ وہ نہایت خاموشی سے اپنے دوستوں کو اہم عہدوں پر فائز کروا لیتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ ادارے پر قابض ہو جاتے ہیں۔ وہ آمریت جو موروثی نہیں ہوتی، اس میں یہ لوگ آمر کی وفات کے بعد جانشینی کی امید لگائے رکھتے ہیں، لیکن عمومی حالات میں وہ منظر عام پر آنے سے گریز کرتے ہیں۔ یہ وہ افراد ہیں جو عظمت یا شان وشوکت کے بجائے اقتدار کے خواہشمند ہوتے ہیں اور وہ عام طور پر معاشرتی لحاظ سے بزدل ہوتے ہیں۔ بعض اوقات، قدیم اور روایتی بادشاہتوں میں خواجہ سراؤں کے مانند، یا بادشاہوں کی رانیوں کی طرح، یا پھر کسی اور وجہ کے باعث، انہیں نام نہاد اقتدار سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ ان کا اثر ورسوخ اس وقت بہت زیادہ ہو جاتا ہے جب برائے نام حکومت موروثی ہوتی ہے، اور ان کا اثر ورسوخ اس وقت بہت ہی کم ہوتا ہے جب یہ اثر ورسوخ انہیں ان کی ذاتی مہارت اور توانائی کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔ بہر حال، جدید ترین طرز ہائے حکومت میں بھی اس قسم کے افراد، یقینی اور ہر قیمت پر ان شعبہ جات میں بھی قابلِ قدر تسلط حاصل کر لیتے ہیں جنہیں معمولی فہم وفراست کے مالک افراد عجیب وغریب اور مشکل گردانتے ہیں۔ ہمارے دور کے لحاظ سے، ان اہم شعبہ جات میں کرنسی (زرتبادلہ) اور خارجہ حکمت عملی شامل ہیں۔ قیصر ولیم دوئم، بیرن ہولسٹن (جرمن دفتر خارجہ کا مستقل سربراہ) کو بے شمار قوت وطاقت حاصل تھی حالانکہ وہ عوامی طور پر ایک گمنام شخص تھا۔ حالیہ دور میں برطانوی دفتر خارجہ کے مستقل افسروں کے پاس کس قدر اختیار وقوت ہے، اس کا ادراک ہمارے لئے ناممکن ہے۔ ممکن ہے کہ ہمارے بچے ان اہم اور ضروری دستاویزات کو دیکھ سکیں۔ پس پردہ رہ کر حکومت کی ڈوریاں ہلانے والے افراد میں موجود خصوصیات وخوبیاں، ان

خصوصیات وخوبیوں سے یکسر مختلف ہیں جو اقتدار و اختیار کی دیگر اقسام کے لئے درکار ہیں، اور ایک عمومی اصول کے مطابق، ان خصوصیات وخوبیوں کو ہمیشہ ہی ناپسندیدہ نہیں سمجھا جاتا۔ ایک ایسا نظام حکومت جس کے تحت خفیہ سازشیں کرنے والے افراد اور درباری خوشامدی بہت زیادہ قوت وطاقت حاصل کر لیتے ہیں، عمومی طور پر عوامی فلاح و بہبود کا ضامن نہیں ہوتا۔

حوالہ جات

1- ہنڈن برگ (Hinden burg) مکمل نام پال لڈ وگ ہنڈن برگ (1847-1934) جرمن فیلڈ مارشل۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران وہ سپریم کمانڈر تھا۔ پھر وہ جرمنی کا صدر مقرر ہوا (1925-33)۔

2- جان چرچل مارل بورو (John Churchil Marlborough)۔ انگریزی سپاہی مارل بورو کا پہلا ڈیوک (1650-1722)۔ 1702 میں ملکہ این (Anne) نے پہلا ڈیوک مقرر کیا۔ سپین کی جانشینی کی جنگ میں (1704) اس نے ویانا کے باہر فرانسیسی فوج کو شکست دی۔

چوتھا باب

پادرانہ اقتدار

اس باب اور اگلے باب میں، میں روایتی اقتدار کی ان دو اقسام کو زیرِ غور لانا چاہتا ہوں جو ماضی میں انتہائی اہمیت کی حامل تھیں، یعنی پادرانہ اور شاہانہ اقتدار۔ اقتدار کی یہ دونوں اقسام، عہدِ حاضر میں کچھ حد تک معدوم ہو چکی ہیں، اور اگر اس موقع پر، یہ ہماری ناعاقبت اندیشی ہوگی کہ اگر ہم یہ سوچیں کہ ان میں سے کسی کا بھی احیاء نہیں ہوگا، مستقل طور پر یا عارضی لحاظ سے ان کا زوال، ہم سے متقاضی ہے کہ ہم ان دونوں نظامہات کا مکمل طور پر جائزہ لیں اور ان کا مطالعہ کریں، اور اقتدار کی استبدادی اور استحصالی اقسام کی ابھی تک موجودگی کا جہاں تک تعلق ہے، ہمارا یہ مقصد قابلِ حصول نہیں ہے۔

خواہ اپنی ابتدائی اور قدیم صورت ہی میں، پادری اور بادشاہ، ابھی تک اکثر قدیم معاشروں میں وجود پذیر ہیں جن کے متعلق ماہرینِ علم بشریات کو مکمل معلومات حاصل ہیں۔ بعض اوقات، ان میں سے کوئی ایک شخص، دونوں اشخاص کی خصوصیات سے مزین ہوتا ہے۔ یہ صورت حال، نہ صرف غیر مہذب اور وحشی معاشروں میں موجود ہوتی ہے بلکہ انتہائی مہذب اور شائستہ ریاستوں میں بھی اس قسم کی صورت حال بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر، روم میں آگسٹس، ایک دیوتا کی حیثیت رکھتا تھا۔ دینِ محمدی (اسلام) کا سربراہ، یعنی خلیفہ، ریاست کا بھی حاکم ہوتا تھا۔ حالیہ دور میں میکادو (Mikado) کی حالت، شنٹو مذہب (Shinto Religion) کے عین مطابق ہے۔ یہ بادشاہ، ہمیشہ سے ہی اپنی مقدس و متبرک حیثیت کے باعث اپنے دینی امتیاز سے محروم ہو گئے تھے، اور اس طرح انہیں پادرانہ مرتبہ بھی حاصل ہو گیا تھا۔ بہر حال تاریخ عالم کے اکثر اوقات اور ممالک میں پادری اور بادشاہ کے درمیان امتیاز نہایت ہی واضح اور قطعی طور پر

موجود رہا ہے۔

پادری یا مذہبی پیشوا کی قدیم شکل ایک ایسے معالج کی سی ہے جو جڑی بوٹیوں اور اپنی مافوق الفطرت قوتوں کے ذریعے لوگوں کا علاج کرتا ہے، اور ماہرین علم بشریات، اس کی قوت وطاقت میں امتیاز کے لئے دو عناصر، مذہب اور جادو (طلسم) کو مدنظر رکھتے ہیں۔ اس کی مذہبی قوتوں کا انحصار مافوق الفطرت چیزوں کی معاونت پر ہوتا ہے جبکہ اس کی طلسمی اور جادوئی قوت وطاقت فطری نوعیت کی حامل ہوتی ہے۔ بہرحال، اگر ایک مخصوص مقصد پیش نظر رکھا جائے تو یہ امتیاز قطعی کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اصل اہم امر یہ ہے کہ یہ معالج، خواہ مذہبی یا جادوئی نوعیت کا حامل ہو، اس کے متعلق یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس میں اس قدر قوت وطاقت موجود ہوتی ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص کو فائدہ یا نقصان پہنچا سکتا ہے، اور اس قوت وطاقت کا حصول ہر کسی کے بس میں نہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک شخص بھی تھوڑا بہت جادو (طلسم) جانتا ہے لیکن اس معالج (ساحر) کا جادو (طلسم) کہیں زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی مرض میں گرفتار ہوتا ہے یا اسے کوئی حادثہ پیش آتا ہے، تو یہ عام طور پر اس کے دشمن کی جادوئی کارستانی ہوتی ہے لیکن اس معالج (ساحر) کو بخوبی علم ہوتا ہے کہ اس جادو کا توڑ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ڈیوک آف یار آئی لینڈ (ڈیوک آف یارک کے جزائر) میں یہ معالج (ساحر) اپنی ساحرانہ قوتوں کے باعث مریض کی بیماری کی وجہ معلوم کرنے کے بعد لیموؤں کا ایک گچھا ہاتھ میں تھام کر ایک جادوئی منتر پڑھتے ہیں۔

ضروری نہیں کہ یہ طلسمی منتر ہمیشہ ہی موثر ثابت ہو۔ وحشی قبائل، مہذب انسانوں کی نسبت، اس قسم کے طریقہ علاج کے زیادہ قائل ہوتے ہیں اور ان کے امراض کا علاج مختلف جادوئی طریقوں اور منتروں کے ذریعے کیا جاتا ہے۔

ریورز[1] (Rivers) کے مطابق، میلا نیشیا[2] (Melanesia) کے اکثر علاقوں میں، جو شخص مختلف امراض کا علاج کرتا ہے، وہ یا تو جادوگر (ساحر) ہوتا ہے یا پادری ہوتا ہے۔ ان علاقوں میں، بظاہر ایک معالج اور کسی دوسرے شخص کے مابین کوئی خاص فرق نہیں ہوتا اور ایک عام شخص بھی امراض کے علاج کے لئے سادہ تراکیب استعمال کر سکتا ہے، لیکن

''جو لوگ مختلف امراض کے علاج کے لئے طبی طریقوں کے ساتھ ساتھ

جادوئی یا مذہبی تراکیب استعمال کرتے ہیں، عام طور پر یہ علم ایک خاص عمل کے ذریعے حاصل کرتے ہیں، خواہ یہ عمل وہ خود کریں یا کسی کی ہدایات کے زیر اثر انجام دیں، اور میلانیشیا میں اس قسم کا علم ہمیشہ رقم کے عوض حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جب تک کوئی شاگرد اپنے استاد کو ایک مخصوص رقم ادا نہیں کر دیتا، اسے طبی اور جادوئی یا طبی اور مذہبی علم اور عمل سکھایا نہیں جاتا۔"[3]

اس قسم کے ابتدائی حالات اور صورت حال کے باعث قطعی پادرانہ کردار کی پرداخت اور ارتقاء کے متعلق بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان حالات میں جادوئی، طلسمی اور مذہبی قوتوں کی اجارہ داری قائم ہو جاتی ہے، اور بالآخر معاشرے پر زبردست طور پہ قوتیں غالب آجاتی ہیں۔ مصر اور بابل (Babylon)[4] میں ان کی یہ قوتیں بادشاہ کے ساتھ تنازع کے دوران اس سے کہیں طاقت ور ثابت ہوئیں۔ انہوں نے "دہریے" اخناتون (Ikhnaton)[5] نامی فرعون کو شکست دی اور انہوں نے غداری کرتے ہوئے اہل بابل (Babylon) پر فتح پانے میں سائرس (Cyrus)[6] کی محض اس لئے مدد کی کہ ان کے اپنے بادشاہ نے "اہلِ کلیسا مخالف" رویہ اپنایا تھا۔

اہلِ یونان اور اہلِ روم اپنی خاص اور انوکھی قدیم حیثیت پر قائم تھے کیونکہ انہوں نے پادرانہ اقتدار سے تقریباً مکمل طور پر نجات اور آزادی حاصل کر لی تھی۔ یونان میں پہلے سے موجود یہ مذہبی قوت واختیار ہاتفوں (Oracles)، خاص طور پر ڈیلفی (Delphi)[7] کے ہاتھ میں مرتکز تھی جہاں پائتھونس (Pythoness)[8] کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ وہ سحر میں گرفتار ہو چکی تھی اور اپالو (Apollo)[9] کی طرف سے کئے جانے والے سوالات کا جواب دیتی تھی۔ بہر حال، ہیروڈوٹس (Herodotus)[10] کے زمانے تک یہ حقیقت زبان زد عام تھی کہ ہاتف کو بھی رشوت کے ذریعے رام کیا جا سکتا ہے۔ دونوں، ہیروڈوٹس اور ارسطو (Aristotte)[11] بتاتے ہیں کہ پزسٹراٹس (Peisistratus) (متوفی 527BC) کے ہاتھوں جلاوطن ہونے والے ایتھنز کے ایک اہم اور معزز گھرانے الکمانائیڈ (Alcmaeonidae) نے اپنے بیٹے کے خلاف نہایت ہی سازشی انداز میں ڈیلفی (Delphi) کی حمایت حاصل کی۔ تجسس کے عالم میں ہیروڈوٹس کیا کہتا ہے: وہ ہمیں بتاتا ہے کہ الکمانائیڈ نے، اگر ہم اہل ایتھنز پر یقین کر سکیں، اہل سپارٹا[12]

(Spartans) کو بتانے کے لئے، پائتھونس (Pythoness) کو رشوت دینے کی کوشش کی کہ خواہ ان میں سے کسی نے بھی اپنے نجی معاملات یا امورِ مملکت کے بارے ہاتف سے مشورہ کرنے کی کوشش کی، تو پھر انہیں لازمی طور پر ایتھنز (پزسٹرائس کے ظلم وستم سے) کو آزاد کرانا چاہئے۔ لہٰذا جب لیسی ڈامونیا (Laccedaemontia) کو اس کے سوا کوئی جواب وصول نہیں ہوا، آخرکار آسٹر (Aster) جو ان میں سے ایک معزز شخص تھا کے بیٹے انکیمولیس (Anchimolius) کو اور اہل ایتھنز کے خلاف ایک فوج کا سربراہ تھا، کو یہ احکامات دے کر بھیجا کہ پزسٹرائس (Peisistratus) کو نکال باہر کیا جائے، یعنی وہ دوستی کے قریبی تعلقات کے باعث ان کے احکامات کے پابند تھے کہ انہوں نے انسانی امور کی نسبت آسمانی امور کو بہت زیادہ عزت واحترام کا مستحق سمجھا تھا۔

اگرچہ انکیمولیس کو شکست ہوگئی تھی، لیکن اس کے بعد ایک بڑی مہم کامیاب ثابت ہوئی، الکمانائیڈز اور دیگر جلاوطنوں کو اقتدار واپس مل گیا اور ایتھنز کو دوبارہ ''آزادی'' نصیب ہوگئی۔

یہ داستان کئی ایک نمایاں اور ممتاز خصوصیات پر مشتمل ہے۔ ہیروڈوٹس (Herodotus) ایک نیک انسان ہے اور اس میں خبطی پن اور خشک مزاجی نام کو نہیں ہے، اور وہ ہاتف کی بات سننے کے حوالے سے اہل سپارٹا (Spartans) کے متعلق بہتر انداز میں سوچتا ہے، اور اہل ایتھنز کے امور میں پزسٹرائس کے مخالف ہے۔ بہرحال یہ اہل ایتھنز ہی ہیں جنہیں وہ ''رشوت کے کرتا دھرتا'' کہتا ہے اور کامیاب جماعت یا پائتھونس (Pythoness) کو ان کی گمراہی یا برائی کے باوجود سزا کا حقدار نہیں سمجھتا۔ الکمانائیڈو، ہیروڈوٹس (Herododus) کے زمانے میں ابھی تک ممتاز حیثیت کے مالک تھے، درحقیقت ان میں سے سب سے زیادہ مقبول ومشہور ان کا ہم عصر پیریکلز (Pericles) تھا۔

ارسطو ''ایتھنز کے آئین'' کے موضوع پر اپنی کتاب میں ان تمام حالات کو ایک نہایت ہی بری اور بدتعریفی پرمبنی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ''ڈیلفی'' (Delphi) میں واقع مقبرہ 548 قبل از مسیح میں آتش زدگی کے باعث تباہ ہوگیا تھا اور الکمانائیڈو نے یونان بھر سے اس کی تعمیرنو کے لئے رقوم اکٹھی کیں۔ ارسطو نہایت وثوق اور یقین سے یہ حقیقت بیان کرتا ہے کہ انہوں (الکمانائیڈو) نے ان رقوم کا کچھ حصہ پائتھونس (Pythoness) کو رشوت دینے کے لئے استعمال کیا اور بقیہ حصہ

اس شرط پر خرچ کرنے کی پیشکش کی کہ پزسٹراٹس کے بیٹے ہیپیاس (Hippias) کا تختہ الٹ دیا جائے، جس سے مراد یہ تھی کہ اپالو (Apollo) ان کی طرف سے فتح حاصل کر لیتا۔

بدعنوانی اور بدکرداری پر مشتمل ان واقعات و حالات کے باوجود، ڈیلفی (Delphi)، ہاتف کا انتظام، ایک ایسے سیاسی اہم معاملے کی حیثیت سے موجود رہا جس کے باعث، اس کے مذہب کے تعلق کی بنا پر "مقدس جنگ" نامی ایک نہایت ہی شدید اور خطرناک شروع ہو گئی۔ لیکن ایک وسیع تناظر میں اس حقیقت کا کھلے دل سے اعتراف کہ ہاتف سیاسی انتظام و انصرام حاصل کرنے کے لئے تیار تھا، اسے ہر قیمت پر آزادی رائے کی حوصلہ افزائی اور حمایت کرنی چاہئے تھی جس کے باعث بالآخر مقدس اشیاء کی بے حرمتی کئے بغیر رومنوں کے لئے یونانی مقابر کی زیادہ تر دولت اور عزت و احترام کے علاوہ ان سے منسوب اختیار بھی چُرا لے جانا ممکن ہو جاتا۔ یہ مذہبی اداروں کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے کہ جلد یا بدیر جرأت مند اور دلیر افراد انہیں اپنے لادینی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں، اور ان کے لئے جس احترام و افتخار پر ان کے اقتدار و اختیار کا انحصار ہوتا ہے، اسے یہ ختم کر دیتے ہیں۔ یونانی رومیوں کے دور میں یہ صورت حال، دنیا کے کسی اور مقام کی نسبت بآسانی اور کم از کم مشکل کا سامنا کرتے ہوئے موجود تھی کیونکہ ایشیا، افریقا اور قدیم یورپ میں دنیا میں سب سے زیادہ مذہب اپنی پوری قوت کے ساتھ موجود تھا۔ اس حوالے سے یونانی روم میں موجود صورت حال کے اظہار کے لئے محض چین ہی کی مثال دی جا سکتی ہے۔

اس مرحلے پر ہم صرف ان مذاہب کے متعلق غور کر رہے ہیں جن کی کوئی تاریخی بنیاد نہ تھی اور ان کا نزول قدیم انوکھی تراکیب کا شاخسانہ تھا۔ لیکن تقریباً دنیا کے ہر حصے میں ان مذاہب پر مختلف بانیان مذاہب کے ایجاد کردہ مذاہب نے برتری حاصل کر لی، اس حوالے سے واحد اہم استثنایات میں شنٹو (Shinto) اور برہمن مت (Barhmanism) شامل ہیں۔ حالیہ دور میں ظالمانہ اور استبدادانہ مذاہب کے مانند ماہرین علم بشریات کے ایجاد کردہ قدیم مذاہب کے ماخذ، مکمل طور پر غائب ہو چکے ہیں۔ جیسا کہ ہمیں پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے کہ از حد قدیم غیر مہذب اور جاہلانہ دور میں، ایک نہایت ہی واضح اور ممتاز پادرانہ کردار موجود نہیں ہے، ابتدا میں ایسا دکھائی دیتا کہ پادرانہ کردار، بوڑھے بزرگ افراد کے لئے ہی مخصوص ہے، اور یا پھر خاص طور پر یہ پادرانہ کردار عقلمندی اور دانش و دانائی کے مظہر افراد کا استحقاق تھا، اور بعض اوقات کالے جادو کے ماہر

افراد، اس پادرانہ کردار پر قابض تھے۔

تہذیبی ارتقاء اور ترقی کے ساتھ ساتھ، اکثر ممالک میں پادری، عوام سے بالکل الگ ہوتے گئے اور ان کی طاقت و اختیار میں بھی اضافہ ہو گیا۔ لیکن ایک قدیم روایت کے محافظ کی حیثیت سے، وہ قدامت پسند ہیں اور دولت و اقتدار کے مالک ہوتے ہوئے وہ ذاتی طور پر مذہب کے خلاف یا اس سے بیگانہ ہو گئے۔ پھر جلد یا بدیر، ان کے پورے نظام کو ایک انقلابی پیغمبر کے پیروکاروں نے تہہ و بالا کر دیا۔ اس حوالے سے گوتم بدھ، یسوع مسیح اور محمدؐ، تاریخی لحاظ سے اہم مثالیں ہیں۔ ابتدا میں ان کے پیروکاروں کا اقتدار و اختیار انقلابی حیثیت رکھتا تھا، لیکن پھر آہستہ آہستہ روایتی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس عمل کے دوران انہوں نے وہ قدیم روایات اور رسوم بھی اپنا لیں جن کو انہوں نے برائے نام ترک کر دیا تھا۔

مذہبی اور لادینی بانیوں، دونوں میں سے جو کوئی زیادہ طاقت و قوت کا مالک ثابت ہوا، جہاں تک ممکن ہو سکا، اس نے روایتی نظام اور طرائق پر اپنے اثرات مرتب کیے، اپنے اپنے تخلیق کردہ نظامہات میں جدید تصورات اور نظریات کے دخول کو کم کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ ان کا عمومی مطمع نظر یہ ہے کہ کم و بیش ایک جعلی ماضی تخلیق کیا جائے اور ظاہر یہ کیا جائے وہ اپنے نظام کو بحال کر رہے ہیں۔ 2 Kings xxii میں ہمیں یہ بتایا گیا کہ کس طرح پادریوں کو "کتاب قانون" ملی اور بادشاہ کو اپنے ہی حکم نامے کی پاسداری کرنا پڑی۔ "نئے عہد نامہ عتیق" پیغمبروں کے اختیار اور قوت کے سامنے فریاد کناں رہا: اناببیٹاپائز[13] کے پیروکاروں نے نئے عہد نامہ عتیق کے سامنے درخواست کی، لادینی معاملات کے حوالے سے انگلستان سے تعلق رکھنے والے پیورٹین[14] (Puriton) نے فتح سے پہلے انگلستان کے مجوزہ اداروں کے سامنے درخواست پیش کی۔ جاپانیوں نے 645 بعد از وفات مسیح، مائیکیڈو[15] (Mikado) کے اقتدار و قوت کو بحال کر دیا۔ پھر 1868 میں انہوں نے 645 بعد از وفات مسیح کے آئین کو بھی بحال کر دیا۔ وسطی ادوار سے لے کر 18Brumaire تک تقریباً تمام باغیوں نے روم کے عوامی اداروں کو بحال کر دیا۔ نپولین نے بھی چارلی میگنی[16] (Charlemagne) کی سلطنت کو بحال کر دیا۔ لیکن اس کا یہ برائے نام اور معمولی قدم محض کھیل تماشا سمجھا گیا اور اس کا یہ قدم اس وقت کے عالمانہ فاضلہ دور میں بھی بے اثر رہا۔ یہ چند منتخب شدہ مثالیں ایسی ہیں جن

سے ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف ادوار میں مختلف ریاستوں اور نظامہات کے عظیم بانیوں نے بھی مروجہ روایت کی قوت وطاقت کا احترام کیا۔

تاریخ عالم میں سب سے مشہور، طاقت ور اور اہم پادرانہ اداروں کے طور پر ''کیتھولک چرچ'' کا نام سب کے علم میں ہے۔ اس باب میں، میں نے پادرانہ اقتدار وقوت کو روایتی نوعیت کے اعتبار سے تصور کیا ہے، اس لئے میں اس ابتدائی دور کا ذکر نہیں کروں گا جب چرچ (مذہب) کی قوت وطاقت انقلابی نوعیت کی حامل تھی۔ رومی سلطنت کے زوال کے بعد چرچ (مذہب) کو دو روایات کی نمائندگی کا موقع میسر آیا، یعنی اس نے مسیحیت کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ساتھ رومیوں کو بھی اپنے حلقہ ارادت میں لے لیا۔ اس وقت بربروں کی حکومت تلوار کے زور پر قائم تھی لیکن چرچ، تہذیب، شائستگی اور تعلیم کے اعلیٰ درجے پر فائز تھا جو ذاتی مفاد سے یکسر بیگانہ تھا اور اس کے پاس مذہبی عقائد اور مافوق الفطرت خدشات اور فطرت کو متاثر کرنے کے ذرائع بھی موجود تھے، اور اس سے بڑھ کر، یہ ایک واحد ادارہ اور تنظیم تھی جو تمام مغربی یورپ میں پھیلا ہوا تھا اور اس کے اثرات اس علاقے میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ یونانی چرچ کے مقابلے میں چونکہ، کسی حد تک قسطنطنیہ اور ماسکو کی مستحکم سلطنتیں موجود تھیں، اس لئے وہ ان ریاستوں کے سامنے مکمل طور پر سرنگوں ہو گیا، لیکن مغرب میں ''اصلاحی دور'' تک چرچ کی طرف سے جدوجہد مختلف صورتوں میں جاری رہی، اور آج بھی یہ جدوجہد جرمنی، میکسیکو اور سپین (اندلس) میں جاری ہے۔

بربروں کے حملے کے بعد پہلی چھ صدیوں کے دوران، مغربی چرچ، سرکش اور جذباتی جرمن شہنشاہوں اور نوابوں کے مقابلے پر نہ ٹھہر سکا جنہوں نے انگلستان، فرانس، شمالی اٹلی اور مسیحی سپین (اندلس) پر حکومت کی۔ اس صورت حال کی بے شمار وجوہات تھیں۔ اٹلی میں جسٹینین [17] (Justinian) کی فتوحات کے باعث پادرانہ مناصب، بازنطینی اداروں میں تبدیل ہو گئے اور مغرب میں اس کی قوت وطاقت بہت کم ہو گئی۔ چند مستثنیات کے علاوہ جاگیردار طبقہ امراء کے اعلیٰ سطحی اختیارات واپس لے لئے گئے جن کے ساتھ ایک زمانے میں ان کے ایک اجنبی، نامانوس اور ناراض یورپ کی نسبت زیادہ اچھے تعلقات قائم تھے جس کی مداخلت انہیں ناگوار گزرتی تھی۔ نچلے درجے کے پادری (نائب) جاہل اور ان پڑھ تھے اور اکثر شادی شدہ تھے اور چرچ (مذہب) کی خاطر جدوجہد کرنے کی نسبت وہ اپنے بیٹوں کو فائدہ پہنچانے کے شدید خواہشمند تھے۔ سفری

سہولیات بالکل موجود نہ تھیں، لہٰذا سفر اس قدر مشکل تھا کہ رومی اقتدار دور دراز کی سلطنتوں تک پھیلایا نہ جاسکتا تھا۔ وسیع علاقے پر پہلی بااختیار اور موثر حکومت پوپ کی نہیں بلکہ چارلی میگنی کی تھی جس کے متعلق اس کے ہم عصر کہتے تھے کہ یہ حکومت بلاشبہ پوپ کی حکومت سے برتر ہے۔

1000ء کے بعد جب یہ معلوم ہوگیا کہ دنیا غیر متوقع طور پر صفحہ ہستی سے نہیں مٹ گئی تو پھر تہذیب و تمدن نے نہایت سرعت کے ساتھ ترقی کی۔ سپین (اندلس) اور سسلی میں مُوروں (Moors) کے ساتھ روابط اور تعلقات استوار ہونے کے باعث علمی فلسفے کا عروج حاصل ہوا۔ اہلِ نارمنڈی [18] (نارمن)، جو صدیوں تک محض چور اُچکے ہی تھے، انہوں نے فرانس اور سسلی میں وہ شاندار تہذیب و تمدن حاصل کرلیا جس کی اس وقت دنیا کو ضرورت تھی اور بدانتظامی و افراتفری کے بجائے نظم و ضبط اور مذہب کے پھیلاؤ کا ایک ذریعہ بن گئے، مزید برآں، اپنی فتوحات کو جائز قرار دینے کے ضمن میں مذہبی قوت و اختیار ان کے لئے بہت ہی مفید و مددگار ثابت ہوا۔ ان کے ذریعے تاریخِ عالم میں پہلی دفعہ مذہبی قوتوں (پادرانہ) کے زیرِ اثر انگلستان مکمل طور پر رومیوں کے زیرِ تسلط آ گیا۔ اسی اثناء میں فرانس کا شہنشاہ اور بادشاہ، دونوں کو اپنے مزارعوں پر قابو پانے میں بہت ہی زیادہ مشکل پیش آ رہی تھی۔ یہی حالات تھے جن کے دوران گریگوری ہفتم [19] (Hilder brand) نے اپنے تدبر اور انتہائی قوت کے ذریعے مذہبی (پادرانہ) اختیار و اقتدار میں اضافے کا آغاز کیا جس کا سلسلہ آئندہ دو صدیوں تک جاری رہا۔ چونکہ عرصہ پادرانہ اقتدار و اختیار کی بہترین علامت اور مثال تصور کیا جاتا ہے، اس لئے میں اس کے متعلق قدرے تفصیل مہیا کروں گا۔

مذہبی و پادرانہ اقتدار و اختیار کا یہ بہترین اور شاندار عرصہ جس کا آغاز گریگوری ہفتم (1073) کی فتوحات کے ساتھ ہوتا ہے، اس کا سلسلہ اور تسلسل ایوگنون [20] (Avignon) (1306) میں مذہبی بنیاد پر قائم کلیمنٹ وی [21] (Clement V) کی سلطنت تک دراز ہوگیا۔ اس مدت کے دوران اس نے ''روحانی'' ہتھیاروں یعنی اسلحے کے بجائے مافوق الفطرت قوتوں کے ذریعے فتوحات حاصل کیں۔ اس تمام عرصے کے دوران، عیسائیوں کے مذہبی راہنما (پوپ) مکمل طور پر رومی تسلط کے زیرِ اثر رہے جن میں شہر کے سرکش شرفاء شامل تھے، جن کے متعلق بقایا مسیحی سلطنت سوچ ہی سکتی تھی، اور رومیوں کو پاپائے اعظم کے تقدس کا کوئی خیال تک نہ تھا۔ عظیم

ہلڈر برینڈ بذات خود جلا وطنی ہی میں مر گیا حالانکہ اس نے اپنا اقتدار و اختیار منکسر المزاج لیکن عظیم شاہی افراد کو منتقل کر دیا تھا۔ اگر چہ کینوسا[22] (Canossa) کی فوری سیاسی فتوحات شہنشاہ ہنری چہارم کے لئے باسہولت ثابت ہوئیں، لیکن وہ بعد میں اپنے والے ادوار میں مثال کی حیثیت اختیار کر گیا۔ Kultur Kampf[23] کے دوران بسمارک[24] نے کہا: ''ہم کینوسا (Canossa) کے پاس نہیں جائیں گے۔'' لیکن یہ اس کی محض شیخی اور بڑ تھی۔ ہنری چہارم، جسے مسیحی برادری سے نکال دیا گیا تھا، اسے اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لئے معافی درکار تھی، اور اگر چہ گریگوری کو توبہ کرنی ہی پڑی لیکن چرچ (مذہب) کے ساتھ دوبارہ شامل ہونے کے لئے اس نے نہایت جارحانہ طرز عمل کا مظاہرہ کیا۔ سیاستدانوں کی حیثیت سے یہ افراد پوپ (پادرانہ اقتدار) کے خلاف مہم چلا سکتے تھے لیکن صرف مذہب سے باغی افراد نے اہم افراد کی قوت و اختیار پر اعتراض کیا، اور مذہبی قوتوں (پادرانہ اقتدار و اختیار) کے ساتھ شاہ فریڈرک دوم کی انتہائی جدوجہد کے باوجود ان افراد کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔

گریگوری ہفتم کا عرصہ حکومت، پادرانہ حکومت کی اصلاح کے اعتبار سے نہایت ہی شدت پسند اور اہم دور تھا۔ اس کے دور تک شہنشاہِ سلطنت قطعی طور پر پوپ (پادرانہ اقتدار و اختیار) سے برتر تصور کیا جاتا تھا اور کبھی کبھار انتخابات میں اس کی آواز اور قوت بھی فیصلہ کن ثابت ہوتی تھی۔ ہنری چہارم کے باپ ہنری سوم نے پادرانہ مراتب و مناصب کی خرید و فروخت کی پاداش میں گریگوری دوم کو معزول کر دیا تھا اور ایک جرمن پوپ کلیمنٹ دوم مقرر کر دیا تھا۔ لیکن ہنری دوم چرچ کے ساتھ کبھی بھی کسی تنازع میں ملوث نہیں ہوا تھا، اس کے برعکس وہ ایک نیک اور پرہیزگار شخص تھا اور وہ اپنے عہد میں اپنی مذہبی اقتدار کا پُر جوش حامی تھا۔ جس اصلاحی تحریک کا وہ حامی تھا اور جسے گریگوری ہفتم نے کامیابی تک پہنچایا، اس کا مقصد محض یہ تھا چرچ کو جاگیرداری (جاگیردارانہ نظام) کی حمایت سے روکا جائے۔ شہنشاہوں اور طبقہ اشرافیہ کے افراد نے لاٹ پادری اور پادری مقرر کئے، جو عمومی اصول کے مطابق، بذات خود جاگیردارانہ طبقہ امراء سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے مناصب اور مراتب کے ضمن میں قدرے لادینی نقطہ نظر رکھتے تھے۔ اس سلطنت میں شہنشاہ کے بعد طاقتور ترین افراد، بنیادی طور پر سرکاری افسر ہوتے تھے، اور جنہیں ان کے سرکاری عہدوں کے باعث زمینیں ملتی تھیں، لیکن گیارہویں صدی کے اواخر تک وہ مستقل طور

پر طبقہ امراء میں شامل ہو چکے تھے جن کی ملکیتیں وراثت کے ذریعے منتقل ہوتی تھیں۔ چرچ میں بھی اس قسم کا خطرہ کچھ حد تک موجود تھا، خاص طور پر نچلے درجے کے پادریوں میں یہ خطرہ بدرجہ اتم پایا جاتا تھا۔ چرچ میں موجود اصلاحی جماعت نے پادرانہ مناصب و مراتب کی خرید و فروخت جیسی برائیوں اور ''بطور داشتہ'' کے ننوں (چرچ کی خادمائیں) کے زندگی گزارنے (خاتون پادریوں کی شادی) کے خلاف مہم چلائی۔ اپنی اس مہم اور تحریک کے دوران انہوں نے نہایت جوش، جذبے، شوق، حوصلے، اخلاص اور بہت زیادہ دنیاوی فہم و فراست کا مظاہرہ کیا۔ عالمانہ اور فاضلانہ طبقے کی طرف سے اپنے لئے متبرک اور مقدس حیثیت اور اپنی فصاحت و بلاغت کے ذریعے انہوں نے اپنے بنیادی دشمنوں کو بھی رام کر لیا۔ مثال کے طور پر میلان (1058) میں سینٹ پیٹرڈ امیان نے روم کی طرف سے جاری کردہ اصلاحات کی پابندی کرنے کا حکم دیا۔ ابتدا میں تو اس نے اس قدر غیض و غضب کا اظہار کیا کہ اس کی زندگی خطرے میں پڑ گئی، لیکن بالآخر اس کی زندگی بچ گئی، اور پھر یہ معلوم ہوا کہ میلانی پادریوں میں سے ہر ایک لاٹ پادری سے لے کر ادنیٰ درجے کے پادری تک، پادرانہ عہدوں اور مراتب کی خرید و فروخت کے جرم میں ملوث ہے۔ سب نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا اور آئندہ حکم کی پابندی کرنے کا وعدہ کیا جن کے باعث انہیں معزول نہیں کیا گیا۔ لیکن ان پر واضح کر دیا گیا آئندہ اگر وہ اس جرم میں ملوث پائے گئے تو بے رحمی کے ساتھ انہیں سزا دی جائے گی۔

ہلڈر برینڈ (Hilder brand) کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ مجرد افراد پر نظر رکھے۔ اس مقصد کی خاطر اس نے ان عالم فاضل افراد کی ایک فہرست تیار کی جو نیک اور پرہیز گار افراد اور ان کی بیویوں کے خلاف ظالمانہ اقدامات کے اکثر مرتکب ہوتے تھے۔ بلاشبہ یہ مہم مکمل کامیابی نہ حاصل کر سکی اور آج بھی سپین (اندلس) میں یہ مہم کامیاب نہ ہو سکی ہے، لیکن اس کے ذریعے اس کا ایک بڑا مقصد یہ حاصل ہو گیا کہ ایک حکم کے ذریعے پادریوں کے بیٹوں کو ان کا جانشین بننے سے روک دیا گیا، اس طرح مقامی پادریوں میں موروثیت کا رواج ختم ہو گیا۔

اصلاحی تحریک نے ایک بہت ہی اہم فتح اور کامیابی حاصل کی کہ 1059 میں ایک حکم کے ذریعے پاپائے اعظم (پوپ) کے انتخاب کے لئے ایک مخصوص طریقہ مقرر کر دیا گیا۔ اس فرمان سے قبل شہنشاہ اور رومی پوپ (پاپائے اعظم) بے شمار ناجائز اختیارات کے حامل تھے جن کے

باعث جانبدارانہ اور متنازع انتخابات اکثر منعقد ہوتے۔ یہ نیا فرمان، نہ ہی فوری طور پر اور نہ ہی کسی جدوجہد کے بغیر نافذ ہو سکا، لیکن جب نافذ ہو گیا تو پوپ کے نائبین کے انتخاب کے حوالے سے اختیارات محدود کر دیے گئے۔

گیارہویں صدی کے نصف اواخر میں جاری اصلاحی تحریک، اس حوالے سے بہت زیادہ کامیاب رہی کہ لاٹ پادری کے معاونین، لاٹ پادری کے نائبین اور لاٹ پادریوں کو جاگیردارانہ طبقے سے بالکل علیحدہ کر دیا گیا اور ان کی تقرری کے ضمن میں پاپائے اعظم کو بھی اختیار دے دیا گیا، کیونکہ اس اختیار کی غیر موجودگی میں پاپائے اعظم بھی ان عہدوں پر تقرر کی خاطر جوڑ توڑ اور گٹھ جوڑ میں ملوث ہو جاتا تھا۔ اس صورت حال نے پڑھے لکھے طبقے کو بھی متاثر کیا اور ان کے دل میں چرچ کے لئے بہت زیادہ احترام پیدا ہو گیا۔ جب پادریوں پر مجرد رہنے کی پابندی لگا دی گئی تو وہ معاشرے کے باقی طبقوں سے بالکل الگ تھلگ ہو گئے، اور بلاشبہ اس طرح ان میں ہوس اقتدار کا جذبہ پیدا ہو گیا جیسا کہ اکثر رہبانیت جیسی صورت حال میں یہ جذبہ ابھر آتا ہے۔ یہ حالات ان سرکردہ راہبوں کے لئے ولولہ انگیز ثابت ہوئے جو اپنے مقصد کے حوالے سے جوش و جذبے سے معمور ہو گئے تھے، جس مقصد پر ہر اس شخص کو یقین تھا جو روایتی بدعنوانی میں ملوث نہیں تھا اور اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا تھا، اور اپنے اس مقصد کو پادرانہ اختیار و اقتدار کے اضافے کے ذریعے بہت حد تک حاصل کیا جا سکتا تھا۔

جہاں تک اس معاملے کا تعلق ہے، منظم تشہیری مہم کی بنیاد پر قائم اقتدار و اختیار کے لئے ابتدا میں غیر معمولی ہمت، حوصلہ اور ذاتی ایثار درکار ہوتا ہے، لیکن جب خصوصیات اور خوبیوں کے ذریعے اقتدار کے لئے احترام و وقار کا قیام عمل میں آ جائے تو یہ خوبیاں اور خصوصیات ترک بھی کی جا سکتی ہیں اور اس احترام و وقار کو دنیاوی مفادات کے حصول کے لئے استعمال بھی کیا جا سکتا ہے۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، یہ عزت و احترام مفقود ہوتا جاتا ہے، اور حاصل ہونے والے مفادات ختم ہو جاتے ہیں بعض اوقات یہ مرحلہ چند سالوں پر مشتمل ہوتا ہے اور بعض اوقات ہزاروں سال صرف ہو جاتے ہیں، لیکن اس کا نتیجہ ایک ہی برآمد ہوتا ہے۔

گریگوری ہفتم پرامن بقائے باہمی کا قائل نہیں تھا۔ اس کا پسندیدہ قول یہ تھا: ''اس شخص پر لعنت ہو جو اپنی تلوار کشت و خون سے واپس کھینچ لیتا ہے۔'' لیکن اس نے اپنے قول اور موقف کی

وضاحت اس طرح کی کہ اس نے روحانیت سے عاری افراد کی طرف سے تبلیغ اور پرچار سے باز رہنے کی ممانعت کر دی، اور گریگوری ہفتم کے اس وضاحت کے باعث منظم تشہیری مہم کی طاقت کے متعلق اس کے نقطہ نظر کے استحقاق کا اظہار ہوتا ہے۔

نکولس بریک سپئیر (Nicholas Break Spear)، وہ واحد انگریز شخص تھا جو پاپائے اعظم (59-1154) کے منصب پر فائز کیا گیا۔ اس کے نزدیک پاپائے اعظم کی روحانی اور دینی قوت ایک مختلف تعلق کی حامل ہے۔ ایبی لارڈ (Abelard)[25] کے ایک شاگرد "آرنلڈ آف بریسکیا" (Arnold of Brescia)[26] نے اپنے اس نقطہ نظر کی تبلیغ کی کہ "وہ کلرک جن کے پاس جائیدادیں ہیں، وہ پادری جن کے پاس جاگیریں ہیں، اور وہ مذہبی راہنما جن کے پاس مال واسباب ہے، ان کے لئے نجات ممکن نہیں ہے۔" بلاشبہ یہ انداز فکر اور نقطہ نظر روایتی نہیں تھا۔ سینٹ برنارڈ (St. Bernard) نے ایک دفعہ کہا تھا: "جو شخص نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے وہ اس شیطان کے مانند ہے جو انسانوں کے خون کا پیاسا ہوتا ہے۔" بہر حال کسی نہ کسی طرح سینٹ برنارڈ نے اپنی مثال پرہیز گاری اور پاک روی کا اعتراف کر لیا، جس کے باعث پاپائے اعظم کے ساتھ رومیوں کے تنازعے کے ضمن میں وہ رومیوں کا حلیف بن گیا۔ جسے وہ 1143 میں جلاوطن کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اس نے بحال شدہ رومی عوامی جمہوریہ کی حمایت کی جسے اس کی اخلاقی مدد کی ضرورت تھی۔ لیکن ایڈریان چہارم (Adrian IV)[27] نے ایک نائب پادری کے قتل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، "مقدس ہفتے" (Holy Week)[28] کے دوران روم (Rome) کو اپنی دینی خدمات انجام دینے سے روک دیا۔ جیسے ہی "گڈ فرائیڈے"[29] (Good Friday) آن پہنچا، سینٹ (Senate) پر ایک پادرانہ خوف و دہشت چھا گئی جس کے باعث ہر ایک شخص خوفزدہ ہو گیا۔ شہنشاہ فریڈرک باربروسا کی مدد کے ذریعے آرنلڈ (Arnold) گرفتار کر لیا، پھر اسے پھانسی دے دی گئی، پھر اس کی نعش کو آگ میں جلا کر راکھ کر دیا گیا اور اس راکھ کو "ٹبر" (Tiber) میں پھینک دیا گیا۔ لہذا یہ ثبوت مہیا ہو گیا کہ پادریوں کو بھی دولت مند بننے کا حق حاصل ہے۔ شہنشاہ کو انعام دینے کے لئے پاپائے اعظم نے سینٹ پیٹر کے چرچ میں اس کی تاجپوشی کی۔ شہنشاہ کی فوج مفید تو ثابت ہوئی، لیکن کیتھولک عقیدے کے لحاظ سے اس قدر مفید ثابت نہ ہوئی جس کے پاس لادینی قوت کی بہ نسبت دوسری قوت بہت زیادہ تھی،

اور چرچ اس کی طاقت واختیار اور دولت، دونوں کا ذمہ دار تھا۔

آرنلڈ آف بریسکیا(Arnold of Brescia) کے نظریات پاپائے اعظم اور شہنشاہ کی باہمی مصالحت کے لحاظ سے تو فائدہ مند تھے کہ دونوں کو اس امر کا ادراک ہو گیا کہ ایک مستحکم حکومت کے لئے دونوں کا باہمی تعاون اور تعلق بہت ضروری ہے۔لیکن جب آرنلڈ (Arnold) کو علیحدہ کیا گیا تو پھر پرانے تنازعے نے سر اٹھانا ہی تھا۔اس کے نتیجے میں برپا ہونے والی طویل جنگ میں پاپائے اعظم کو ایک نیا حلیف مل گیا تھا جس کا نام ''لومبارڈ لیگ'' (Lombard League) تھا۔''لومبارڈی'' کے شہر، خاص طور پر ''میلان'' (Milan) دولت منداور تجارتی لحاظ سے خوشحال تھے، اور وہ اس وقت اقتصادی طور پر صف اول کے شہروں میں شامل تھے، ایسی حقیقت تھی جسے انگریز ''لومبارڈ سٹریٹ'' (Lombard Street) کی حیثیت سے یاد رکھتے تھے۔ شہنشاہ، جاگیرداری کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا حالانکہ بورژوا سرمایہ داری نظام پہلے ہی اس کے خلاف تھا۔اگرچہ چرچ نے ''سودی کاروبار'' کی ممانعت کردی تھی،لیکن پاپائے اعظم رقم ادھار لیتا تھا اور اس نے شمالی اٹلی کے بینکاروں کو اس قدر مفید پایا کہ اس کی دینی حمیت کو کم کرنے سے کوئی بھی نہیں روک سکا۔باربروسا[30] اور پاپائے اعظم کے درمیان تقریباً بیس سال تک جاری رہنے والا تنازعہ بالآخر بغیر کسی نتیجے پر پہنچے ختم ہو گیا اور اس کی سب سے بڑی وجہ لومبارڈ کے شہر تھے کہ جہاں شہنشاہ فتح یاب نہ ہو سکا۔

پاپائے اعظم اور شہنشاہ فریڈرک دوم کے درمیان جنگ کے نتیجے میں پاپائے اعظم کو دو مرکزی اور اہم وجوہات کے باعث کامیابی کی نوید سننا ہی تھی۔ان میں سے ایک وجہ شمالی اٹلی کے ان شہروں کی مخالفت تھی جن کا میلان تجارت کی طرف تھا۔ٹوسکینی (Tuscany) کے علاوہ ''لومبارڈی'' (Lombardy) بھی جاگیرداری نظام اور سینٹ فرانسس کے پیدا کئے ہوئے نیک جذبات اور جوش وخروش کا حامی تھا۔سینٹ فرانسس نے پیغمبرانہ غربت اور آفاقی پیار ومحبت کا پرچار کیا لیکن اس کی وفات سے چند ہی سال بعد اس کے پیروکاروں نے چرچ کی جائیداد اور مال واسباب کی حفاظت کے لئے شدت پسند اہلکار بھرتی کرنا شروع کر دیئے۔شہنشاہ کو صرف اس وجہ سے شکست کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ اپنے مفاد اور مقصد کو پرہیزگاری اور اخلاقیات کے پردے میں چھپا نہ سکا۔

اسی کے ساتھ ساتھ، اسی جدو جہد کے درمیان مختلف پاپائے اعظم کی طرف اپنائے جانے والی جنگی حکمت عملیوں کے باعث بہت سے لوگ، اخلاقی بنیادوں پر پادرانہ اقتدار و اختیار کے مخالف ہو گئے۔ پاپائے اعظم جس کا لقب ''معصوم چہارم'' (Innocent IV) تھا جس کے ساتھ فریڈرک کا اپنی موت تک تنازعہ جاری رہا، کے متعلق ''کیمبرج میڈیول ہسٹری'' (Cambridge Madieval History)، جلد ششم، صفحہ 176، میں یہ اظہار کیا گیا ہے۔

''پادرانہ اقتدار کے متعلق اس کا تصور، کسی بھی پہلے پاپائے اعظم کی نسبت زیادہ لادینی خیالات پر مبنی تھا۔ اس نے اپنی کمزوری کو بھی سیاسی نقطہ نظر کے لحاظ سے محمول کیا اور یہ بھی محسوس کیا کہ اس کمزوری کو سیاسی لحاظ سے ہی دور کیا جا سکتا ہے۔ اس نے مستقل طور پر اپنی روحانی قوتوں کو دولت حاصل کرنے، دوستوں کو خریدنے، دشمنوں کو زک پہنچانے کے لئے استعمال کیا، اور اس نے اپنی بے اصولی اور کوتاہ نظری کے باعث ہر جگہ پادرانہ اقدار کے لئے ایک توہین اور تحقیر آمیز جارحانہ رویہ اختیار کیا۔ اس کے تمام اقدامات بدعنوانی پر مبنی تھے۔ اپنے روحانی فرائض اور مقامی حقوق کا غلط اور ناجائز استعمال کرتے ہوئے، وہ چرچ کی آمدنی کو پاپائے اعظم کے لئے آمدن اور سیاسی مفادات کے ذرائع کی حیثیت سے کام میں لایا۔ جبکہ پاپائے اعظم کے منصب کے لئے چار نامزد امیدوار یکے بعد دیگرے فائدہ اور مفاد اٹھانے کے منتظر تھے۔ اس قسم کے طریقہ کار اور نظام کے نفاذ کے باعث فطری طور پر غلط اور بری تقرریوں کا عمل واقع ہونا ہی تھا، اور پھر پاپائے اعظم کے وہ سفیر جو زمانہ جنگ اور سفارت کاری کے لئے چنے گئے تھے، مناسب پیشہ وارانہ خوبیوں اور صلاحیتوں کے حامل نہ ہوتے۔ دریں اثناء ''Innocent'' کو اپنی شہرت، نیک نامی اور پادرانہ اثر و رسوخ سے محرومی کا قطعی شعور نہ تھا۔ اس کے ارادے اور مقاصد تو نیک تھے لیکن اس کے اصول اچھے نہ تھے۔ جس طرح کا بھی کوئی اچھا یا برا واقعہ پیش آتا، یا حالات تعمیری یا بحرانی

شکل اختیار کر لیتے تو بھی اس کے حوصلے، ہمت، غیرمتزلزل عزم و ارادے، ہوشیاری و مستعدی میں کم ہی فرق آتا اور وہ نہایت پُرسکون ہو کر اور ٹھنڈے دل سے ہر معاملے اور صورت حال پر غور کرتا اور وہ نہایت مکاری اور عیاری سے تحمل برداشت کے ساتھ معاملے کو نمٹاتا اور حالات کو سنبھالتا لیکن اس کے اس رویے اور طرز عمل کے باعث چرچ کی اہمیت، معیار اور اعتبار کی سطح کہیں کم ہوگئی تھی۔ حالات و واقعات پر اس کا زبردست اثر اور قابو تھا، اس نے سلطنت تباہ کر دی، اس نے پاپائے اعظم کے منصب کو زوال کی جانب گامزن کر دیا اور اٹلی کی قسمت کا رخ موڑ دیا۔"

انوسینٹ چہارم (Innocent IV) کی موت کے بعد بھی پاپائے اعظم کی حکمت عملی میں تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس کے جانشین "اربن چہارم" (Urban IV) نے جدوجہد جاری رکھی جو فریڈرک کے بیٹے "مینفرڈ" (Manfred) کے خلاف مکمل کامیابی پر منتج ہوئی اور اٹلی کے ارتقاء پذیر نظام سرمایہ داری کی اسے حمایت حاصل ہوگئی۔ اس حمایت کو قائم رکھنے کے لئے اس نے اخلاقی اقدار کے معاملات میں اپنے اختیار قوت کو استعمال کیا، اور اس کا یہ عمل، منظم تشہیری قوت کو معاشی قوت میں ڈھالنے کی ایک شاہکار مثال ثابت ہوا۔ پاپائے اعظم کی بے شمار آمدنیوں کو اپنے پاس رکھنے کے عوض اکثر بینکار پہلے ہی پاپائے اعظم کے ساتھ تھے، لیکن کچھ شہروں، مثلاً سینا (Siena) اور غیبی لین (Ghibellion) میں اس تاثر کو غالب حیثیت حاصل تھی کہ یہ بینکار پہلے مینفرڈ (Manfred) کے ساتھ تھے۔ جہاں کہیں بھی یہ صورت حال موجود تھی، وہاں کے بنک کے قرضداروں کو پاپائے اعظم نے یہ ہدایت بھیج دی تھی کہ ان کا یہ مذہبی (مسیحی) فرض اور ذمے داری ہے کہ وہ اپنے قرض ادا نہ کریں، اور یہ ایک ایسا اعلان اور ہدایت تھی جسے قرض خواہوں نے فوری طور پر ایک حکم کے طور پر قبول کر لیا۔ اس کے نتیجے میں سینا (Siena) شہر میں انگلستان کے ساتھ تجارت ختم ہوگئی۔ اٹلی بھر میں جو بینکار تباہی سے بچنا چاہتے تھے، وہ پاپائے اعظم کی قوت کے ہاتھوں مجبور ہو کر "گوئیلف"[31] (Guelph) بن گئے۔

لیکن اس قسم کے طریقوں کے ذریعے اگرچہ وہ بینکاروں کی سیاسی حمایت حاصل کر سکتے

تھے لیکن وہ پاپائے اعظم کی طرف سے مذہبی اختیار اور قوت کے لئے اپنے احترام و توقیر میں بمشکل اضافہ کر سکتے تھے۔

یورپی سلطنت کے زوال اور سولہویں صدی کے اختتام تک کے تمام عرصے کا جائزہ دو قسم کی اقدار کے درمیان مسابقت کے لحاظ سے لیا جا سکتا ہے، ایک تو استعماری روم اور دوسری ایک جرمن قبیلے ٹیوٹن (Teuton) کی مطلق العنانیت، پہلی قسم کی اقدار چرچ کا خاصہ تھیں اور دوسری قسم کی اقدار ریاست میں مجتمع تھیں۔ مقدس اور محترم رومی شہنشاہوں نے استعماری روم کے ساتھ خود کو منسلک کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ وہ بذات خود، فریڈرک دوم کے علاوہ، رومی قدر کو سمجھنے کی فہم نہیں رکھتے تھے جبکہ جاگیرداری کے سیاسی ادارے، جس سے وہ مانوس تھے جرمن قبیلہ تھا۔ جن لوگوں نے شہنشاہوں کے پاس مختلف عہدوں اور مراتب پر کام کیا تھا، ان سمیت تعلیم یافتہ افراد کی زبان، عالمانہ لحاظ سے قدیم ادوار سے اخذ کی گئی تھی، مثلاً علم قانون رومیوں سے، علم فلسفہ یونانیوں سے لئے گئے تھے لیکن رسوم و رواج، جو بنیادی طور پر ٹیوٹونک (Teutonic) تھے، ایسے نہیں تھے کہ ان کا اظہار مہذب اور شائستہ زبان میں کیا جاتا۔ آج کے عہد کے ایک بہترین عالم کی حیثیت سے اسی طرح کی مشکل موجود تھی جس طرح جدید صنعتی مراحل کو اطالوی زبان میں بیان کرنے میں محسوس ہوتی تھی۔ ابھی اصلاحات کا دور بھی نہیں آیا تھا اور نہ ہی جدید زبانوں نے اطالوی زبان کی جگہ لی تھی لیکن اس وقت مغربی یورپ ٹیوٹونک (Teutonic) زبان علمی اور دانشورانہ اظہار کے لئے مناسب ترین زبان کی حیثیت سے موجود تھی۔

ہوہن سٹافن [32] (Hohenstaufen) کے زوال کے بعد ایک دو دہائیوں کے لئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چرچ نے مغربی دنیا پر اٹلی کی حکومت اور راج دوبارہ قائم کر لیا ہے۔ یہ حکمرانی، دولت کے معیار کے مطابق کم از کم اتنی ہی مستحکم تھی جیسے اینٹونین [33] (Antonine) کے دورِ حکمرانی میں تھی، یعنی انگلستان اور جرمنی سے دولت کی یہ ریل پیل روم کی طرف منتقل ہو گئی تھی اور یہ ریل پیل اس سے کہیں زیادہ تھی جو رومی فوج حاصل کرنے میں کامیاب رہی تھی۔ لیکن یہ دولت مسلح طاقت کے ذریعے نہیں بلکہ پاپائے اعظم کے احترام کے اظہار کی علامت کے طور پر روم منتقل کی گئی تھی۔

بہر حال، جیسے یہ مختلف پاپائے ہائے اعظم "ایوگنون" (Avignon) منتقل ہو گئے، گزشتہ

تین صدیوں کے دوران حاصل ہونے والی عزت و افتخار سے محروم ہونے لگے۔ ان کے عزت و احترام میں کمی محض اس لئے واقع ہوئی کہ نہ صرف انہوں نے شاہ فرانس کی مکمل اطاعت کی بلکہ انہوں نے وسیع پیمانے پر ظلم و ستم کا بازار گرم کئے رکھا، مثلاً انہوں نے ٹمپلارز (Templars) پر ظلم کے پہاڑ توڑے۔ مالی مشکلات میں مبتلا ہونے کے باعث فلپ چہارم [34] (Philip IV) نے بھی لالچ و طمع کا مظاہرہ کیا۔ پھر انہیں انتہائی بے بنیاد طریقے کے ذریعے خلاف عقائد رویہ اپنانے کا مرتکب ٹھہرایا گیا۔ جو لوگ فرانس میں تھے انہیں پاپائے اعظم کی مدد کے ذریعے گرفتار کر لیا گیا اور اس وقت تک انہیں اذیت کا نشانہ بنایا گیا جب تک انہوں نے یہ اعتراف نہیں کر لیا کہ انہوں نے شیطان کو تاوان ادا کیا ہے اور حضرت عیسیٰ کے مجسمے پر تھوکا اور پھر انہیں کثیر تعداد میں زندہ جلا دیا گیا جبکہ بادشاہ نے پاپائے اعظم کے لئے مخصوص جائیدادوں کے سوا ان کی جائیدادیں قرق کر لیں۔ اس قسم کے اقدامات کے باعث پاپائے اعظم کی اخلاقی حیثیت میں کمی واقع ہونا شروع ہوگئی۔

یورپی تاریخ کے [35] عرصے 1378-1417 کے دوران پاپائے اعظم کی عزت و تکریم کے معاملے میں مزید الجھن پیدا ہوئی کیونکہ یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ کون سا فریق حق پر ہے اور کون سا فریق دوسرے سے نفرت کرتا ہے۔ اس تمام دور میں ہر دو فریقوں نے اپنا دنیاوی شان و شوکت کا خوب مظاہرہ کیا اور اپنے وعدوں اور معاہدوں کا بھی پاس نہیں کیا۔ مختلف ممالک میں ریاست اور چرچ نے باہمی متحد اور اتفاق کے ساتھ دونوں پاپائے اعظم کی اطاعت و حمایت ترک کر دی۔ بہر حال، یہ امر واضح ہو گیا کہ اس مسئلے کا حل ایک مجلسِ شوریٰ (General Council) ہی پیش کر سکتی ہے۔ اس سلسلے میں مجلسِ پیسا (Council of Pisa) نے نہایت غلط اور گمراہ کن انداز میں دوسرے دو پاپائے اعظم سے کامیابی کے ساتھ نجات حاصل کرنے کے بغیر ہی تیسرا پاپائے اعظم مقرر کر دیا حالانکہ اس مجلس (کونسل) نے ان کی معزولی کو خلاف قانون قرار دیا، پھر مجلس کانسٹینس (Council of Constance)، بالآخر ان تینوں پاپائے اعظم کو معزول کرنے اور اتحاد قائم کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ لیکن اس کھینچا تانی کے باعث پاپائے اعظم کے منصب سے منسلک روایتی عزت و تکریم بالکل ہی ختم ہو کر رہ گئی۔ اس بحرانی اور پریشانی کے عرصے کے اختتام پر وائس لف [36] (Wycliff) کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ پاپائے اعظم کو کہے:

”اس قسم کی صورت حال کا اختتام چرچ کے لئے نقصان دہ ثابت نہیں ہوتا

بلکہ اس کے لئے مفید ثابت ہو سکتا، یعنی اپنی تباہی کے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے چرچ محض خدا کی خاطر فلاح و بہبود کے کاموں میں مصروف رہتا۔"

اگرچہ پندرہویں صدی میں پاپائے اعظم کے منصب پر فائز شخص اٹلی کے لئے مناسب تھا، جبکہ اس وقت یہ منصب انتہائی دنیوی اور لادینی ہونے کے ساتھ ساتھ اس قدر اعلانیہ غیر اخلاقی اقتدار کا حامل تھا کہ شمالی ممالک میں موجود پرہیزگاری اور پاک بازی کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ بالآخر، جرمن قبیلے Teuton ممالک میں اخلاقی انقلاب اس قدر مضبوط بنیادوں پر برپا ہوا کہ اس کے تحت معاشی اہداف و مقاصد کے کھل کھیلنے کی اجازت دے دی گئی، عمومی طور پر روم کی پذیرائی منسوخ کر دی گئی اور شہزادوں و اشرافیہ نے چرچ کی زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ لیکن یہ سب کچھ پروٹسٹنٹ نظام کے انقلابی عہد کے بغیر ممکن نہ ہوتا جو کسی وقت بھی برپا ہو سکتا تھا لیکن یورپی تاریخ کے عرصے 1378-1417 اور یورپ میں پادرانہ (پاپائے اعظم) کی نشاۃ ثانیہ اور احیاء کی بدعنوانی اس کی راہ میں حائل تھی۔ اگر بذات خود چرچ کے اندر سے اس کی اخلاقی قوت میں کمی واقع نہ ہوئی ہوتی تو اس کی تباہی کے ذمہ داروں کو کبھی بھی اخلاقی حمایت حاصل نہ ہوتی، اور اسی طرح انہیں بھی شکست ہو جاتی جس طرح فریڈرک دوم شکست سے دوچار ہو گیا تھا۔ اس موقعے پر میکاولی[37] کا یہ موقف دلچسپی سے خالی نہیں ہے جو اس نے اپنی کتاب "شہزادے" (The Prince) کے گیارہویں باب میں شاہی حکومت کے تحت پادرانہ اختیار و اقتدار کے متعلق اختیار کیا ہے:

"اب صرف شہزادے شاہی حکومت کے تحت پادرانہ اختیار و اقتدار کے متعلق اس امر کے تذکرے کا اظہار باقی ہے کہ ان مشکلات کا ذکر کیا جائے جو انہیں اقتدار کے حصول سے قبل پیش آئیں، کیونکہ یا تو یہ انہیں خوش قسمتی سے حاصل ہوئیں، اور ان کے بغیر بھی ان کا گزارا ہو سکتا تھا جس کے لئے مذہب کے قدیم قوانین نے سہارا دیا جو اس قدر طاقتور اور ایسی خوبیوں کے حامل تھے کہ شہزادوں کے رہن سہن اور ان کے رویوں کے باوجود یہ شاہی اقتدار قائم رہ سکتا تھا۔ ان اکیلے شہزادوں

> کے پاس ریاستیں تھیں لیکن وہ ان کی حفاظت نہیں کرتے تھے، ان کی رعایا بھی موجود لیکن وہ ان کی محکوم نہ تھی، اور ریاستیں حالانکہ غیر محفوظ تھیں، مگر ان سے چھینی نہ گئی تھیں۔ یہ شاہی حکومتیں لادینی تھیں اور اپنی ہی دھن میں مگن اور خوش تھیں۔ لیکن اس اقتدار و اختیار میں گرفتار ہو کر جہاں انسانی ذہن کی رسائی ممکن نہیں، میں ان کے متعلق اس لئے مزید کوئی بات نہیں کروں گا، خدا کی طرف سے نعمتوں اور شان و شوکت سے سرفراز ہونے سے ان کے متعلق کسی بھی قسم کا ذکر فرضی اور قیاسی ہوگا۔"

یہ الفاظ "لیو ایکس" (Leo X)[38] کے شان و شوکت کے زمانے میں لکھے گئے جب اصلاحات کا دور شروع ہوا تھا۔ پرہیزگار اور پاک باز جرمنوں کے لئے اس امر کا یقین آہستہ آہستہ ناممکن ہوتا گیا کہ سکندر ششم (Alexander VI)[39] کی بے رحم/اقربا پروری یا "لیو" (Leo) کی مالی حرص کو خدا اپنی نعمتوں اور شان و شوکت سے سرفراز کرسکتا ہے۔ ایک "فرضی اور قیاسی شخص" "لوتھر" (Luther)[40] پاپائے اعظم کے اقتدار و اختیار کے متعلق ہونے والی بحث اور گفتگو میں شریک ہونے کے لئے قطعی تیار اور آمادہ تھا جس کے لئے میکاولی ہچکچاہٹ میں مبتلا تھا اور جیسے ہی چرچ کی مخالفت کے لئے انہیں اخلاقی اور مذہبی حمایت حاصل ہوئی تو پھر ذاتی مفادات پر مبنی مقاصد و اہداف کی مخالفت میں بہت تیزی سے اضافہ ہوتا گیا۔ چونکہ چرچ کی قوت و اختیار کا انحصار اہم عہدوں پر فائز افراد پر تھا، تو پھر فطری طور پر اس مخالفت کی بنیاد "استحقاق" کے ایک نئے عالم پر ہونا چاہئے تھی۔ لوتھر (Luther) کی دینی حمیت کے باعث کسی مخالفت یا مذمت کے خدشے کے بغیر اور اپنی عوام کی طرف سے اخلاقی گراوٹ کا مرتکب سمجھنے کے بغیر شہزادوں کے لئے چرچ کی لوٹ مار ممکن ہوگی۔

اب جبکہ معاشی مقاصد اور عناصر نے "اصلاحی دور" کے پھیلاؤ میں بہت زیادہ کردار ادا کیا، انہیں واضح طور پر اس کردار کا حامل نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ وہ صدیوں سے فعال اور کارگر تھے۔ جس طرح تمام خود مختار حکمران کرتے ہیں، اسی طرح بے شمار شہنشاہوں نے پاپائے اعظم کی مزاحمت کرنے کی کوشش کی، اس مرحلے پر انگلستان کے ہنری دوم (Henry II) اور جان (John) کی مثال دی جا سکتی ہے۔ لیکن ان کی کوششوں کو بدنیتی اور مکاری پر محمول کیا

گیا، اس لئے یہ کوششیں ناکام ہوگئیں۔ لہٰذا ایک طویل عرصے بعد، پاپائے اعظم نے اپنے روایتی اقتدار و اختیار کو اس قدر ناجائز اور غلط استعمال کیا کہ ایک ایسا اخلاقی انقلاب برپا کیا جائے کہ جس کے ذریعے کامیاب مزاحمت ممکن ہو سکے۔

پاپائے اعظم کے عروج و زوال کے احوال کا تجزیہ ہر اس شخص کے لئے ممکن ہے جو منظم تشہیر کے ذریعے اقتدار و اختیار کے حصول کا ادراک اور فہم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ کہنا کافی نہیں کہ افراد مافوق الفطرت تھے اور بااختیار افراد کی قوت و اختیار پر یقین رکھتے تھے۔ ازمنہ وسطیٰ میں ایسے بدعقیدہ افراد موجود تھے وہ اس طرح پھیل جاتے جس طرح اہلِ پروٹسٹنٹ پھیلے تھے، بشرطیکہ مجموعی طور پر پاپائے اعظم عزت و احترام کے مستحق نہ ہوتے۔ اور پھر بدعقیدہ لادینی حکمرانوں کے بغیر چرچ کو ریاست کے تحت رکھنے کی شدید کوشش کی گئی جو اگرچہ مشرق میں تو کامیاب ہوگئی لیکن مغرب میں ناکام رہی۔ اس کامیابی اور ناکامی کی بے شمار وجوہات ہیں۔

پہلے تو یہ کہ پاپائے اعظم کا منصب موروثی نہ تھا، اس لئے اسے طویل المدتی اقلیتوں سے متاثر نہیں ہونا چاہئے تھا جس طرح لادینی سلطنتیں متاثر ہوئیں۔ چرچ میں کوئی بھی شخص پاکبازی، علم یا تدبر کے بغیر ممتاز حیثیت حاصل نہیں کرسکتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر پاپائے اعظم عزت و احترام کے مختلف پہلوؤں کے لحاظ سے اوسط درجے سے بلند تھے۔ ممکن ہے کہ لادینی خودمختار حکومتیں بھی اسی خصوصیت سے مزین تھیں لیکن وہ زیادہ تر اس حیثیت سے محروم تھیں۔ مزید برآں، پادرانہ افراد کی نسبت وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی صلاحیت سے عاری تھے۔ اکثر اوقات، یہ بادشاہ اپنی بیویوں کو طلاق دینے کی خواہش سے مجبور ہو کر مشکلات میں مبتلا ہو جاتے، اور چونکہ یہ معاملہ چرچ کے امور میں شامل تھا، اس لئے وہ پاپائے اعظم کے رحم و کرم پر ہوتے۔ بعض اوقات انہوں نے ہنری ہشتم (Henry VII) کے مانند اس مشکل سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کی، لیکن ان کی عوام کو ان کے اس رویے اور طرز عمل سے بہت صدمہ پہنچا۔ ان کے مزارعوں نے ان کے ساتھ عہد وفاداری نبھانے سے انکار کر دیا اور بالآخر انہیں ان سب کے سامنے جھکنا پڑا۔

پاپائے اعظم کے منصب کی ایک اور عظیم خوبی ان کا غیر جانبدار رویہ تھا جس میں انہوں نے قطعی فرق نہیں آنے دیا۔ فریڈرک دوم (Fredric II) کے ساتھ مقابلے اور تنازعے کے دوران

یہ امر نہایت حیران کن تھا کہ پاپائے اعظم کی موت کے باعث بہت کم فرق محسوس ہوا۔ ان کے پاس ایک نہایت ہی منظم نظام موجود تھا جس کی مخالفت کے لئے بادشاہوں کے پاس کوئی ٹھوس بنیاد موجود نہ تھی۔ یہ محض قوم پرستی کا جذبہ ہی تھا جس کے ابھرنے کے باعث لادینی حکومتیں کسی قدر تسلسل حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئیں، اور یا پھر وہ اپنے مقصد پر مضبوطی سے جمے رہے۔

عمومی طور پر گیارہویں، بارہویں اور تیرہویں صدیوں میں بادشاہ جاہل تھے جبکہ اکثر پاپائے اعظم بہت ہی پڑھے لکھے اور باعلم تھے۔ مزید برآں، یہ بادشاہ، جاگیردارانہ نظام کی ڈوریوں میں الجھے ہوئے تھے، جو بہت ہی تکلیف دہ اور اذیت ناک تھا، ہمیشہ ہی افراتفری کے خدشے سے دوچار رہتا تھا اور نئی معاشی قوتوں کے لئے نقصان دہ تھا۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے، ان صدیوں کے دوران چرچ نے ریاستوں اور حکومتوں کی نسبت ایک اعلیٰ تہذیبی اور مہذب رویہ اور طرزِ عمل اپنایا اور اس کا مظاہرہ بھی کیا۔

لیکن اس سے کہیں زیادہ چرچ کی طاقت وقوت، اس کا اخلاقی عزت و احترام تھا جو اسے حاصل تھا۔ یہ عزت و احترام ایک تو چرچ کو ایک قسم کے اخلاقی مرکز کی حیثیت سے موروثی طور پر حاصل تھا اور دوسرے قدیم ادوار میں جبر واستبداد پر مبنی وقار اور جاہ وجلال کے باعث بھی چرچ عزت وتکریم سے سرفراز تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ان کی کامیابیاں مجرد رہنے کے اصول و قاعدے کے نفاذ اور مجرد حیثیت کو اہم سمجھنے کے قدامت پرستانہ اندازِ فکر کی مرہون منت تھیں۔ چند پاپائے اعظم سمیت بہت سے کلیسائی اکابرین بجائے اس اصول سے کوئی فائدہ حاصل کرتے، انہیں بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک عام آدمی کو بھی یہ امر بخوبی طور پر معلوم تھا کہ بے انتہا حرص وہوس کی اس دنیا میں، چرچ سے تعلق رکھنے والے عیاش اور مفاد پرست ممتاز معززین، اپنے ذاتی مفادات کے غلام تھے جس کے لئے وہ اپنے نجی اور ذاتی مقاصد واہداف کے سامنے سر جھکانے کو تیار و آمادہ تھے۔ بعد میں آنے والی صدیوں میں موثر تقدس اور پاک بازی کے حامل افراد مثلاً ہلڈر برینڈ (Hilderbrand) سینٹ برنارڈ (St. Bernard) اور سینٹ فرانسس (St. Francis) نے عوامی رائے اور موقف کا اثر قائل کر دیا اور اس اخلاقی زوال کو روک دیا جو بصورت دیگر دوسرے لوگوں کے غلط کاموں کے باعث برپا ہوگیا تھا۔

لیکن ایک ایسے ادارے یا تنظیم کے لئے جس کے اہداف و مقاصد نہایت بلند ومثالی ہیں،

اوراس لئے اس کے پاس ہوس اقتدار کے لئے ایک معقول بہانہ بھی موجود ہے، اس کے لئے اس کی برتری بحیثیت وجہ شہرت ایک خطرناک احساس ہے، اور پھر اس احساس کے باعث یقینی طور پر مستقبل میں یہ ادارہ یا تنظیم نہایت ہی شدید انداز میں اپنی برتری کا اظہار کرے گا۔ چرچ نے دنیاوی مال واسباب کے حصول کو عزت ووقار کے منافی قرار دیا، اور اپنی اس منطق اور نظریے کے باعث شاہی طبقے اور طبقہ امراء پر غلبہ حاصل کر لیا۔ رہبانیت نے غربت اور دولت مندی سے اجتناب کو ایک عہد اور وعدے کے مانند اپنا لیا، جس کے باعث دوسرے لوگ اس قدر زیادہ متاثر ہوئے کہ چرچ کے پاس پہلے سے بھی موجود خطیر وکثیر دولت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ سینٹ فرانسس نے برادرانہ محبت و پیار اور بھائی چارے کے پرچار اور تبلیغ کے ذریعے ایک ایسا جذبہ اور ولولہ پیدا کر دیا جو ایک طویل اور بے رحم جنگ کے اختتام کے لئے درکار تھا۔ آخر کار، جس چرچ نے اپنی عظمت رفتہ کو بحال کر لیا تھا، اس نے اپنے پاس موجود دولت وقوت کی موجودگی کا اخلاقی جواز کھو دیا، اور دوبارہ ارتقائی عمل کے آغاز کے لئے "اصلاحی عمل" سے پیدا ہونے والی صدمہ اور پریشانی نہایت ضروری تھی۔

اس طور، جب ایک ادارہ یا تنظیم اپنے لئے ظالمانہ اقتدار واختیار کے حصول کے لئے اپنے احساس برتری کو استعمال کرتا ہے تو ناگزیر طور پر یہ صورت حال رونما ہوتی ہے۔

میکاولی کے نقطہ نظر کے مطابق، صرف غیر ملکی تسلط اور غلبے کے علاوہ، روایتی اقتدار واختیار کا خاتمہ ان افراد کی غلط کاریوں کے باعث ہوتا ہے جن کو یہ پختہ یقین ہوتا ہے کہ ان کے شدید ظالمانہ اور استبدادانہ جرائم کے باوجود ان کے اقتدار واختیار کا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔

ازمنہ وسطیٰ میں جو احترام وتکریم ہاتفوں اور پاپائے اعظم کے لئے مخصوص تھی، آج کے اس دور میں امریکی سپریم کورٹ کو یہی عزت ووقار حاصل ہے۔ جو لوگ امریکی آئین کے طریقہ کار سے واقف ہیں، انہیں یہ معلوم ہے کہ سپریم کورٹ ان قوتوں کا محض ایک حصہ ہے جو طبقہ امراء کی حفاظت پر مامور ہیں۔ جو لوگ اس تمام صورت حال سے باخبر ہیں، ان میں سے کچھ تو طبقہ امراء کے ساتھ ہیں اور سپریم کورٹ کے روایتی تقدس واحترام کو کمزور کرنے کے لئے کچھ نہیں کرتے، جبکہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو عوام کی نظروں میں محض اس لئے معتوب ٹھہرتے ہیں کہ وہ تخریب کار اور انتہا پسند (انقلابی) ہیں۔ لوتھر (Luther) کی جانب سے آئین کے سرکاری

حمایتیوں اور ترجمانوں پر کامیاب حملے سے قبل آئین کے خلاف واضح طور پر اور وسیع پیمانے پر مخالفت درکار تھی۔

جنگ میں شکست کے باعث لادینی قوتوں کی نسبت دینی قوتیں بہت کم متاثر ہوئیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جنگ عظیم کے بعد روس اور ترکی میں دینی اور سیاسی انقلاب رونما ہوا، لیکن ان دونوں ممالک میں روایتی مذہبی قوتیں، ریاست کے ساتھ نہایت قریبی طور پر منسلک رہیں۔ جنگ میں شکست کے باوجود دینی قوتوں کے زندہ سلامت رہ جانے کی ایک بہت ہی اہم مثال، پانچویں صدی میں بربروں پر چرچ کی فتح ہے۔ سینٹ آگسٹین نے روم کے زوال پر لکھی جانے والی اپنی کتاب "City of God" میں یہ وضاحت کی کہ ایک سچے مسیحی کے لئے دنیاوی عیش وراحت کا وعدہ نہیں کیا گیا لہٰذا سچے عقائد رکھنے کے باوجود دنیاوی آرام وراحت کی کسی قیمت پر بھی توقع اور امید نہیں رکھنی چاہئے۔ سلطنت میں موجود باقی رہ جانے والے ملحد افراد کا یہ موقف تھا کہ دیوتاؤں کی اطاعت سے انکار کی سزا کے طور پر رومی سلطنت زوال پذیر ہوئی، لیکن ان کے اس بظاہر معقول موقف کے باوجود، حملہ آوروں میں ان کا یہ موقف پذیرائی حاصل نہ کر سکا اور شکست خوردہ روم نے اپنی تہذیبی روایات کی برتری قائم رکھی اور فاتحین نے مسیحی مذہب اختیار کر لیا۔ لہٰذا چرچ کے ذریعے، بربروں میں رومی سلطنت کا اثر ورسوخ قائم رہا، اور ان میں سے ہٹلر (Hitler) کے سوا قدیم تہذیبی روایات کو توڑنے میں کوئی بھی کامیاب نہ ہو سکا۔

حوالہ جات

1- ڈبلیو ایچ آر ریورز۔ کتاب بعنوان "طب، جادو اور مذہب"، صفحہ 16

2- میلانیشیا (Melanesia): نیوگنی کے مشرق میں بحرالکاہل میں واقع جزائر کا ایک مجموعہ

3- ڈبلیو ایچ آر ریورز۔ کتاب بعنوان "طب، جادو اور مذہب"، صفحہ 16

4- بابل (Babylon): دنیا کا ایک شہر جس کے معلق باغات دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک عجوبہ تھے۔

-5 اخناٹون(Ikhnaton): مصر کا بادشاہ(1379-62BC)

-6 سائرس اعظم(Cyrus the Great): سلطنت فارس کا بانی (متوفی 529BC)

-7 ڈیلفی(Delphi): ایک چٹانی وادی پر واقع قدیم یونان کا ایک شہر

-8 پائتھونس(Pythoness): اپالو کے مقبرے کی ایک راہبہ

-9 اپالو (Apollo): یونانی اور روی قدیم روایات کے مطابق سورج، موسیقی، شاعری، پیغمبری، زراعت اور پادرانہ امور کا دیوتا۔ اس کے دو جڑواں بیٹے زیوس (Zeus) اور لیٹو(Leto) تھے۔

-10 ہیروڈوٹس(Herodotus): یونانی مورخ(484-424BC)

-11 ارسطو یونانی فلسفی(384-322BC)

-12 سپارٹا(Sparta): ایک قدیم یونانی شہر

-13 سولہویں صدی میں عروج حاصل کرنے والا جرمن فرقہ جس نے صرف بالغوں کو مسیحی بنانے کی حمایت کی۔

-14 سولہویں اور ستارہویں صدی میں پروٹسٹنٹ فرقے کا ایک ذیلی فرقہ۔

-15 مائیکیڈو(Mikado): شہنشاہِ جاپان۔

-16 چارلی میگنی: چارلس اوّل اعظم(742-814) فرانکس کا بادشاہ۔

-17 جسٹینین(Justinian): بازنطینی شہنشاہ(483-562)

-18 فرانس کے دو علاقے۔(نارمنڈی)

-19 گریگوری ہفتم (ہلڈر برینڈ(Gregory VIII Hilder brand):(1023-1085) اس نے بے شمار پاپائے اعظم کے وزیر اعظم کے فرائض سرانجام دیئے اور 1073 میں خود پاپائے اعظم بن گیا۔

-20 ایوگنون(Avignon): فرانس کا ایک شہر

-21 کلیمنٹ وی(Clement V): پاپائے اعظم (1523-1534) اس نے انگلستان کے بادشاہ ہنری دوم اور ملکہ کیتھرین کے مابین طلاق منظور کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

-22 کینوسا(Canossa): اٹلی میں ایک تباہ شدہ قلعہ

23- Kultur Kampf: انیسویں صدی کے اواخر سے جرمن حکومت اور کیتھولک چرچ کے درمیان تنازعہ

24- بسمارک (Bismark) (1815-98) جرمن سیاستدان۔ پروشیا کا وزیراعظم (1862-90) اور جرمن کا چانسلر (1871-90)۔

25- ابی لارڈ (Abelard): ایک فرانسیسی فلاسفر جو منطق اور دینیات پر اپنے کام کے باعث مشہور تھا۔

26- آرنلڈ آف بریسکیا (Arnold of Brescia): شہزادہ فریڈرک اول۔

27- ایڈریان چہارم (Adrian IV): نکولس بریک سپئیر (Nicholas Brake Spear)

28- ہولی ویک (Holy Week): حضرت عیسیٰ کے مصلوب سے پہلے کا ہفتہ (سات دن)

29- گڈ فرائیڈے (Good Friday): مقدس ہفتے میں جمعے کا دن۔ جب حضرت عیسیٰ کا مصلوب ہونے کی یاد میں روزہ رکھا جاتا ہے۔

30- باربروسا (Barbarossa): رومی شہنشاہ فریڈرک اوّل کی عرفیت باربروسا (لال ڈاڑھی والا)

31- گوئیلف (Guelph): قدیم اٹلی کی ایک مشہور جماعت کے کارکن جن کا مقصد قومی آزادی تھا اور انہوں نے پاپائے اعظم کی حمایت کی۔

32- شہزادوں کا جرمن خاندان، ان میں سے کئی رومی شہنشاہ تھے۔ 1138-1208 اور (1214-1254)

33- ایک رومی شہنشاہ

34- فلپ چہارم (Philip IV):(1268-1314) 1285 سے فرانس کا بادشاہ مقرر رہا۔

35- Great Schism: یورپی تاریخ کے عرصے 1378-1417 جس کے دوران روم اور آئیوگنون میں بے شمار پاپائے اعظم تھے اور یہ سب آپس میں حریف تھے۔

36- وائس لف (Wycliff)(1320-84) انگریز مذہبی مصلح۔

37- میکاولی (Machia velli)(1469-1527) اطالوی سیاستدان اور مصنف: جس کا نام اب مکاری اور خبطی پن کے مترادف ہے۔

38- لیو ایکس (Leo X)(1475-1421)، 795 سے پاپائے اعظم مقرر رہا۔

39- سکندر ششم (Alexander VI)(1431-1503): ایک ہسپانوی باشندہ جس نے رشوت دے کر پاپائے اعظم کا منصب حاصل کیا۔

40- لوتھر (Luther):(1483-1546) جرمن مسیحی مصلح مسیحی فرقے پروٹسٹنٹ کا بانی۔

پانچواں باب

شاہانہ اقتدار

زمانہء قبل از تاریخ جس طرح ہمیں پادریوں کی موجودگی کے متعلق راہنمائی، معلومات اور نشان مہیا کرتا ہے، اسی طرح بادشاہ بھی زمانہء قبل از تاریخ میں اپنے مکمل جاہ وجلال کے ساتھ موجود تھے۔ مزید برآں، بادشاہت کے ارتقاء کے ابتدائی مراحل کا اندازہ اس صورت حال سے بخوبی کیا جا سکتا ہے جو آج بھی دنیا کے انتہائی غیر مہذب اور وحشی علاقوں میں موجود ہے۔ جب بادشاہی نظام مکمل طور پر ارتقاء پذیر ہو جاتا ہے اور یہ ابھی زوال کی طرف گامزن نہیں ہوتا ہے تو اس ارتقائی عرصے کے دوران بادشاہ وہ شخص ہوتا ہے جو جنگ کے دوران اپنے قبیلے یا قوم کی قیادت کرتا ہے، جو جنگ کرنے اور امن کرنے کا فیصلہ کرتا ہے، اگرچہ ہمیشہ نہیں لیکن اکثر وہ قانون بناتا ہے اور عدلیہ کے انتظامی امور کی نگرانی کرتا ہے۔ شاہی تخت پر اس کا حق عام طور پر انتہائی کم یا زیادہ موروثیت پر مبنی ہوتا ہے۔ مزید برآں، وہ ایک مقدس ومحترم شخصیت ہوتا ہے۔ اگر وہ بذات خود خدا نہیں ہوتا لیکن کم از کم وہ خدا کا مقرر کردہ نمائندہ ضرور ہوتا ہے۔

لیکن اس قسم کی بادشاہت، ایک حکومتی نظام کے ارتقاء اور قیام کے طویل مراحل کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور اس کے تحت قائم ہونے والا معاشرہ، شاہی نظام کے تحت پہنچنے والی غیر مہذب اور وحشیانہ اقتدار سے کہیں زیادہ منظم اور مہذب ہوتا ہے۔ اکثر یورپی افراد کے تصور کے برعکس ایک وحشی اور غیر مہذب قبیلے کا سردار، اصلی اور حقیقی قدیم معاشروں میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ جس شخص کو ہم سردار کا درجہ دیتے ہیں، محض مذہبی اور تقریباتی فرائض سرانجام دیتا ہے، اور بعض اوقات وہ ایک ''رئیسِ بلدیہ'' کے مانند ہوتا ہے جو مہمانوں کے اعزاز میں ضیافتیں اور عشائیے منعقد کرتا ہے۔ بعض اوقات وہ اعلانِ جنگ کر دیتا ہے لیکن وہ بذات خود اس جنگ میں

حصہ نہیں لیتا کیونکہ اس کا منصب انتہائی تقدس و تکریم کا حامل ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس کے رتبے اور عہدے کا رعب اور وقار اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ رعایا کا کوئی فرد اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، لہٰذا اسی صورت حال کے باعث وہ خود کو عوام الناس کے امور میں مداخلت کرنے سے انتہائی طور پر باز رکھتا ہے۔ وہ قانون نہیں بنا سکتا کیونکہ یہ قانون، مروجہ روایات و اقدار، اور رسوم و رواج کے ذریعے عمل میں آتے ہیں۔ مزید برآں، اسے ان قوانین کے نفاذ کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی کیونکہ ایک چھوٹے معاشرے یا ملک میں پڑوسی فوری طور پر سزا کا نفاذ کر سکتے ہیں۔ کچھ غیر مہذب اور وحشی معاشروں میں دو سردار ہوتے ہیں، ایک لادینی (دنیاوی) اور دوسرا مذہبی، جیسے قدیم جاپان میں شوگن (Shogun) اور میکادو (Mikado)، لیکن شہنشاہ اور پاپائے اعظم کے مانند نہیں ہوتے کیونکہ شاہی قانون کے مطابق، مذہبی راہنماؤں کو صرف رسمی اور تقریباتی اختیارات حاصل تھے۔ قدیم وحشی اور غیر مہذب معاشروں میں اکثر قوانین، روایات و اقدار اور رسوم و رواج کے ذریعے مرتب کیے جاتے ہیں، اس طرح بہت تھوڑے قوانین روایتی حکومت مرتب اور وضع کرتی ہے، لہٰذا یورپی جن افراد کو سردار کہتے ہیں، انہیں شاہانہ اقتدار کے آغاز اور ابتداء کا شائبہ کہا جا سکتا ہے۔

نقل مکانی اور غیر ملکی یلغار، روایات و اقدار اور رسوم و رواج کی تباہی کا سب سے بڑا سبب ہیں، اسی لئے حکومت کی تشکیل کے ضمن میں بھی یہ تباہی، ایک بڑی رکاوٹ کی حیثیت رکھتی ہے۔ تہذیبی اعتبار سے کم تر درجے پر جو حکمران، بادشاہ کہلوانے کے مستحق ہیں، یعنی شاہی خاندان غیر ملکی ہوتا ہے، اور اس نے یہ عزت و احترام، ابتداء میں کسی قطعی اور واضح برتری اور اعلیٰ حیثیت کے باعث حاصل کیا ہوتا ہے۔

یہ امر تو قطعی واضح اور غیر مبہم ہے کہ ''جنگ'' کے باعث بادشاہوں کی قوت و طاقت میں لازمی طور پر اضافہ ہو جانا چاہئے کیونکہ جنگ کے لئے ایک متفقہ قیادت کی موجودگی ناگزیر ہے۔ اگرچہ بادشاہ کو اپنے جانشین کے تقرر اور انتخاب کا مکمل حق اور اختیار حاصل ہے لیکن جانشینی کے معاملے پر اختلاف اور تنازعے کی بدشگونی سے بچنے کے لئے ''موروثیت'' ایک آسان طریقہ ہے کیونکہ اس طرح یقینی طور پر افرادِ خانہ میں سے کسی ایک فرد کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ شاہی خاندان زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتے اور ہر شاہی خاندان، کسی غاصب یا غیر ملکی فاتح کے

باعث ظہور میں آتا ہے۔ عام طور پر، مذہب اس خاندان کو روایتی رسوم کے تحت قانونی اور جائز حیثیت عطا کرتا ہے۔ اس صورت حال میں پادرانہ قوت و طاقت فائدہ اٹھالیتی ہے کیونکہ اس کی حمایت کے بغیر شاہانہ اقتدار اور جاہ وجلال قائم نہیں رہ سکتا۔ چارلس اوّل کے قول کے مطابق "نہ تو لاٹ پادری اور نہ ہی بادشاہ ایک دوسرے کے بغیر قائم رہ سکتے ہیں"، اور تاریخ عالم کے تمام ادوار میں جہاں جہاں بھی بادشاہت قائم ہوئی ہے، یہ اصول ایک واضح مثال کی حیثیت سے موجود رہا ہے۔ بادشاہ کے منصب کے باعث ان لوگوں میں اقتدار اور اختیار کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے لیکن صرف کڑی مذہبی پابندیاں ہی انہیں بذات خود اقتدار حاصل کرنے سے باز رکھ سکیں گی۔

بہر حال، قدیم قبیلے کے سردار کے تاریخی حیثیت کے حامل ایک بادشاہ میں تبدیل ہونے میں جو کچھ بھی مراحل پیش آتے رہے، یہ مرحلہ اور عمل تاریخ کے ابتدائی دور میں ہی مصر اور بابل میں مکمل ہو چکا تھا۔ عظیم اہرام مصر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر 3000 قبل از مسیح ہو چکی تھی، اور اس کی تعمیر صرف اس صورت ہی ممکن ہو سکتی تھی جب ایک بادشاہ کو اپنی رعایا پر مکمل قابو اور گرفت حاصل ہوتی۔ اس دور میں بابل میں کئی بادشاہ تخت پر بیٹھے لیکن ان میں سے کوئی بھی بادشاہ مصر جیسے وسیع رقبے کا حکمران نہیں تھا، لیکن پھر بھی وہ اپنی اپنی قلمروؤں میں ایک مطلق العنان حکمرانوں کی حیثیت سے موجود تھے۔ تیسری ہزاروی قبل از مسیح (2123-2081BC) میں ہمیں ایک ایسے عظیم بادشاہ ہمورابی (Hamoorabi) کے متعلق پتہ چلتا ہے جس نے وہ تمام کارنامے سرانجام دیئے جو ایک بادشاہ کو انجام دینے چاہئے تھے۔ وہ اپنے ضابطہ قانون کے باعث مشہور ہے جو اسے سورج دیوتا کی طرف سے عطا ہوا تھا، اور اس کے دور حکمرانی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جس کے متعلق قدیم بادشاہتیں صرف تصور ہی کر سکتی تھی، مثلاً اس نے پادریوں کو شہری عدالتوں کا تابع بنا دیا۔ لیکن ایک سپاہی اور ایک مہندس (انجینئر) کے طور پر اسے ایک ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ اس وقت محب وطن اس کی فتوحات کی تعریف میں یوں رطب للسان تھے:

اس نے سارا وقت، اپنی بھرپور طاقت کا
زبردست انداز سے مظاہرہ کیا
اس مضبوط و توانا جنگجو، ہمورابی نامی بارعب وحشم بادشاہ نے

دشمنوں کو پیس کر رکھ دیا

اور جنگ میں ایک طوفان برپا کر دیا

دشمن کے تمام علاقوں کو فتح کرتے ہوئے

جنگ کو منطقی انجام تک پہنچا دیا

اس نے اس انداز سے باغیوں

کے سر کچل دیئے

گویا وہ مٹی کی بنی ہوئی گڑیاں تھیں

جو دشوار گزار پہاڑوں کے دامن میں

کھلے انداز میں گری پڑی تھیں

اس نے زراعت کے میدان میں اپنی فتوحات کا یوں ذکر کیا:

''جب آنو (Anu) اور این لِل (Enlil) ایک دیوتا اور دیوی نے مجھے اپنی حکمرانی کے لئے سُومر (Sumer) اور اقد (Akkad) کے علاقے عطا کئے اور اپنے عصائے شاہی سے مجھے سرفراز کیا، تو میں نے اپنے عوام کی کثیر تعداد کے ذریعے نہرِ ہیمورابی کھودی جو سُومر اور اقد کے لئے پانی لے کر آئی۔ سُومر اور اقد میں موجود بکھرے لوگوں کو میں نے اکٹھا کیا، انہیں چراگاہیں اور پانی مہیا کیا، انہیں زندگی کی ہر آسائش وافر مقدار میں مہیا کی اور انہیں ایک پُرسکون زندگی بسر کرنے کے لئے دی۔''

ایک ادارے کی حیثیت سے عظیم اہرام مصر اور بابل میں ہیمورابی کے دور میں بادشاہت اپنے کمال عروج تک پہنچ چکی تھی۔ اگرچہ ان کے بعد آنے والوں بادشاہوں کے پاس کہیں وسیع علاقہ موجود تھا، لیکن اپنی سلطنتوں پر ان سے زیادہ مکمل اور مطلق العنان حکمرانی کسی اور بادشاہ کی نہ تھی۔ مصر اور بابل پر حکمران بادشاہوں کا اقتدار باغیوں کے باعث نہیں، محض غیر ملکی فاتحین کے باعث زوال پذیر ہوا۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ ان کی متبرک اور مقدس حیثیت کے خلاف لڑ نہیں سکتے تھے کیونکہ ان کے عوام کی اطاعت کا انحصار شاہی خاندان کی مذہبی اہمیت اور قدر و منزلت پر تھا، لیکن عزت و احترام کی اس حیثیت کے علاوہ ان کا اقتدار و اختیار لامحدود نوعیت کا حامل تھا۔

یونانیوں نے اپنے اکثر شہروں میں سیاسی حکمرانوں کی حیثیت سے، تاریخ عالم کے آغاز یا زمانہ قبل از تاریخ میں اپنے بادشاہوں سے نجات حاصل کر لی۔ رومی بادشاہ، زمانہ قبل از تاریخ سے قبل سے تعلق رکھتے تھے اور رومیوں نے اپنی تاریخ کے تمام ادوار میں اپنے بادشاہ کی ناقابل تسخیر حیثیت برقرار رکھی۔ باقی دنیا کی نظر میں مغربی دنیا میں رومی شہنشاہ کبھی بھی اس مفہوم پر مکمل طور پر پورا نہیں اُترا۔ اس کی تقرری ماورائے قانون ہوتی تھی اور اس کا اقتدار و اختیار ہمیشہ فوج کے مرہونِ منت ہوتا تھا۔ شہریوں کی نظر میں وہ خود کو دیوتا منوا سکتا تھا لیکن جہاں تک فوجی سپاہیوں کا تعلق ہے، ان کے لئے اس کی حیثیت ہمیشہ ایک سپہ سالار کی سی رہی جس نے انہیں کبھی تو مناسب ہدایات جاری کیں اور کبھی نہ کیں۔ مختصر ادوار پر مشتمل مختلف مواقع پر اس کی بادشاہت موروثی نہیں ہوتی تھی۔ اصلی اور حقیقی قوت و طاقت ہمیشہ مسلح افواج کے پاس ہوتی تھی اور شہنشاہ محض عارضی عرصے کے لئے برائے نام حیثیت رکھتا تھا۔

بربروں کے حملے کے باعث شاہی نظام قدرے مختلف انداز میں دوبارہ وقوع پذیر ہوا۔ نئے بادشاہ، جرمن قبیلوں کے سردار تھے اور انہیں مکمل قوت و اختیار حاصل نہ تھا بلکہ ان کی طاقت وقوت کا انحصار ہمیشہ سے ہی "مجلسِ بزرگاں" یا اقربا پر مشتمل ایک ادارے کے تعاون اور حمایت پر تھا۔ جب ایک جرمن قبیلہ ایک رومی صوبے کو فتح کر لیتا، اس کا سردار بادشاہ بن جاتا لیکن اس کے زیادہ قریبی اور اہم ساتھی ایک مخصوص حدِ آزادی کے ساتھ طبقہ اشرافیہ میں شامل ہو جاتے۔ جب جاگیردارانہ نظام کا آغاز ہوا تو اس کے باعث مغربی یورپ کی تمام بادشاہتیں باغی نوابوں اور بارسوخ کاروباری افراد کے رحم وکرم پر آ گئی تھیں۔

اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ بادشاہت اس وقت تک کمزور ثابت ہوتی رہی جب تک چرچ اور جاگیردارانہ طبقہ اشرافیہ دونوں طاقت ور نہیں ہو گئے۔ چرچ کے کمزور ہونے کی وجوہات پر ہم پہلے ہی غور کر چکے ہیں۔ انگلستان اور فرانس میں بادشاہ کے ساتھ جدوجہد کے دوران یہ طبقہ امراء کمزور ہو گیا کیونکہ یہ ایک منظم حکومت کی راہ میں رکاوٹ تھا۔ جرمنی میں ان کے قائدین قابل رحم بادشاہوں میں تبدیل ہو گئے جس کے باعث جرمنی، فرانس کے رحم وکرم پر رہ گیا۔ پولینڈ میں، اس کی تقسیم تک طبقہ امراء پر مشتمل شاہی نظام جاری رہا۔ انگلستان میں اور فرانس میں سو سالہ جنگ (Hundred Years War) اور گلابوں[1] کی جنگیں (Wars of the Roses) عام شہری

ایک طاقتور بادشاہ کی حمایت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ایڈورڈ چہارم (Edward IV)، شہر لندن (City of the London) کی مدد سے فتح یاب ہوا، اور اسی شہر میں سے اس نے اپنی ملکہ کا انتخاب کیا۔ جاگیردار طبقہ امراء کا دشمن، لوئیس گیارہ (Louis XI) اعلیٰ بورژوائی طبقے کا دوست تھا جس نے اس کی طبقہ اشرافیہ کے خلاف مدد کی جبکہ اس نے ان کی دستکاروں اور کاریگروں کے خلاف مدد کی۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا (Encyclopaedia Britanica) کے سرکاری فیصلے کے مطابق "اس نے ایک عظیم سرمایہ دار کے مانند حکومت کی۔"

دورِ قدیم کے بادشاہوں کے مقابلے میں چرچ کے ساتھ اس امر پر اختلاف کہ تعلیم صرف پادریوں کا ہی حق نہیں ہے، نئی بادشاہتوں کو ایک نہایت ہی عظیم فائدہ حاصل تھا۔ مزید برآں نئی بادشاہتوں کے قیام کے لئے عام اور جاہل وکیلوں کی مدد بہت ضروری تھی۔

انگلستان، فرانس اور ہسپانیہ میں قائم ہونے والی نئی بادشاہتوں کو چرچ اور طبقہ امراء پر فوقیت حاصل تھی۔ ان کی طاقت وقوت کا انحصار دو ابھرتی ہوئی قوتوں، قوم پرستی اور تجارت پر تھا۔ جب تک وہ ان دونوں قوتوں کے لئے مفید ثابت ہوتیں، انہیں کوئی خطرہ لاحق نہ ہوتا اور وہ مضبوط رہتیں، لیکن جب وہ ان کے لئے مفید ثابت نہ ہوتیں تو پھر انقلاب رونما ہو جاتا۔ ان دونوں پہلوؤں کے لحاظ سے ٹیوڈر[2] (Tudor) بے قصور تھے لیکن سٹوارٹ[3] (Stuart) نے درباریوں کو دی گئی اجارہ داریوں کے باعث تجارت کی راہ روک دی اور اس طرح انگلستان نے پہلے تو ہسپانیہ کو گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور کر دیا اور اس کے بعد فرانس کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ فرانسیسی شہنشاہیت نے کول برٹ[4] (Colbert) کے دورِ حکومت کے اختتام پر تجارت کی حمایت جاری رکھی اور اپنی قومی طاقت وقوت میں اضافہ کرتی رہی۔ اور اس دور کے بعد بے حد تباہ کن جنگوں کے ایک سلسلے Revolution of the Edict of Nantes کے بعد ظالمانہ محصولات اور طبقہ امراء کے ارکان کو مالی ذمہ داریوں سے رعایت دینے کے باعث، دونوں قوم پرست اور تجارت بادشاہ کے خلاف ہو گئے، اور بالآخر انقلاب برپا ہو گیا۔ ہسپانیہ، نئی دنیا کی فتح کے باعث اس صورت حال سے منحرف ہو گیا مگر جب ہسپانیہ کی خود اپنی نئی دنیا نے بغاوت کی، تو بھی انہوں نے سب سے بڑھ کر یہی کیا تا کہ انگلستان اور امریکہ کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کئے جا سکیں۔

اگرچہ تجارت نے جاگیردارانہ نظام کے مقابلے میں بادشاہوں کی حمایت کی لیکن جب بھی

اس نے محسوس کیا کہ اسے مناسب طاقت حاصل ہوگئی ہے تو اس نے عام آدمی کی طرف اپنی توجہ مبذول کر لی۔ اپنے عظیم ایام کے دوران تجارت، شمالی اطالوی اور ازمنہ وسطیٰ کے تجارت، شمالی یورپی تجارتی شہروں میں اور ہالینڈ میں اپنی بہت ہی قدیم شکل میں موجود تھی۔ لہٰذا، بادشاہوں اور تجارت کے درمیان اتحاد اطمینان بخش نہ تھا۔ جہاں تک ممکن ہو سکا، بادشاہوں نے اپنے اقتدار و اختیار کو نیم مذہبی اور روایتی حیثیت دینے کے لئے ''روحانی استحقاق'' طلب کیا۔ اپنے اس مقصد میں وہ جزوی طور پر کامیاب ہوئے، یعنی چارلس اول (Charles I) کے قتل کو ایک عام قسم کے جرم کے بجائے ایک نہایت ہی شدید قسم کا ناجائز جرم سمجھا گیا۔ فرانس میں سینٹ لوئیس (Saint Louis) کو ایک عظیم اور لازوال شخصیت کے طور پر پیش کیا گیا، حالانکہ اس کی پاک بازی لوئیس پندرہ[5] (Louis XV) کے مقابلے میں محض دھوکہ تھی جو ابھی تک سب سے زیادہ ''مسیحی بادشاہ'' سمجھا جاتا تھا۔ درباری طبقہ امراء تخلیق کرنے کے بعد بادشاہ اس طبقے کو متوسط طبقے پر ترجیح دینے لگے تھے۔ انگلستان میں اعلیٰ طبقہ امراء اور متوسط طبقہ باہم مدغم ہو گیا اور ایک ایسا بادشاہ تیار کیا جو محض پارلیمانی حیثیت کا مالک تھا، جو قدیم جادوئی خصوصیات پر مبنی جاہ و جلال سے محروم تھا، مثلاً جارج اول (George I)، بادشاہ کی برائیاں نہیں کر سکتا تھا لیکن ملکہ این یہ سب کچھ کر سکتی تھی۔ فرانس میں بادشاہ کو طبقہ امراء پر فتح حاصل ہوئی، اور اس کے اور طبقہ امراء کے اراکین کے سر گلوٹین کے ذریعے قلم کر دیے گئے۔

تجارت اور قوم پرستی کا جو اتحاد، فریڈرک باربروسا کے عہد میں لومبارڈ لیگ[6] (Lombard League) کے ساتھ شروع ہوا، آہستہ آہستہ یورپ تک پھیل گیا، اور پھر اس نے اپنی آخری اور مختصر تاریخ فتح روس کے فروری کے انقلاب میں حاصل کی۔ جہاں جہاں بھی اس اتحاد نے فتح حاصل کی، پہلے تو شاہی نظام کی حمایت اور بعد میں اس کی مخالفت میں زمینوں کی ملکیتوں پر مبنی موروثی قوت کے خلاف ہو گیا۔ اور پھر اس کے بعد ہر جگہ سے بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا یا برائے نام بادشاہوں کا وجود باقی رہ گیا۔ اور اب کم از کم طور پر قوم پرستی اور تجارت کی راہیں جدا ہو چکی ہیں۔ اٹلی، جرمنی اور روس میں قوم پرستی نے فتح حاصل کر لی۔ بارہویں صدی میں میلان (Milan) میں شروع ہونے والی ''لبرل موومنٹ'' (Liberal Movement) اپنے راستے پر جاری رہی۔

جب روایتی اقتدار و اختیار کسی نہ کسی وجہ سے قائم رہتا ہے تو ہمیشہ ایک خاص حد تک ترقی کے مدارج طے کرتا رہتا ہے۔ اپنی حاصل کردہ عزت و وقار کے باعث یہ اس قدر بے باک ہو جاتا ہے کہ وہ عوامی قبولیت اور منظوری سے بھی اس لئے بے نیاز ہو جاتا ہے کہ یہ نہیں سمجھتا کہ اسے بھی زوال آ سکتا ہے۔ اپنی کاہلی، سستی، بے وقوفی یا استبداد کے ذریعے آہستہ آہستہ یہ قوم کے افراد کو اپنے ''روحانی استحقاق اور اختیار'' کا قائل کر لیتا ہے۔ چونکہ یہ دعوے، اعلانات اور شیخیاں کسی ٹھوس بنیاد کے بجائے محض عادات پر مبنی ہوتی ہیں، اس لئے جب ایک دفعہ ان پر تنقید شروع ہو جاتی ہے تو پھر دعوے، اعلانات اور شیخیاں چھلکیوں کی طرح اڑ جاتے ہیں۔ پھر اس کے مخالفین کے لئے مفید ایک نیا نظام اس کی جگہ لے لیتا ہے، اور یا پھر بعض اوقات افراتفری اور خلفشار ہی ایک نئے نظام کی حیثیت سے وقوع پذیر ہوتا ہے جیسے فرانس سے آزادی حاصل کرنے کے بعد ہیٹی (Haiti) میں صورت حال پیدا ہو گئی۔ اور پھر یہ صورت حال ایک معمول اور اصول کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے، ایک طویل مدت تک نہایت ہی شدید بد نظمی اور عدم حکومت کا احساس اور نشان موجود رہتا ہے جس کے بعد باغی اور مخالف اپنے نظریے اور موقف کو عوام میں پھیلانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، اور اکثر اوقات یہ انقلابی، مکمل پرانے نظام یا اس کے کچھ حصے کو اپنی طرف منتقل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک رومی بادشاہ آگسٹس (Augustus) نے خود کو سینٹ (بالائی مجلس شوریٰ) کے روایتی وقار میں جذب کر لیا، پروٹسٹنٹ فرقے کے پیروکاروں نے انجیل مقدس کے لئے اپنی عزت و تکریم اور تقدس کو برقرار رکھا جبکہ کیتھولک فرقے کے لئے ان کے دل سے عزت و احترام ختم ہو گیا۔ برطانوی پارلیمان نے آہستہ آہستہ شاہی نظام کے وقار کو ٹھیس نہ پہنچاتے ہوئے بادشاہ کو تفویض اقتدار و اختیار خود حاصل کر لیا۔

بہر حال، یہ تمام تبدیلیاں اور انقلابات محدود نوعیت کے حامل تھے۔ لیکن جن افراد نے وسیع پیمانے پر تبدیلیاں اور انقلاب برپا کئے، انہیں بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جب بھی ایک موروثی شہنشاہیت کی بجائے اچانک عوامی حکومت نے جگہ لی تو اس کے باعث عمومی طور پر بہت سی مشکلات پیدا ہو گئیں کیونکہ نیا آئین اور نظام افراد اقوام کے ذہنی انداز ہائے فکر پر حاوی نہیں ہو سکا، اور اگر وسیع تناظر میں دیکھا جائے، تو یہ آئین اور نظام، اپنے بانیوں اور پیروکاروں کے لئے مفاد کا ایک ذریعہ ثابت ہوا۔ لہٰذا، ہوس اقتدار کے مارے لوگ آمر بننے کی خواہش میں سرگرداں ہو جائیں

گے اور ایک بھر پور ناکامی کے بعد ہی شکست تسلیم کر لیں گے۔ اس قسم کے حالات کی عدم موجودگی میں، ایک عوامی آئین اس قابل نہیں رہتا کہ وہ عوام الناس کے ذہنی افکار سے ہم آہنگ ہو سکے جو استحکام کے قیام کے لئے ناگزیر ہے۔ اس ضمن میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ ایک نئی عوامی جمہوریہ کی ایک واحد مثال کی حیثیت سے سامنے آتا ہے جسے ابتداء ہی سے استحکام نصیب ہوا۔

ہمارے دور میں سب سے اہم اور مرکزی انقلابی تحریک، نجی افراد کی معاشی طاقت پر سوشلزم اور کمیونزم کا حملہ تھا۔ ممکن ہے کہ ہم اس وقت اس قسم کی تحریکوں کی مشترکہ خصوصیات تلاش کر سکیں جس کی مثال کے طور پر ہم مسیحیت، پروٹسٹنٹ فرقے اور سیاسی جمہوریت کے عروج اور ظہور کا ذکر کر سکتے ہیں لیکن اس موضوع کے متعلق، میں بعد کے ابواب میں بھی کچھ تفصیلات مہیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

حوالہ جات

1- گلابوں کی جنگ (Wars of the Roses): پندرہویں صدی کی خانہ جنگیاں جو یارک شائر اور لنکا شائر کے درمیان ہوئیں۔ اس دوران سفید گلاب یارک شائر اور سرخ گلاب لنکا شائر والوں کی علامت تھے۔

2- ٹیوڈر (Tudor): ہنری ہفتم سے لے کر ملکہ الزبتھ اول تک شاہی خاندان کا ایک رکن۔

3- سٹوارٹ (Stuart): سکاٹ لینڈ کے شاہی گھر کا نام۔

4- کول برٹ (Colbert): (1619-33) فرانسیسی سیاستدان۔

5- لوئیس پندرہ (Louis XV): 1715 سے فرانس کا بادشاہ

6- لومبارڈ لیگ (Lombard League): شمالی اطالوی ممالک کی باہمی تنظیم جو 1164 میں قائم ہوئی۔ تاکہ رومی شہنشاہوں کے خلاف اپنی آزادی کی حفاظت کی جائے۔

چھٹا باب

حشمت ورعب کا اقتدار

جب روایتی اقتدار واختیار کے استحکام کے بنیادی اور ذمہ دار نظریات وافکار، اپنی قوت و اہمیت کھو بیٹھتے ہیں تو پھر آہستہ آہستہ ایک نئے نظریے اور انداز فکر پر مبنی اقتدار و اختیار، یا پھر حشمت ورعب کا اقتدار، اپنے پَر پھیلانے شروع کر دیتا ہے، یا پھر ایک ایسا نظام اقتدار وجود میں آتا ہے جسے عوام کی طرف سے قبولیت اور رضامندی سے یکسر سروکار نہیں ہوتا۔ یہ اس قسم کا اقتدار و اختیار ہے کہ جیسے ایک بھیڑ، قصاب کی طاقت وحشمت کے رحم وکرم پر ہوتی ہے، اور یا پھر ایک فاتح فوج، شکست خوردہ قوم کو اپنی دہشت سے لرزاں رکھتی ہے، اور یا پھر جیسے گرفتار شدہ مجرموں کو پولیس اپنے زیردست رکھتی ہے۔ ایک مخصوص مذہب کے پیروکاروں پر ان کے مذہبی پیشواؤں کا اثر ورعب، ایک روایتی نوعیت کا حامل ہے لیکن ان مذہبی پیشواؤں کی طرف سے، اپنے مخالف پر ریاست کی طرف سے قوت و اختیار کا استعمال روایتی نوعیت کا حامل ہوتا ہے لیکن جب یہی ریاست اپنی باغی رعایا کے خلاف جبر وتشدد کا مظاہرہ کرتی ہے تو یہ قوت وطاقت، حشمت ورعب کے اقتدار واختیار کی نشانی ہے۔ وہ ادارے یا حکومتیں جو ایک طویل مدت سے اقتدار واختیار کی حامل ہوتی ہیں، عام طور پر تین مراحل میں سے گزرتی ہیں۔ پہلا مرحلہ ان کے جنونی لیکن روایتی افکار پر مشتمل ہے جو ان کی فتح پر منتج ہوتا ہے، پھر وہ اپنے نئے اقتدار واختیار کے ضمن میں عوامی رضامندی اور قبولیت حاصل کرتے ہیں، جو جلد ہی روایتی نوعیت اختیار کر لیتی ہے، اور پھر روایتی اقتدار جب اپنے مخالفین کے خلاف استعمال ہوتا ہے تو یہ ''حشمت ورعب کے اقتدار'' کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ جب ایک ادارہ یا حکومت ان تین مراحل میں سے گزرتی ہے تو اس کے انداز واطوار بھی کافی حد تک تبدیل ہو جاتے ہیں۔

فوجی فتح کے باعث وقوع پذیر ہونے والا اقتدار و اختیار، محض فوجی ہونے کے باعث، عام طور پر جلد یا بدیر ختم ہو جاتا ہے۔ جودیا (Judea) کے سوا رومیوں کے ہاتھوں فتح ہونے والے تمام صوبے شہنشاہ کی وفادار رعایا کی حیثیت اختیار کر گئے اور ان میں آزادی کی کوئی بھی خواہش دم توڑ گئی۔ ایشیا اور افریقا میں مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہونے والے مسیحی ممالک نے تھوڑی سی مزاحمت کے بعد نئے حکمرانوں کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ اگرچہ آئرلینڈ نے انگلستان کی محکومی سے انکار کر دیا تھا لیکن ویلز آہستہ آہستہ انگلستان کی رعایا میں شامل ہو گیا۔ البی جین[1] (Albegenian) پر فوجی قوت سے غلبہ ہونے کے بعد، ان کی نسلوں اور اولادوں نے ظاہری اور باطنی طور پر چرچ کے اقتدار و اختیار کو تسلیم کر لیا۔ انگلستان میں نارمن فتح کے بعد، ایک شاہی خاندان وجود میں آیا جس کے متعلق تھوڑی دیر بعد یہ تصور کیا گیا اسے حکومت کرنے کا روحانی استحقاق حاصل ہو گیا ہے۔ فوجی اقتدار کو اس وقت استحکام حاصل ہوتا ہے جب نفسیاتی طور پر اسے فتح نصیب ہوتی ہے اور یہ صورت حال اکثر اوقات پیش آ چکی ہے۔

کسی بھی ملک کی داخلی حکومت کا حشمت و رعب پر مبنی اقتدار، بہت جلد غیر ملکی فتوحات کے آگے سرنگوں ہو جاتا ہے اور یہ صورت دو طرح کے حالات کے باعث پیش آتی ہے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ جب دو یا دو سے زیادہ جنونی اور انتہا پسند فرقے اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہوں، دوسری صورت یہ ہے کہ جہاں کسی نئے نظریے کی کامیابی اور ترویج کے بغیر ہی روایتی نظریات معدوم پڑ گئے ہوں، اور پھر اس طرح ذاتی ہوس و خواہش کی کوئی انتہا باقی نہیں رہتی۔ پہلی قسم کی صورت خالص نہیں ہے کہ کیونکہ غالب فرقے کے حمایتی، رعب اور حشمت کے اقتدار کے محکوم نہیں ہوتے۔ میں اس موضوع پر اگلے باب میں ''انقلابی اقتدار'' کے عنوان کے تحت سیر حاصل ذکر کروں گا۔ اس وقت میں صرف دوسری صورت کے متعلق ہی آپ کو تفصیل سے آگاہ کروں گا۔

حشمت و رعب کے اقتدار کی تعریف نفسیاتی نوعیت کی حامل ہے، اور یہ حکومت اپنی رعایا کے لحاظ سے کچھ کے لئے جبر و استبداد کی حکومت ثابت ہو سکتی ہے اور کچھ کے لئے نہیں۔ اس ضمن میں غیر ملکی فتح کے سوا، میرے علم میں ایک مثال بعد میں آنے والے یونانی ظالم حکمرانوں کی ہے اور ساتھ ساتھ اٹلی کی نشاۃ ثانیہ میں شامل کچھ ریاستیں بھی اس مثال پر پورا اترتی ہیں۔

یونانی تاریخ بے شمار ایسے چھوٹے بڑے واقعات اور تجربات سے بھرپور ہے جو سیاسی اقتدار و اختیار کے حوالے سے ایک طالب علم کے لئے انتہائی دلچسپی کا باعث ہیں۔ ہیمورک[2] (Hemoric) دور کی موروثی بادشاہت زمانہء قبل از تاریخ سے پہلے ہی اختتام پذیر ہوگئی اور مطلق العنان طبقہ امراء کی موروثیت کے باعث یہ بادشاہت کامیاب رہی۔ جس مرحلے سے یونانی شہروں کی قابلِ اعتماد تاریخ کا آغاز ہوتا ہے، اس وقت طبقہ امراء اور استبدادیت کے درمیان چپقلش جاری تھی۔ سپارٹا کے سوا، کچھ دیر کے لئے تو استبدادیت ہر جگہ فتح یاب ہوئی، لیکن اسے کامیابی یا تو جمہوریت کے باعث حاصل ہوئی، اور یا پھر حکومتی امراء کی بحالی، اور یا پھر کسی وقت اہل ثروت کے باعث اسے کامیابی نصیب ہوئی۔ استبداد کا پہلا دور ساتویں اور چھٹی صدی قبل از مسیح کے ایک بڑے حصے پر محیط ہے۔ یہ ان کے آخری دور کے مانند حشمت و رعب کے اقتدار کا عہد نہ تھا جس کے متعلق میں خاص طور پر ذکر کروں گا، بہر حال کسی نہ کسی طرح، اس دور کے باعث، آخری ادوار میں لاقانونیت اور تشدد کا راستہ ہموار ہوگیا۔

مستبد، ظالم، جابر اور آمر جیسے الفاظ بنیادی طور پر کسی حکمران میں موجود بری خصوصیات پر لاگو نہیں ہوتے لیکن صرف قانونی یا روایتی اختیار یا استحقاق کی غیر موجودگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ ابتدائی ادوار کے بے شمار جابر حکمرانوں نے نہایت ہی دانشمندی اور فہم و فراست کے ساتھ حکومت کی اور ساتھ ہی ساتھ اپنی رعایا کی خوشنودی اور رضامندی کو بھی پیش نظر رکھا۔ اصولی حیثیت سے ان کے سخت ترین دشمن، طبقہ امراء کے افراد تھے۔ ابتدائی ادوار کے اکثر جابر حکمران بہت دولت مند افراد تھے جو فوجی طریقے کے بجائے محض اپنی معاشی قوت کے بل بوتے پر اقتدار میں آئے اور اپنی یہ حیثیت برقرار بھی رکھی۔ ان کا مقابلہ میڈیکی[3] (Medici) کے بجائے دور جدید کے آمروں کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔

استبداد اور آمریت کا پہلا دور وہ تھا جب پہلی بار سکوں کا استعمال شروع ہوا، اور دولت مند افراد کی قوت و اختیار میں اضافے کے لئے سکوں کا استعمال اسی قسم کے اثرات کا حامل تھا جیسے آج کے دور میں آلاتِ ادھار اور کاغذی رقم موثر ہے۔ یہ صورت حال اس سچائی کے ساتھ جاری رہی جس کے متعلق میں کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں کہ آلاتِ تبادلہ زر کا ظہور، آمریت کے قیام سے براہِ راست متعلق تھا کیونکہ یقینی طور پر چاندی کی کانوں کی ملکیت ہر اس شخص کے لئے

مفید تھی جو ایک آمر اور جابر حکمران بننے کا خواہشمند تھا۔ رقم کا نیا نیا استعمال بہت زیادہ طور پر قدیم رسم و رواج کو منتشر کر دیتا ہے جس طرح کی صورت حال افریقا کے ان بعض حصوں میں دیکھی جا سکتی ہے جو زیادہ عرصے تک یورپ کے زیرِ تسلط نہیں رہے۔ ساتویں اور چھٹی صدی قبل از مسیح میں اس قسم کی صورت حال موجود تھی کہ تجارتی و معاشی قوت و طاقت میں اضافہ کیا جائے اور علاقائی طبقہ ہائے امراء کی قوت و اختیار میں کمی کی جائے۔ جب تک اہل فارس نے ایشیاء کے خزانوں پر قبضہ نہیں کیا تھا، یونانی دنیا میں چند ہی جنگیں واقع ہوئی تھیں اور وہ بھی کسی اہمیت کی حامل نہ تھیں، اور ان میں غلاموں کا بھی کچھ زیادہ حصہ نہ تھا۔

جہاں تک کسی بھی شخص کے لئے خوشحال اور دولت مند ہونے کے امکان کا تعلق ہے، مروج روایات اور رسوم و رواج میں کمزوری کے باعث نقصان کی نسبت فائدہ زیادہ ہوا۔ گزشتہ چار صدیوں پر مشتمل استثنائی صورت حال کے علاوہ، اس فائدے کے باعث یونانی تہذیب و تمدن میں ایسی ترقی رونما ہوئی جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ ترقی اور خوشحالی کا یہ عرصہ یونانی فن، سائنس اور فلسفے کی ترویج کا دور تھا جو مافوق الفطرت نظریات سے قطعی محفوظ رہا۔ لیکن معاشرتی ڈھانچے میں کسی بحران سے نبرد آزما ہونے کے حوالے سے بالکل ہی دم خم نہ تھا جبکہ افراد بھی ان اخلاقی معیارات کے حامل نہ تھے تاکہ نیکی اور بھلائی کی عدم موجودگی میں بھی شدید قسم کے جرائم سے اجتناب و احتراز کیا جا سکے۔ جنگوں کے ایک طویل سلسلے کے باعث آزاد افراد کی تعداد کم ہوتی گئی جبکہ غلام افراد کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ پھر اہلِ یونان بالآخر باقاعدہ طور پر مقدونیہ کے زیرِ تسلط آ گئے جبکہ بے شمار متشدد انقلابات، خانہ جنگیوں اور ظالمانہ و آمرانہ کارروائیوں کے باوجود ہیلینک سسلی[4] (Hellenic Sicily) نے کارتھیج[5] (Carthage) کے اقتدار کے خلاف جدوجہد جاری رکھی، اور پھر روم کے خلاف بھی وہ اپنی کوشش میں بدستور مصروف رہے۔ اہلِ سائرا کیوز[6] (Syracuse) کے مظالم دو وجوہات کے باعث ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ وہ حشمت و رعب کے اقتدار کے معیار پر مکمل طور پر پورا اترتے ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ اس انداز سے افلاطون پر اثر انداز ہوئے جس نے بوڑھے Dionysius کے ساتھ لڑائی کی اور ایک نوجوان شاگرد بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ یونانی جابر اور آمر حکمرانوں کے متعلق بالعموم، آخری دور، اور اس کے بعد آنے والے تمام ادوار میں، اہلِ یونان کے نظریات بہت حد

تک قدیم یونان کے دو جابر اور آمر اشخاص [7] کے ساتھ فلسفیوں کے گمراہ کن تعلقات اور سائرا کیوز (Syracuse) میں حکومتی بدانتظامی کے باعث متاثر ہوئے۔

گروٹے کہتا ہے:

''دھوکے بازی کے اپنے نظام میں جہاں لوگوں کے ساتھ عارضی طور پر اس لئے فریب کاری کی جاتی ہے کہ وہ قوت و طاقت کے ایک ایسے نظام کے آگے جھک جائیں اور ان کی یہ اطاعت ان کی اطاعت کے بغیر ہو۔ یہ سب کچھ یونانی غاصبوں اور لٹیروں کا وتیرہ تھا۔''

یہ امر شک وشبے کا باعث ہوسکتا ہے کہ ابتدائی ادوار کے ظالم و جابر حکمران کس طرح عوامی مقبولیت کے بغیر قائم رہے، لیکن بعد کے ظالم اور جابر حکمرانوں کے متعلق جو معاشی قوت کے بجائے فوجی قوت کے حامل تھے، کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں۔ مثال کے طور پر گروٹے کے اس بیان پر توجہ مرکوز کیجئے جس کی بنیاد ڈائیڈ روس (Diodrous)، یعنی مشکل لمحے پر ہے جب قدیم یونان کے ایک جابر حکمران کو عروج حاصل ہوا۔ سائرا کیوز (Syracuse) کو کم و بیش کم جمہوری حکومت کے ہاتھوں شکست اور ذلت کا سامنا کرنا پڑا تھا اور شدید و سخت جنگوں کے حمایتیوں کا منتخب راہنما ڈایانیوسیس، شکست خوردہ سپہ سالاروں کے لئے سزا کا مطالبہ کررہا تھا۔

''اس وقت جب سائرا کیوز (Syracuse) کی اسمبلی میں خاموشی اور بے چینی کی کیفیت کا راج تھا، ڈائینوسیوس (Dionysius) وہ پہلا شخص تھا جو اس اسمبلی میں بیٹھے ہوئے افراد سے خطاب کے لئے اُٹھا۔ اس نے ایک ایسے موضوع پر سیر حاصل خطاب کیا جو اس کے سامعین اور اس کے اپنے مزاج اور طبع پر مبنی نقطہ نظر کے عین مطابق تھا۔ اس نے اہلِ کارتھیج (Carthiginions) کے حوالے سے سائرا کیوز کے تحفظ اور سلامتی کے لئے جرنیلوں کی غداروں کی شدید مذمت کی اور انہیں ایگری گینٹم (Agrigentum) کی تباہی کا ذمہ دار ٹھہرایا کہ خطرہ سر پر کھڑا ہونے کے باوجود جرنیلوں نے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اس نے ان جرنیلوں کی غلطیوں کو اصلی، سچی اور دانستہ قرار دیا کہ نہ صرف انہوں نے بھرپور طور پر

نہایت ہی غلط اقدام اٹھائے بلکہ نہایت ظالمانہ تشدد کا بھی مظاہرہ کیا جو مہذب الفاظ کے دائرے کو بھی عبور کر گیا اور ان کے لئے کسی بھی قانون کی پروا کیے قتل کی سزا تجویز کی جیسے اگری گینٹم (Agrigentum) کے جرنیلوں کو حال ہی میں قتل کیا گیا تھا۔ ''دیکھو، یہ غدار بیٹھے ہیں! کسی بھی قانونی مقدمے، سماعت یا فیصلے کی ضرورت نہیں، بلکہ ان کے اوپر اپنے ہاتھ فوراً بلند کر کے فوری طور پر ان کے متعلق فیصلہ کر دیا جائے۔'' اس قسم کی ظالمانہ ترغیب نہ صرف قانون کی خلاف ورزی تھی بلکہ پارلیمانی نظام کے خلاف بھی تھی۔ اس اسمبلی کے صدارتی مجسٹریٹوں (منصفین) نے ڈائینوسیوسیس کو اس سارے نظام کو تہہ و بالا کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا اور اسے جرمانہ کر دیا کیونکہ ازروئے قانون انہیں یہ اختیار حاصل تھا۔ لیکن اس کے ساتھی اس کی حمایت زور و شور سے کر رہے تھے۔ فلسٹس (Philistus) نے نہ صرف اس کی طرف سے جرمانہ اسی وقت ادا کر دیا بلکہ علی الاعلان اس نے کہا کہ آئندہ بھی اس طرح کے عائد کردہ جرمانے تمام دن ادا کرتا رہے گا اور ڈائینوسیوسیس کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ جس طرح مناسب سمجھتا ہے اسی طرح کی زبان استعمال کرے۔ یہ تمام معاملہ جو لاقانونیت کے طور پر شروع ہوا تھا، بڑھتا ہوا قانون کی کھلی خلاف ورزی تک پہنچ گیا۔ چونکہ منصفین کے اختیار میں بہت کمی رونما ہو چکی تھی، اور ان کے خلاف شور و غل بھی بہت برپا ہو رہا تھا، شہر میں ان کی حقیقی حالت یہ تھی کہ وہ نہ تو مقرر کو سزا دے سکتے تھے اور نہ ہی اس پر دباؤ ڈال سکتے تھے۔ ڈائینوسیوسیس نے اپنے تقریروں میں مزید شعلہ بیانی اختیار کی اور نہ صرف جرنیلوں پر الزام عائد کیا کہ انہوں نے اگری گینٹم سے بری طرح غداری کی ہے بلکہ اس نے ان سازشی اور دولت مند افراد کی بھی مذمت کی جنہوں نے امراء کے مانند ظلم و ستم کا راستہ اپنایا —— جنہوں نے اکثریت کے ساتھ نفرت و حقارت کا سلوک کیا اور شہر کی تباہی کے

ذریعے اپنا مفاد حاصل کیا۔ اس نے کہا کہ اس وقت تک سائرا کیوز کو نہیں بچایا جا سکتا تھا جب تک یکسر مختلف کردار کے حامل افراد کو اختیار اور قوت مہیا نہ کی جاتی، دولت یا منزل کے باعث ان کا انتخاب نہ کیا جاتا بلکہ ایسے لوگوں کا انتخاب کیا جاتا جو پیدائشی طور پر منکسر المزاج ہوتے، اچھے منصب و مرتبے کے مالک ہوتے، اپنے انداز و اطوار میں مہذب اور مہربان ہوتے اور اپنی کمزوریوں سے خوب واقف ہوتے۔''

اور اس طرح وہ بھی ظالم و جابر بن گیا۔ لیکن تاریخ ہمیں یہ نہیں بتاتی کہ اس سے غریبوں اور دوسرے منکسر المزاج لوگوں کو کیا فائدہ ہوا۔ یہ تو سچ ہے کہ اس نے امیر لوگوں کی جائیدادیں ضبط کر لیں لیکن اس نے جائیدادیں اپنے ذاتی محافظوں کو دے دیں۔ اس کی مقبولیت جلد ہی معدوم پڑ گئی لیکن اس کا اقتدار قائم رہا۔ اس ضمن میں گروٹے مزید لکھتا ہے:

''اس کی سلطنت، اہلِ سائرا کیوز کے لئے اس قدر ظالم و جابر ثابت ہوئی کہ اس سے پہلے انہیں ایسی آمریت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا، اور یہ سلطنت صرف اور صرف حشمت و رعب کے اقتدار پر قائم تھی، لہٰذا اس نے اپنے گرد اپنی حفاظت کے لئے اس قدر حفاظتی اقدامات کر لئے تھے کہ اس سے پہلے یونان کے کسی بھی ظالم و جابر حکمران نے نہیں کئے تھے۔''

اس حقیقت کے اعتبار سے یونانی تاریخ اس قدر انوکھی، عجیب و غریب اور انفرادیت کی حامل ہے کہ سپارٹا (Sparta) کے علاوہ یونان میں ہر جگہ روایت و اقتدار کا اثر و رسوخ غیر معمولی طور پر کم اور کمزور تھا۔ مزید برآں، یہاں سیاسی اخلاقیات بھی تقریباً ناپید تھی۔ ہیروٹوڈس (Herotodus) بتاتا ہے کہ سپارٹا (Sparta) کا کوئی بھی شہری رشوت کو نہیں ٹھکرا سکتا تھا۔ یونان بھر میں اس بنیاد پر کسی بھی سیاست دان پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس نے شاہ فارس سے رشوت لی ہے، کیونکہ اس کا حریف اسی خرید و فروخت کے حوالے سے اس قدر طاقتور ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اقتدار کے حصول کے لئے ہر طرف سے جد و جہد شروع ہو گئی جو بدعنوانی، دنگا فساد اور قتل و غارت پر محیط تھی۔ اس صورت حال میں سقراط اور افلاطون کے دوست ان افراد میں شامل تھے جو بہت ہی بے ایمان اور بدعنوان ہو چکے تھے بالآخر یہی کچھ سامنے آتا تھا،

جس کی پیش گوئی کی جا سکتی تھی کہ کوئی غیر ملکی طاقت یہاں قابض ہو جاتی۔

یونان کی آزادی چھن جانے پر ماتم اور افسوس، اب ایک رسم اور معمول کی حیثیت اختیار کر چکا تھا، اور اہل یونان کو سولون (Solon)[8] اور سقراط کے مانند ہی یاد کیا جانا بھی اسی معمول اور رسم کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ ہیلینک سسلی (Hellenic Sicily) کی تاریخ ہمیں یہ بتا سکتی ہے کہ روم کی فتح پر ماتم اور افسوس کی کس قدر معمولی سی وجہ موجود ہے۔ مجھے اگاتھوکلس[9] (Agathocles) سے زیادہ حشمت و رعب کے اقتدار کی کوئی اچھی مثال نظر نہیں آتی، جو سکندر اعظم کا ہم عصر تھا، جو 361 سے 299 قبل مسیح زندہ رہا اور اس نے اپنی زندگی کے آخری اٹھائیس سالوں میں اہلِ سائرا کیوز پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے۔

سائرا کیوز (Syracuse) یونان کے بہت بڑے شہروں میں سے ایک تھا، اور شاید بحرِ اوقیانوس کے علاقے کا سب سے بڑا شہر تھا۔ اس کا صرف ایک ہی حریف کارتھیج (Carthage) تھا جس کے ساتھ ہمیشہ اس کی جنگ ہی جاری رہتی تھی اور یہ جنگ صرف اس وقت مختصر عرصے کے لئے رک جاتی جب کسی بھی فریق کو شدید شکست کا سامنا کرنا پڑتا۔ سسلی (Sicily) میں واقع دوسرے یونانی شہر فریقین کی سیاست کو دیکھتے ہوئے کبھی سائرا کیوز کے ساتھ ہو جاتے اور کبھی کارتھیج کا ساتھ دیتے۔ ہر شہر میں دولت مند افراد، مطلق العنان طبقہ امراء کی حمایت کرتے اور غریب افراد جمہوریت کا ساتھ دیتے۔ جب جمہوریت کے علمبردار کامیاب ہو جاتے، تو ان کے راہنما بھی عام طور پر جابر و آمر بننے میں کامیابی حاصل کر لیتے۔ شکست خوردہ حریف جلاوطن ہو جاتے اور ان شہروں کی افواج میں شامل ہو جاتے جہاں ان کا حلیف فریق اقتدار میں ہوتا۔ لیکن مسلح افواج کی زیادہ تعداد کرائے کے فوجیوں پر مشتمل ہوتی تھی جو اکثر ان فریقین میں سے کسی سے بھی تعلق نہیں رکھتے تھے۔

اگاتھوکلس (Agathocles) ایک بہت ہی شریف خاندان کا چشم و چراغ تھا اور ایک کمہار (مٹی کے برتن بنانے والا) کا بیٹا تھا۔ اپنی خوبصورتی اور حُسن کے باعث وہ سائرا کیوز کے ایک شخص ڈیماس (Demas) نامی کی آنکھوں کا تارا تھا جس کی چھوڑی ہوئی تمام دولت اس کے پاس تھی اور جس کی بیوہ سے اس نے شادی کی تھی۔ جنگ میں نمایاں کارنامے دکھانے پر اس کے متعلق یہ سمجھا گیا کہ وہ بہت ظالم و جابر ہے، اس لئے اسے جلاوطن کر دیا گیا اور احکامات جاری کر

دیئے گئے کہ جلاوطنی کے سفر کے دوران اسے قتل کر دیا جائے۔ لیکن اس نے حالات کی سنگینی کا اندازہ لگاتے ہی ایک ایسے غریب شخص کا لباس پہن لیا جسے غلطی سے کرائے کے قاتلوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ پھر اس نے سسلی کے اندرونی علاقے میں ایک فوج تیار کی جس نے اہل سائرا کیوز کو اس قدر دہشت زدہ کیا کہ انہوں نے اس کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔ وہ دوبارہ اپنے وطن واپس آ گیا اور اس نے سیرس (Ceres)[10] کے مقبرے کے اندر آ کر قسم کھائی کہ وہ جمہوریت کے خلاف کوئی مخالف قدم نہیں اٹھائے گا۔

سائرا کیوز کی حکومت اس وقت جمہوریت اور آمریت کا ملغوبہ نظر آ رہی تھی۔ چھ سو افراد پر مشتمل ایک مجلس تھی جس میں امیر افراد شامل تھے۔ اس نے ان امیر افراد کے مقابلے میں غریبوں کی حمایت میں آواز اٹھائی۔ ان میں سے چالیس افراد کے ساتھ ملاقات کے دوران اس نے اپنے سپاہیوں کو بلایا اور یہ کہتے ہوئے ان تمام چالیس افراد کو قتل کروا دیا کہ یہ لوگ اس کے خلاف سازش کر رہے تھے۔ پھر وہ اپنی فوج کے ساتھ شہر کے اندر داخل ہو گیا اور فوج کو حکم دیا کہ ان تمام چھ سو امیر افراد کو لوٹ لیا جائے، فوج نے ایسا ہی کیا اور ان شہریوں کا قتل عام کیا جو محض یہ دیکھنے کے لئے اپنے گھروں سے باہر نکلے تھے کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے، اور پھر آخر میں مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لئے بے شمار شہریوں کو بھی قتل کر دیا گیا۔ ڈائی ڈورس[11] کے مطابق: ''ان افراد کو بھی نہیں بخشا گیا جنہوں نے دیوتاؤں کے مقبروں میں پناہ لی تھی۔ دیوتاؤں کے تقدس کو انسانوں کے ظلم و ستم نے پامال کر دیا، اپنے ہی ملک میں یونانی اپنے ہم وطنوں کے خلاف ہو گئے، آپس کے عزیز رشتہ دار بھی زمانہ امن میں ایک دوسرے کے صف آراء ہو گئے، فطری اور ملکی قوانین کا احترام دل سے اٹھ گیا، دیوتاؤں کی بے حرمتی کی گئی، دشمن تو دشمن، دوستوں کا بھی خیال نہیں کیا گیا، اور اس وقت ہر شریف آدمی، ان مصیبت زدہ افراد کی قابل رحم حالت پر افسوس کے اظہار کے سوا کچھ نہ کر سکتا تھا۔''

دن بھر تو اگاتھوکلس کی فوج مردوں کا قتل عام کرتی رہی، اور پھر رات بھر وہ خواتین کو خون میں نہلاتے رہے۔

دو دن کے قتل عام کے بعد اگاتھوکلس کے سامنے قیدی پیش کیے گئے اور اس نے اپنے دوست ڈائنوکریٹس (Dinocrates) کے سوا سب کو مروا دیا۔ پھر اس نے مجلس کے تمام اراکین کو

بلایا، اوران دولت مند افراد پر الزامات عائد کئے اور کہا کہ وہ شہر کو شاہی نظام کے تمام حامیوں سے پاک کر دے گا اور وہ خود ایک نجی زندگی گزارے گا۔ لہٰذا اس نے فوجی وردی اتار دی اور سادہ لباس زیب تن کر کے سب معاملات سے الگ ہو گیا۔ لیکن جن افراد نے اس کی قیادت میں لوٹ مار مچائی تھی، وہ اسے اقتدار میں دیکھنا چاہتے تھے، اور واحد سپہ سالار کی حیثیت سے ان لوگوں نے اس کی حمایت کی۔ ''ان میں سے بہت سے غریب افراد جو قرض دار تھے، اس انقلاب کے باعث بہت خوش تھے۔'' کیونکہ اگاتھوکلیز نے ان سے قرضوں کی معافی کا وعدہ کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں زمینیں دینے کا بھی عہد کیا تھا۔ پھر کچھ عرصے کے لئے اس نے اپنی طبیعت میں نرمی پیدا کر لی۔

جنگ کے دوران اگاتھوکلس نے خوش تدبیری اور بہادری کا مظاہرہ کیا تھا لیکن اس کے مزاج میں تلخی اور تیزی بھی تھی۔ ایک ایسا موقع بھی آیا تھا جب یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اہل کارتھیج لازمی طور پر مکمل فتح حاصل کر لیں گے، انہوں نے سائرا کیوز کا محاصرہ کیا ہوا تھا اور ان کی بحری فوج نے بندرگاہ پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن اگاتھوکلس ایک بڑی فوج کے ساتھ بحری جہازوں کے ذریعے افریقہ پہنچا جہاں اس نے اپنے جہاز محض اس لئے نذر آتش کر دیئے کہ اہل کارتھیج کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ اپنی غیر حاضری میں کسی شورش کے امکان کو ختم کرنے کے لئے وہ بچوں کو یرغمال بنا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا، اور کچھ دیر بعد، اس کے بھائی نے جو سائرا کیوز میں اس کی نمائندگی کر رہا تھا، ان آٹھ سو سیاست دانوں کو جلاوطن کر دیا جو اہلِ کارتھیج کے دوست سمجھے جاتے تھے۔ افریقہ میں پہلے تو وہ حیرت انگیز طور پر کامیاب رہا، اس نے تیونس پر قبضہ جما لیا اور کارتھیج کا محاصرہ کر لیا جہاں حکومت ہوشیار ہو گئی اور اس نے مولوش12 (Moloch) کو منانے کے لئے تدبیریں کرنی شروع کر دیں۔ پھر یہ معلوم ہوا کہ جن امراء کے بچے دیوتا کے لئے قربانی کے لئے مخصوص کر دیئے جاتے تھے، وہ اکثر غریبوں کے بچے خرید کر اپنے بچوں کے متبادل پر پیش کر دیتے تھے۔ یہ معمول اب بہت ہی سختی سے روکا جاتا تھا کیونکہ مشہور یہ تھا کہ مولوش صرف امراء کے بچوں کی قربانی سے راضی اور خوش ہوتا ہے۔ اس قربانی کے بعد اہل کارتھیج کی قسمت کا ستارہ چمک اُٹھتا۔

اگاتھوکلس نے اپنے آپ کو مزید مضبوط اور طاقت ور بنانے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے اپنے وفود سائرینی (Cyrene) (یونان کا ایک شہر) بھیجے جو اس وقت بطلیموس13 کے زیر تسلط تھا اور وہاں سکندر کی فوج کا ایک کپتان آفیلاس (Ophelas) تعینات تھا۔ ان وفود کو یہ

ہدایت کی گئی تھی کہ وہ یہ کہیں کہ آفیلاس کے مدد کے ذریعے کارتھیج کو تباہ کیا جا سکتا ہے، لیکن اگاتھوکلس کو صرف سسلی میں تحفظ درکار ہے اور اسے افریقا میں اقتدار سے کوئی دلچسپی نہیں، افریقا میں ان کی مشترکہ تمام فتوحات میں آفیلاس کا حصہ بھی ہوگا۔ اگاتھوکلس کی ان کوششوں سے متاثر ہوکر آفیلاس نے اپنی فوج کے ساتھ صحرا میں پیش قدمی کی، اور شدید مشکلات کے بعد وہ اگاتھوکلس کے ساتھ آ کر مل گیا۔ اگاتھوکلس نے موقعے پر ہی آفیلاس کو قتل کر دیا اور اس کی فوج کو خبردار کر دیا کہ ان کی سلامتی اور تحفظ صرف اسی صورت ممکن ہے کہ وہ اپنے سابقہ سپہ سالار کے قاتلوں کے خدمت گزار بن کر رہیں۔ پھر اس نے یوٹیکا (Utica) کا محاصرہ کر لیا اور غیر متوقع طور پر میدان جنگ میں تین سو افراد کو قیدی بنالیا جو اس کی محاصرے کی توپوں کے بالکل سامنے آ گئے تھے۔ اس لئے اہل یوٹیکا جنہوں نے اپنا دفاع کرنا تھا، اپنے ہی ہم وطنوں کو قتل کر دینے پر مجبور ہو گئے۔ اگرچہ وہ اس مہم میں کامیاب تھا لیکن وہ نہایت مشکل میں گرفتار تھا کیوں کہ اس کا بیٹا آرچاگاتھس (Archagathus) فوج میں بے چینی اور بے اطمینانی پیدا کر رہا تھا۔ لہٰذا وہ چپکے سے فرار ہو کر واپس سسلی چلا گیا لیکن فوج نے اس کے فرار سے غضب ناک ہوکر آرچاگاتھس اور اس کے ایک اور بیٹے، دونوں کو قتل کر دیا۔ اس واقعے کے باعث وہ اس قدر طیش اور غضب میں مبتلا ہو گیا کہ اس نے سائراکیوز کے ہر مرد، عورت اور بچے کو قتل کر دیا جس کا باغی فوج کے کسی سپاہی سے ذرا سا بھی تعلق تھا۔

سسلی میں کچھ دیر تک اس کا اقتدار اس نشیب و فراز میں مبتلا رہا۔ اس نے ایگسٹا (Aegesta) کو ساتھ لیا اور شہر کے تمام غریب مردوں کو موت کی نیند سلا دیا اور امیر لوگوں کو اس وقت تک اذیتوں کا نشانہ بنایا جب تک انہوں نے اپنی چھپائی ہوئی دولت کا پتہ نہ بتا دیا۔ اس نے نوجوان عورتوں اور بچوں کو بطور غلام بروٹی (Bruti) کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ اس کی گھریلو زندگی بھی مکمل طور پر خوشگوار نہ تھی۔ اس کی بیوی کے اس کے ایک بیٹے کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے، اس کے ایک پوتے نے دوسرے کو قتل کر دیا اور پھر ایک نوکر کو اکسایا کہ وہ دانتوں میں خلال کرنے والے تنکے کے ذریعے دادا کو زہر دیدے۔ جب اگاتھوکلس نے یہ محسوس کیا کہ اس کی موت اب قریب ہے تو اس نے آخری قدم کے طور پر سینٹ کے اراکین کو طلب کیا اور انہیں کہا کہ وہ اس کے پوتے سے بدلہ لیں۔ لیکن زہر

خوانی کے باعث اس کے مسوڑھے اس قدر کمزور ہو چکے تھے کہ وہ بولنے سے قاصر تھا۔ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، وہ اپنی چتا کی طرف بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ وہیں اس کی موت واقع ہوگئی۔ اس کا مال واسباب لوٹ لیا گیا اور ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ جمہوریت بحال ہوگئی تھی۔

دوبارہ تعمیر شدہ اٹلی کی صورت حال بھی قدیم یونان کے تقریباً برابر ہے لیکن وہاں پریشانی و بے چینی بہت زیادہ ہے۔ وہاں بھی طبقہ امراء پر مشتمل تجارتی ادارے تھے، قدیم یونان کے مانند ظلم وستم جاری تھا، جاگیردارانہ نظام رائج تھا، مزید چرچ کی مملوک بھی اسی رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔ اٹلی کے علاوہ پاپائے اعظم کا احترام کیا جاتا تھا لیکن اس کے بیٹوں کو یہ احترام وتوقیر حاصل نہ تھی۔ پاپائے اعظم کے ایک بیٹے سیزر بورجیا (Cesar Borgia) کے اقتدار کا انحصار حشمت ورعب اور جبر وآمریت پر تھا۔

سیزر بورجیا اور اس کا والد سکندر ششم (پاپائے اعظم 1492-1503 (Alexander VI دونوں نہ صرف اپنے کارناموں کے باعث بلکہ میکاولی سے متاثر ہونے کے باعث اہم ہیں۔ کریغٹن (Creighton) کے الفاظ کے مطابق ان کے عہد کا ایک واقعہ ان کے عہد کی تمام داستان بیان کر دے گا۔ کالونہ (Colonna) اور آرسینی (Orsini) اس کے ساتھ صدیوں سے نحوست کی مانند چمٹے ہوئے تھے۔ کالونہ پہلے ہی جا چکا تھا لیکن آرسینی ابھی موجود تھا۔ سکندر ششم نے ان کے ساتھ ایک معائدہ کیا اور ان کے سردار لاٹ پادری آرسینی کو ویٹکن (Vatican) میں آنے کی دعوت دی۔ لیکن جب سیزر نے یہ سنا کہ دور آرسینیوں کو دھوکے سے گرفتار کر لیا گیا ہے تو جیسے ہی لاٹ پادری آرسینی پاپائے اعظم کے پاس پہنچا، اسے گرفتار کر لیا گیا۔ آرسینی کی ماں نے اپنے بیٹے کو کھانا مہیا کرنے کے عوض پاپائے اعظم کو دو ہزار طلائی سکے پیش کئے اور اس کی بیوی نے تقدس مآب پاپائے اعظم کو ایک قیمتی موتی نذرانے میں دیا جس کی پاپائے اعظم کو شدید خواہش تھی۔ لیکن یہ سب بے سود رہا اور لاٹ پادری آرسینی قید خانے ہی میں مر گیا۔ کہا جاتا تھا کہ اسے سکندر ششم کے حکم سے زہریلی شراب پلائی گئی تھی۔ کریغٹن کے مندرجہ ذیل واقعے کے متعلق مندرجہ ذیل بیان حشمت ورعب کے اقتدار کی خصوصیت کو بخوبی ظاہر کر دیتا ہے۔

> ''یہ امر حیران کن ہے کہ اس دھوکے بازی پر قطعاً احتجاج اور واویلا نہیں ہوا اور یہ فریب کاری مکمل طور پر کامیاب رہی۔ لیکن اٹلی کی جعلی اور مصنوعی

سیاست میں ہر چیز کا انحصار اس کھیل میں شامل کھلاڑیوں کی مہارت پر تھا۔ خوش قسمت اطالوی سپاہیوں نے اپنا دفاع خود کیا لیکن جب انہیں خواہ دھوکے بازی کے ذریعے ہی سے ہٹایا گیا تو کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا۔ وہاں کوئی جماعت نہیں تھی، اور نہ ہی کسی کو دلچسپی تھی کہ آرسینی اور وائٹیلوزو (Vitellozoo) کو شکست ہو چکی ہے۔ اطالوی سپاہیوں کی فوجیں اس وقت تک خطرے کا باعث تھیں جب تک ان کے سپہ سالار موجود تھے، لیکن جب ان کے سپہ سالاروں کو ہٹا دیا گیا، سپاہی بکھر گئے اور وہ دوسرے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ اس معاملے کے حوالے سے اکثر افراد کی طرف سے سیزر کی طرف سے ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لینے کے عمل کو سراہا کیا گیا تھا۔ موجود اخلاقی حالت پر کسی غیض و غضب کا اظہار نہیں کیا گیا۔ اٹلی میں اکثر افراد نے میکاولی کے بارے سیزر کے اس بیان کو نہایت خوش دلی سے قبول کر لیا: ''ان لوگوں کو خوش کرنا بہت ہی اچھی بات ہے جنھوں نے خود کو دھوکہ بازی میں ماہر ثابت کیا ہے۔'' سیزر کی اس کامیابی سے اس کا کردار عیاں اور ظاہر ہو گیا۔''

قدیم یونان کے مانند، نئے اٹلی میں بھی ایک طرف تو اعلیٰ تہذیب موجود ہے اور دوسری طرف گھٹیا اخلاقیات پر مشتمل تہذیبی اقدار کا بھی دور دورہ ہے۔ یہ دونوں ادوار ایک عظیم ذہانت و فراست اور اعلیٰ درجے کی بدقماش روایت کا آئینہ دار ہیں۔ مزید برآں، شریف النفس اور بدمعاش افراد پر مشتمل دونوں طبقے لامحالہ طور پر ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ لیونارڈو (اطالوی مصور) نے سیزر بورجیا کے لئے قلعہ بنایا، سقراط کے کچھ شاگرد بدمعاش ترین افراد میں شامل تھے، افلاطون کے شاگرد اور پیروکار، سائرا کیوز میں شرمناک کاموں میں ملوث تھے، اور ارسطو نے ایک بدمعاش کی بھتیجی سے شادی کر لی تھی۔ ان دونوں ادوار کے دوران، فن، ادب اور فلسفہ تقریباً ایک سو پچاس برس تک ایک ساتھ پھلتے پھولتے رہے، اور پھر یہ تمام کچھ مغربی اور شمالی کم تہذیب یافتہ اور متحد اقوام کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گیا۔ ان دونوں صورتِ احوال میں، سیاسی آزادی کی تباہی کے باعث نہ صرف تہذیبی روایات مٹ گئیں، بلکہ تجارتی برتری بھی معدوم ہو گئی اور اس

تباہی و بربادی کے باعث افلاس اور غربت نے ڈیرہ جمالیا۔

حشمت و رعب کے اقتدار کی مدت عام طور پر مختصر ہوتی ہے اور اس کا اختتام، ایک عمومی اصول کے تحت، تین طریقوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ حشمت و رعب کے اقتدار کا اختتام غیر ملکی قبضے کے باعث ہوتا ہے جیسا کہ یونان اور ترکی میں ہوا جس کے متعلق ہم پہلے ہی گفتگو کر چکے ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ حشمت و رعب کا یہ اقتدار، ایک نرم آمریت میں تبدیل ہو جاتا ہے جو جلد ہی ایک روایتی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس صورت حال کی سب سے بہترین اور مشہور مثال سلطنت آگسٹس کی ہے اور یہ صورت حال میریس (Marius) سے لے کر انٹونی کی شکست تک مشتمل خانہ جنگیوں کی مدت کے بعد وقوع پذیر ہوئی۔ حشمت و رعب کے اقتدار کے اختتام کی تیسری صورت، اگر الفاظ کو وسیع مفہوم میں استعمال کیا جائے تو ایک نئے مذہب کا ارتقاء ہے۔ اس صورت کی ایک بہترین اور شاندار مثال محمدؐ کی ہے کہ وہ عرب کے سابقہ تمام جنگجو قبائل کو متحد کر کے ایک نئے مذہب کے تحت لے آئے۔ ممکن ہے کہ جنگ عظیم کے بعد بین الاقوامی تعلقات کے حوالے سے حشمت و رعب کے اقتدار کا دور یورپ بھر میں کمیونزم کی آمد کے باعث ختم ہو گیا ہوتا بشرطیکہ روس کے پاس خوراک کے فالتو اور وافر ذخائر ہوتے۔

جب اقتدار و اختیار، رعب و حشمت پر مبنی ہوتا ہے تو پھر نہ صرف بین الاقوامی طور پر بلکہ انفرادی ریاستوں کی مقامی حکومتوں کے حوالے سے بھی اقتدار و اختیار کے حصول کا طریقہ کسی بھی اور طریقے کی نسبت کہیں زیادہ بے رحمانہ اور سنگدلانہ ہوتا ہے۔ اس موضوع کے حوالے سے میکاولی کے نزدیک صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ اس ضمن میں مثال کے طور پر سیزر بورجیا کا قابل تعریف احوال ملاحظہ فرمایئے کہ کیسے اس نے سکندر ششم کی وفات کے بعد خود کو محفوظ رکھنے کے لئے کیا کیا تراکیب استعمال کیں:

> "اس نے چار طریقوں کے ذریعے عملی قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا—— سب سے پہلے تو اس نے ان نوابوں کے خاندانوں کو تہ تیغ کر دیا جنہیں اس نے تاخت و تاراج کر دیا تھا تاکہ پاپائے اعظم کے سامنے کوئی عذر یا بہانہ موجود نہ رہے۔ پھر اس نے شرفائے روم کی حمایت حاصل کی تاکہ ان کی مدد اور معاونت کے ذریعے پاپائے اعظم کو کچل سکے۔ تیسرا عملی قدم

اس نے یہ اٹھایا کہ عوام کو اپنے ساتھ کر لیا۔ پھر اس نے پاپائے اعظم کی موت سے قبل اس قدر زیادہ اختیارات حاصل کر لئے کہ وہ اپنے طور پر پہلے حملے کا دفاع کر سکے۔ سکندر کی وفات کے موقع پر اس نے ان چاروں میں سے تین مقاصد حاصل کر لئے اور صرف چند امراء ہی بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔"

مندرجہ بالا چار طریقوں میں سے دوسرا، تیسرا اور چوتھا طریقہ کسی بھی وقت استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن ایک باقاعدہ حکومت کے دور میں پہلے طریقے کا استعمال رائے عامہ کو صدمہ پہنچا سکتا ہے۔ ایک برطانوی وزیراعظم، حزب مخالف کے قائد کو قتل کروا کر اپنے منصب کو مستحکم کرنے کی امید نہیں کر سکتا لیکن جہاں حشمت و رعب کے اقتدار کا دور دورہ ہو، وہاں یہ اخلاقی حدود و قیود اور پابندیاں بے معنی اور غیر فعال ہو جاتی ہیں۔

اقتدار و اختیار، اس وقت حشمت و رعب پر مبنی ہوتا ہے جب عوام کسی اور وجہ سے نہیں بلکہ اس کے جبر و استبداد کے باعث اس کا احترام کرنے پر مجبور ہوں۔ اس لئے روایتی قسم کا اقتدار اس وقت حشمت و رعب میں ڈھل جاتا ہے جب روایات و اقدار کی اہمیت ناقابلِ قبول ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آزادیٔ رائے اور شدید تنقید کا دور، حشمت و رعب کے اقتدار کے دور میں تبدیل ہونے لگتا ہے یہی صورت حال، یونان اور پھر اٹلی میں بھی واقع ہوئی۔ حشمت و رعب کے اقتدار کے متعلق بالکل صحیح اور درست بات افلاطون نے اپنی کتاب "عوامی جمہوریہ" (Republic) میں تھراسی میشوس کے منہ سے کہلوائی جو سقراط سے محض اس لئے ناراض ہو گیا تھا کہ اس نے انصاف کی نسلی بنیادوں پر تعریف مہیا کرنے کی ایک اچھی کوشش کی تھی۔ تھراسی میشوس کہتا ہے کہ میرا نظریہ یہ ہے کہ "انصاف تو محض جابر اور آمر افراد کی دلچسپی کی چیز ہے۔" وہ مزید کہتا ہے:

"اپنے اپنے مفاد کے مطابق ہر حکومت نے اصول و قوانین وضع کئے ہوتے ہیں۔ جمہوری حکومت، جمہوری قوانین بناتی ہے، مطلق العنان حکمران ظالمانہ قوانین بناتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اب اس طریقے کے ذریعے ہر حکومت یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اس کے اپنے مفاد میں تیار کئے جانے والے قوانین دراصل عوام کے لئے ہیں، اور خلاف ورزی کی صورت

میں انہیں لاقانونیت اور انصاف سے عاری رویے کا مرتکب ٹھہراتے ہوئے ان کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔ اس لئے جناب محترم قارئین، میرا مطلب یہ ہے کہ ہر جگہ ایک ہی چیز یعنی قائم شدہ حکومت کا مفاد ہی ''انصاف'' ہوتا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ ''طاقت وقوت'' ہر جگہ حکومت کا ساتھ دیتی ہے۔ لہٰذا، ایک معقول استدلالی بحث کا نتیجہ وہی ایک چیز ہے، یعنی ''ہر جگہ طاقتور افراد کا مفاد' انصاف ہوتا ہے۔''

جب کبھی اور جہاں کہیں بھی یہ اصول عام طور پر رائج ہو جاتا ہے، تو حکمران محض اس لئے اخلاقی اقدار سے روگردانی کرنے لگتے ہیں کہ جو کچھ وہ اقدامات حاصل کرنے کے لئے اٹھاتے ہیں، یہ اقدامات صرف ان لوگوں کے لئے پریشان کن ثابت ہوتے ہیں جو ان سے براہ راست متاثر ہوتے ہیں۔ اسی طرح باغی بھی محض اس لئے اپنی مخالفانہ کارروائیوں سے باز رہتے ہیں کہ انہیں ناکامی کا خدشہ ہوتا ہے۔ اگر وہ بے رحمانہ ذرائع کے ذریعے کامیاب ہو سکتے ہیں تو پھر انہیں چنداں خدشہ نہیں ہوتا کہ ان کا یہ ظلم وستم انہیں غیر مقبول بنا دے گا۔

تھیراسی میشوس کا یہ نظریہ جہاں جہاں بھی قبول عام کا درجہ حاصل کر لیتا ہے، وہاں کے منظم اور باقاعدہ معاشرے کو حکومت کے پاس موجود براہِ راست مادی قوت وطاقت کے ماتحت بنا دیتا ہے۔ یہ صورت حال فوجی ظلم وستم کی موجودگی اور وقوع کو ناگزیر بنا دیتی ہے۔ دوسری تمام قسم کی حکومتیں صرف اس صورت میں مستحکم رہ سکتی ہیں کہ جہاں یہ تصور اور نظریہ وسیع پیمانے پر رائج ہو کہ رائج الوقت اقتدار واختیار کی موجودہ تقسیم کی توقیر وتکریم کی جانی چاہیے۔ اس ضمن میں جو نظریات بھی کامیاب ہوئے، عام طور پر وہ اس لائق نہیں تھے کہ علمی اور استدلالی دلائل کے آگے ٹھہر سکتے۔

رائے عامہ کی رضامندی اور منظوری کے ذریعے بعض اوقات اقتدار واختیار، شاہی خاندانوں، طبقہ امراء، مطلق العنان افراد، خواتین کی بجائے مردوں اور سیاہ کی بجائے سفید فام افراد کے لئے مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ لیکن جب علم اور ذہانت اور تعلیمی شعور عوام میں پھیل جاتا ہے، تو وہ اس قسم کی استثنائی صورت حال کو مسترد کر دیتے ہیں، اور پھر اربابِ اقتدار واختیار کے پاس حشمت و رعب کے اقتدار پر انحصار کرنے کے علاوہ کوئی چارا نہیں رہتا۔ اگر ایک باقاعدہ اور قانونی حکومت رائے عامہ کو اپنا مطیع بنانا چاہتی ہے، تو پھر ایک ایسا طریقہ تلاش کرنا ہوگا کہ عوام کی وہ اکثریت پیدا

کی جائے جو تھیر اسی میثوس کے نظریے کے علاوہ کسی اور نظریے کو قبول کر لے۔

حکومت قائم کرنے کے لئے کسی مافوق الفطرت طریقے کی بجائے رائے عامہ کی حمایت حاصل کرنے کے متعلق طریقوں کا ذکر میں آئندہ ابواب میں کروں گا، لیکن اس موقع پر ہر چند ابتدائی کلمات کا بیان مناسب معلوم ہوتا ہے۔ پہلے تو یہ کہ یہ مسئلہ ناگزیر طور پر ناقابل حل نہیں ہے کیونکہ ریاست ہائے متحدہ امریکا میں یہی مسئلہ حل کیا جاچکا ہے (لیکن برطانیہ کے ضمن میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ یہ مسئلہ حل ہو چکا ہے کیونکہ برطانیہ کے ملکی استحکام کے حوالے سے تاج برطانیہ کا احترام ایک ناگزیر عنصر کی حیثیت سے لازم ہے)۔ دوسرے یہ کہ ایک باقاعدہ اور منظم حکومت کے فوائد عمومی طور پر محسوس کئے جانے چاہئیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ان ذہین اور ہوشیار افراد کے لئے آئینی لحاظ سے ایسے مواقع دستیاب ہونے چاہئیں جن کے ذریعے وہ دولت مند یا بااختیار بن سکیں۔ جب عوام کے ایک خاص طبقے کو ان کی صلاحیت، ذہانت اور فطانت کے باوجود ان کے پسندیدہ پیشوں کو اختیار کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا، تو پھر ان میں بے اطمینانی پیدا ہو جاتی ہے جو پھر جلد یا بدیر، بغاوت پر منتج ہوتی ہے۔ تیسرے یہ کہ ایک سماجی نظام کے قیام کی ضرورت ہو گی تا کہ سماجی ناانصافی کے بجائے دانستہ طور پر ایک ایسا منضبط اور منصفانہ سماجی نظام قائم ہو جو وسیع پیمانے پر مخالفت کا باعث نہ بن سکے۔ اگر یہ نظام کچھ وقت کے لئے کامیاب ہو جاتا ہے، جلد ہی روایتی نوعیت اختیار کر لے گا اور اس قدر طاقت اور اختیار حاصل کرے گا جو ایک روایتی اقتدار و اختیار کا خاصہ ہوتا ہے۔

ایک جدید قاری کے لئے روسو (Rousseau)[14] کا ''عمرانی معاہدہ'' بہت زیادہ انقلابی معلوم نہیں ہوتا اور یہ کہنا مشکل ہے کہ مختلف حکومتوں کے لئے اس قدر پریشان کن کیوں تھا۔ میرے نزدیک اس کی اہم اور بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ حکومتی اقتدار کے لئے بنیاد کے طور پر ایک ایسے نظام کے قیام کا تقاضا کرتا ہے جو مافوق الفطرت شہنشاہی نظام کے بجائے استدلالی اور منطقی بنیادوں پر مبنی ہو۔ روسو کے نظریے کے دنیا پر اثرات، اس شکل کو عیاں کرتے ہیں کہ افراد حکومت کی بنیاد اور اساس کے طور پر کسی مافوق الفطرت عنصر کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ شاید یہ صورت حال اس وقت ممکن نہ ہو جب اس مافوق الفطرت عنصر کا اچانک خاتمہ ہو جائے: یعنی ابتدائی تربیت کے لئے رضا کارانہ تعاون کی مشق اور عادت کا ہونا ضروری ہے۔ سب سے بڑی

اور اہم مشکل یہ ہے کہ سماجی نظام کے قیام کے لئے قانون کا احترام لازمی اور ضروری ہے لیکن یہ سب کچھ ایک روایتی حکومت کے تحت ناممکن ہے جسے عوام کی مزید حمایت حاصل نہیں رہتی اور دورانِ انقلاب اسے ہر قیمت پر مسترد ہونا ہی ہوتا ہے۔ لیکن، اگرچہ اس مسئلے کا حل بہت ہی مشکل ہے لیکن اس مسئلے کو لازمی طور پر ایک منضبط اور باقاعدہ حکومت کی موجودگی ہی میں حل کر لینا چاہئے جو آزادیٔ رائے کے عین مطابق ہو۔

اس مسئلے کی نوعیت کو بعض اوقات غلط طور پر سمجھا جاتا ہے۔ تصور ہی تصور میں، حکومت کی ایک ایسی قسم کی تلاش مناسب معلوم نہیں ہوتی جو کسی نظریے کے بانی کے نزدیک انقلاب کے لئے معقول وجہ اور مقصد تصور نہ ہو، لہٰذا حکومت کی ایک ایسی قسم کی تلاش کی ضرورت ہے جسے عملی طور پر قیام پذیر کیا جا سکے، اور پھر، اگر یہ قائم ہو جاتی ہے، تو پھر اسے کسی انقلاب کو روکنے یا کچلنے کے لئے مناسب حمایت اور اختیار حاصل ہو جائے گا۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو اعلیٰ مدبرانہ رویے اور طرزِ عمل کا متقاضی ہے جس کے تحت متعلقہ عوام میں موجود تمام نظریات اور تعصبات پیش نظر رکھنے چاہئیں۔ ایسے افراد بھی موجود ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی جماعت یا گروہ کسی نہ کسی حد تک ایک دفعہ ریاستی نظام پر قبضہ کر لیتا ہے تو پھر منظم تشہیر کے ذریعے عوام کی حمایت اور رضامندی حاصل کی جا سکتی ہے۔ بہرحال، یہ نظریہ واضح اور نمایاں حدود و قیود میں مقید ہے۔ حالیہ ادوار میں حکومت کی طرف سے منظم تشہیری مہم، عوامی احساسات کے مقابلے میں بے بس ثابت ہوتی ہے جیسے ہندوستان (1921 سے پہلے) اور آئرلینڈ میں صورت حال واقع ہوئی۔ منظم تشہیری مہم، طاقت ور مذہبی عقائد کے مقابلے میں مشکل محسوس کرتی ہے اور پھر یہ کہ یہ منظم تشہیری مہم، اکثریت کے مفاد کے سامنے کس طرح اور کتنی دیر تک اپنا وجود برقرار رکھ سکتی ہے۔ بہرحال، اس امر کا اعتراف کر لینا چاہئے کہ جب حکومت کی طرف سے یہ منظم تشہیری مہم، باقاعدہ انداز میں بتدریج چلائی جاتی ہے تو پھر حکومت کے لئے عوام کی حمایت اور رضامندی حاصل کرنے کا مسئلہ بہت ہی آسان ہو جاتا ہے۔ اس مرحلے پر ہمارے ذہن میں جو سوالات پیدا ہو رہے ہیں، ان پر مفصل انداز میں بعد ازاں غور کیا جائے گا، فی الحال تو انہیں صرف اپنے ذہن میں رکھ لینا چاہئے۔

میں نے اس وقت صرف سیاسی اقتدار و اختیار کے حوالے سے بات کی ہے، لیکن معاشی اختیار و اقتدار کے حوالے سے رعب و حشمت کا اقتدار بھی کم از کم اسی قدر ہی اہم نوعیت کا حامل

ہے۔ کارل مارکس کے نزدیک، مستقبل کے سماجی معاشرے کے سوا، تمام معاشی معاملات مکمل طور پر رعب و حشمت کے اقتدار کے تحت ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس، ایک انگریز فلسفی بینتھم (Bentham) اور ایک مورخ ایلی ہیلیوی (Elie Halevy) نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر وسیع مفہوم کے تناظر میں دیکھا جائے تو ایک شخص کو اس کی مزدوری کے عوض جو اجرت دی جاتی ہے، کیا وہ خود یہ سمجھتا ہے کہ کیا اس کا مزدوری کا یہ عوضانہ جائز اور صحیح ہے۔ مجھے خود بھی یقین ہے کہ مصنفوں کے حوالے سے یہ نظریہ درست اور صحیح نہیں ہے۔ میرے اپنے معاملے میں، میں نے ہمیشہ یہی محسوس کیا ہے کہ جو کتاب میں تصنیف کرتا ہوں، اس کی میرے نزدیک اہمیت کہیں زیادہ ہوتی ہے، اور اس کا معاوضہ مجھے اس سے کہیں کم ملتا ہے۔ اور اگر کامیاب کاروباری افراد واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی محنت، ان کی کامیابی کے برابر ہے، تو پھر وہ اس سے کہیں زیادہ احمق ہوتے ہیں جس قدر نظر آتے ہیں۔ بہر حال، ہیلیوی (Halevy) کے نظریے میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور موجود ہے۔

ایک مستحکم معاشرے میں، یہ ضروری ہے کہ وہاں کوئی ایسا خاص طبقہ نہ ہو جو ناانصافی کے شدید احساس سے مغلوب ہو۔ لہٰذا یہ سمجھا جاتا ہے کہ جب ایک معاشرے میں بڑے پیمانے پر معاشی عدم اطمینان موجود نہ ہو، تو پھر اکثر افراد یہ نہیں سمجھتے کہ انہیں ان کی محنت کا کم معاوضہ ادا کیا جا رہا ہے۔ غیر ترقی یافتہ معاشروں یا ممالک میں جہاں ایک شخص کی زندگی کا معیار معاوضے کی بجائے منصب پر ہوتا ہے، وہاں وہ عمومی طور پر اپنے معاوضے کو منصفانہ ہی تصور کرتا ہے۔ لیکن جب ہیلیوی (Halevy) کا نظریہ "وجہ اور اثر" کے تصور کو منتشر کر دیتا ہے، تو پھر وہی شخص اپنے موجودہ معاوضے کو انصاف پر محمول نہیں کرتا۔ اس صورت حال میں معاشی طاقت و اختیار، روایتی نوعیت میں ڈھل جاتی ہے اور صرف اس وقت آمریت اور استبدادیت میں تبدیل ہوتی ہے جب پرانے نظام کو تہ و بالا کیا جاتا ہے، یا پھر کسی نہ کسی وجہ سے تنقید کا نشانہ بنتی ہے۔

صنعتی نظام کے ابتدائی دور میں اجرت کی ادائیگی کا کوئی باقاعدہ طریقہ کار موجود نہ تھا، لیکن ملازمین بھی ابھی تک منظم نہ ہوئے تھے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ آجر اور اجیر کے درمیان تعلقات رعب و حشمت کی بنیاد پر قائم ہو گئے لیکن ان تعلقات کی حدود ریاستی احکامات کے تحت مقرر ہوئی تھیں اور پہلے پہل تو یہ حدود و قیود بہت زیادہ فراخ اور وسیع تھیں۔ روایتی ماہرین معاشیات کا نظریہ یہ تھا کہ غیر ہنرمند افراد کا معاوضہ زندگی کی بسر اوقات کی سطح سے کہیں کم

ہونا چاہئے، لیکن وہ اس حقیقت کا ادراک کرنے سے قاصر رہے کہ اس امر کا انحصار سیاسی قوت و اختیار اور مشترکہ مفاد میں سے معاوضہ وصول کرنے والے افراد کے اخراج پر تھا۔ مارکس نے اس مسئلے پر قوت و اختیار کے ایک پہلو کے لحاظ سے نظر ڈالی لیکن میرے خیال کے مطابق اس نے معاشی قوت کے مقابلے میں سیاسی قوت کو کم اہم سمجھا۔ مزدوروں کی سوداکاری انجمنوں، جنہوں نے مزدوروں کی سودار کاری کی قوت میں ناقابل یقین اضافہ کیا، کو صرف اسی صورت میں کچلا جا سکتا ہے کہ اگر یہ مزدور سیاسی قوت و اختیار میں حصہ دار نہ ہوں۔ انگلستان میں بے شمار قانونی فیصلے انہیں اپاہج کر ڈالتے لیکن اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہئے کہ 1868 سے شہری کارکنوں کو حقِ رائے دہندگی حاصل ہو چکا تھا۔ مزدوروں کی سودار کاری کی انجمنوں کی موجودگی میں، معاوضہ کے تعین کا انحصار آجروں کی مطلق العنانی پر نہیں رہا تھا، لیکن ابتدائی زمانے میں اشیاء کی خرید و فروخت کے معاملے میں جبر و استبداد کی قوت بدرجہ اتم موجود تھی۔

معاشی معاملات میں حشمت و رعب کا کردار اس لحاظ سے بہت زیادہ تھا جیسا کہ مارکس کے اثرات سے فعال ہونے سے پہلے تصور کیا جاتا تھا۔ بعض معاملات میں یہ اصول نہایت ہی واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ مرکزی شاہراہ پر ایک شکار (مسافر) سے وہاں تعینات حکومتی افسر کی جانب سے مالِ غنیمت (رشوت) کی وصولی، یا ایک مفتوحہ قوم سے فاتح کو تاوان کی ادائیگی، یہ سب مثالیں حشمت و رعب کے اقتدار کے معیار کے بالکل عین مطابق ہیں۔ اسی طرح غلامی بھی حشمت و رعب کے اقتدار کی ایک قسم ہے جب تک کہ وہ طویل عرصے تک غلام رہنے کے باوجود اس غلامی پر رضامند اور آمادہ نہیں ہوتا۔ اگر کسی شخص کی آمادگی کے بغیر دھمکیوں کے ذریعے اس سے رقم ہتھیائی جاتی ہے تو اسے بھی رعب و حشمت کے اقتدار کا شاخسانہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ناراضگی اور طیش وغصہ، دو قسم کے معاملات میں موجود ہوتا ہے۔ جہاں رقم کی ادائیگی ایک معمول نہ ہو، اور دوسرا، کسی تبدیلی کے باعث جو چیز معمول ہو، ناجائز تصور کی جاتی ہے۔ ماضی کے ادوار میں شوہر کو اپنی بیوی کے مال و اسباب اور جائیداد پر مکمل تصرف ہوتا تھا، لیکن حقوقِ نسواں کی تحریک کے باعث اس معمول میں تبدیلی واقع ہو گئی جس کے باعث قانون میں بھی تبدیلی رونما ہو گئی۔

اسی طرح گزشتہ ادوار میں کام کرنے کے دوران ملازمین کو اگر کوئی حادثہ پیش آ جاتا تو مالکان اس کے ذمہ دار نہیں ہوتے تھے، یہاں بھی ملازمین کی کوششوں کے باعث قانون میں تبدیلی کر دی

گئی۔اس قسم کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

ایک سوشلسٹ مزدور یہ محسوس کرسکتا ہے کہ اس کی آمدن اس کے آجر سے کم ہے، اس معاملے میں یہ رعب و حشمت کا اقتدار اور قوت ہی ہوتی ہے جو اسی معاوضے پر قناعت کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ معاشی غیر مساوات کا پرانا اور قدیم نظام روایتی نوعیت کا حامل ہے اور بذات خود اس کی وجہ سے اس وقت تک کاریگروں اور مزدوروں میں ناراضامندی اور اشتعال پیدا نہیں ہوتا جب تک اس معمول کے مخالفین اس معمول کے خلاف اٹھ کھڑے نہیں ہوتے۔ اس لئے ہر سوشلسٹ انداز فکر میں اضافے کے باعث سرمایہ دارانہ قوت و اختیار مزید جبر واستبداد کا روپ دھار لیتی ہے اور اس صورت حال کی وضاحت مذہب مخالف اور مسیحی کیتھولک طبقے کے اقتدار واختیار کی مثال کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ رائے عامہ کی رضامندی اور حمایت کی بنیاد پر قائم اقتدار کے برعکس حشمت ورعب کے اقتدار میں کچھ برائیاں موروثی طور پر موجود ہوتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ ہر سوشلسٹ انداز فکر اور رویے میں تیزی کے باعث سرمایہ دارانہ قوت بہت زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ اس ضمن میں ایک استثنائی صورت یہ ہے کہ اس قوت کا بے رحمانہ اور سنگدلانہ رویہ اور طرز عمل کس خوف کے باعث معدوم اور کم ہوسکتا ہے۔ اگر ایک معاشرہ کارل مارکس کے فراہم کردہ معاشی ڈھانچے کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے، جہاں کچھ آجیر سوشلسٹ نظام کے حامی ہوتے ہیں اور کچھ آجیر سرمایہ داری نظام کے حامی ہوتے ہیں، تو ان دونوں میں جیتنے والا طبقہ خواہ کوئی بھی ہو، اپنے مخالفین کے خلاف حشمت ورعب کے اقتدار کو استعمال کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مارکس کی پیش گوئی کے مطابق یہ صورت حال بہت ہی خطرناک اہمیت کی حامل ہوگی۔ اس صورت حال کو کارل مارکس کے کہنے کے مطابق رونما ہونے میں اس کے پیروکاروں کی جانب سے منظم تشہیری مہم بہر حال کامیاب ثابت ہوتی ہے۔

انسانی تاریخ میں بہت سے نفرت انگیز اور ناگوار واقعات و حالات کا تعلق حشمت و رعب کے اقتدار کے ساتھ موجود ہے، یہ واقعات و حالات نہ صرف جنگوں کے باعث پیدا ہوئے بلکہ دیگر اقسام کی خوفناک وجوہات بھی ان نفرت انگیز اور ناگوار حالات و واقعات کی رونمائی کا باعث ثابت ہوئیں۔ غلامی اور غلاموں کی تجارت، کانگو کا استحصال، ابتدائی دور کے صنعتکاروں کی دہشت، بچوں پر ظلم وستم وزیادتی، عدالتی اذیت رسانی، مجرمانہ قانون، قید خانے، کام کرنے کے

مقامات، مذہبی آزادی، یہودیوں کا آمرانہ رویہ اور سلوک، مطلق العنان حکمرانوں کے بے رحمانہ اقدامات، عہد حاضر میں جرمنی اور روس میں سیاسی مخالفین کے خلاف نا قابل یقین ظلم وستم ــــ یہ سب واقعات، بے بس افراد کے خلاف حشمت ورعب کے اقتدار کے استعمال کی مثالیں ہیں۔

مزید برآں، بے انصافی پر مبنی قوت واختیار کی بے شمار اقسام، جواب بہت حد تک روایتی اقتدار میں ڈھل چکی ہیں، کسی زمانے میں جبر واستبداد کی بنیاد پر قائم قوت واختیار کی حکومتیں سمجھی جاتی تھیں۔ مسیحی بیویاں، سینٹ پال کے فرمان کے مطابق کئی صدیوں تک اپنے شوہروں کی اطاعت گزار رہیں، لیکن جیسن (Jason) اور میڈائی (Madia) کی داستان، ان مشکلات کو واضح طور پر عیاں کر دیتی ہے، جو شوہروں کو، بیویوں کی طرف سے سینٹ پال کے فرمان کی عمومی قبولیت سے قبل برداشت کرنی پڑ رہی تھیں۔

کسی معاشرے یا ملک میں اقتدار واختیار کا وجود ناگزیر ہے، خواہ یہ اقتدار حکومتی سطح پر موجود ہو، یا پھر یہ اقتدار منتشر اور مبہم جو گروہوں کے باعث قائم ہو۔ حتیٰ کہ کسی ملک یا معاشرے میں حشمت ورعب کے اقتدار کی موجودگی (محض اقتدار واختیار کی موجودگی کی ناگزیر ضرورت کے تحت) بھی ضروری ہے، اور یہ اقتدار واختیار اس وقت تک قائم رہنے کا جواز موجود ہے جب تک حکومت کے خلاف باغیانہ کارروائیاں بند نہیں ہوتیں، اور یا پھر معمولی جرائم کا سلسلہ رک نہیں جاتا۔ لیکن اگر کسی ملک اور معاشرے میں کسی باقاعدہ نظام کی غیر موجودگی کے باعث تباہی و بربادی کا سامنا متوقع ہو تو پھر مختصر مدت کے لئے حشمت ورعب کے اقتدار کی موجودگی ممکن ہو سکتی ہے۔ اگر کسی ملک پر معاشرے میں پھیلی ہوئی بے شمار برائیوں اور دہشت ناک اذیت ناکیوں کے باعث حشمت ورعب کے اقتدار کا نفاذ ناگزیر ہو جائے تو اسے قانونی روایتی حد بندیوں میں مقید رکھنا چاہئے، اور نہایت غور وفکر اور احتیاط کے بعد اس کا استعمال کرنا چاہئے اور اس کا انتظام و انصرام ان افراد کو تفویض کرنا چاہئے جو عوام کے مفادات پر نہایت گہری نظر رکھتے ہوں۔

میرا نہیں خیال کہ یہ سب کچھ بہت آسان ہے۔ اس صورت حال میں ایک امر کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ اس دوران کسی دوسرے ملک کے ساتھ جنگ واقع نہ ہو جائے کیونکہ جنگ کا وقوع، حشمت ورعب کے اقتدار کا ایک معمول اور شاخسانہ ہے۔ حشمت ورعب کے اقتدار کے باعث دنیا ان نا قابل برداشت ظلم وستم سے محفوظ ہو جاتی ہے جن کے باعث بغاوت کے جراثیم

ابھرتے ہیں۔اس قسم کے اقتدار کے باعث دنیا بھر میں معیار زندگی بلند ہوتا ہے، خاص طور پر ہندوستان، چین اور جاپان میں یہ صورت حال بدرجہ اتم موجود رہی، اور یہ ممالک ریاست ہائے امریکہ میں موجود معیار زندگی کی اس سطح کے برابر پہنچ گئے جو کساد بازاری سے قبل موجود تھی۔ حشمت و رعب کے اقتدار کے تحت چند اداروں کا قیام عمل میں آتا ہے جیسے روم میں کسی مخصوص کام کے لئے افراد منتخب کئے جاتے تھے جو نہ صرف مکمل طور پر عوام کے لئے ہوتے تھے بلکہ ہر اس طبقے کے لئے ہوتے تھے جس پر ظلم و ستم جائز سمجھا جاتا تھا، مثلاً اقلیتیں اور مجرم وغیرہ —— اور سب سے بڑھ کر، اس عہد اقتدار میں رائے عامہ کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو جاتا ہے جو عام صورت حال پر گہری نظر رکھتا ہے، جو حالات کی بغور نگرانی کے ساتھ ساتھ حقائق کو عیاں کرنے کے مواقع سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے۔

چند افراد یا افراد پر مشتمل گروہ میں موجود خصوصیات پر اعتماد اور بھروسے کا اظہار بے سود اور بے فائدہ ہے۔ بہت عرصہ پہلے ایک فلسفی بادشاہ کا تصور ایک لایعنی خواب کی حیثیت سے مسترد کر دیا گیا تھا، لیکن اگرچہ ایک فلسفی جماعت اسی معیار کی حامل تھی، لیکن ایک نئی دریافت کی حیثیت سے اس کی پذیرائی کی گئی تھی۔ کسی اقلیتی جماعت یا کسی اور مختصر و آسان طریقے کے ذریعے غیر ذمہ دارانہ اور بے قاعدہ حکومت میں اقتدار و اختیار کے مسئلے کا حقیقی حل تلاش نہیں کیا جا سکتا لیکن اس معاملے پر مزید بحث و گفتگو، آئندہ ابواب کے لئے چھوڑ دینی چاہیے۔

حوالہ جات

1- البی جین (Albegene): مسیحیوں کا ایک ملحدانہ فرقہ۔

2- ہیمورک (Hemoric): یونان کے عظیم اندھے شاعر ہومر (Homer) آٹھویں صدی کا دور۔

3- میڈیکی (Medici): فلورنس کا معزز خاندان: شہر کے حکمران (1434)

4- قدیم یونانی تہذیب کا بہترین دور جو پہلی اولمپک کھیلوں 776BC سے شروع ہو کر

سکندر اعظم کی وفات 323BC تک جاری رہا۔

5- کارتھیج (Carthage): شمالی افریقہ کی ایک قدیم بندرگاہ۔

6- سائرا کیوز (Syracuse): یونان کا ایک بڑا شہر۔

7- Dionysius the Elder

8- سولون (Solon): چھٹی صدی کے اوائل (قبل مسیح) میں یہ شخص ایتھنز کا ایک مدبر سیاستدان اور شاعر تھا۔

9- اگاتھوکلس (Agathocles): سکندر اعظم کا ہم عصر جابر حکمران۔

10- سیرس (Ceres)

11- ڈائی ڈورس (Diodorus)

12- مولوش (Moloch): قدیم یونان میں قربانی کا ایک دیوتا۔

13- Ptolemy (بطلیموس) 100-170AD: اسکندریہ، مصر کا ماہر فلکیات اور جغرافیہ دان۔

14- روسو (Rousseau): فرانسیسی سماجی فلسفی اور مصنف (1712-78)

ساتواں باب

انقلابی اقتدار

ہم نے یہ مشاہدہ کیا کہ ایک روایتی نظام دو طریقوں کے ذریعے منتشر ہو سکتا اور بکھر سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جن عقائد اور انداز فکر پر پرانا نظام قائم تھا، صرف شکوک وشبہات ہی پیدا کریں۔ اس حالت میں سماجی وابستگی اور وفاداری صرف حشمت و رعب کے اقتدار کے اطلاق و نفاذ کے باعث ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔ یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نئے انداز فکر پر مشتمل ایک نیا عقیدہ اور نظریہ عوام پر زیادہ سے زیادہ غلبہ حاصل کر لیتا ہے، اور پھر بالآخر اسی قدر توانا اور طاقت ور ہو جاتا ہے کہ نیا انداز فکر اور نظریہ پرانے اور ناکارہ سمجھے جانے والے نظام کی جگہ لے کر ایک متبادل حکومتی نظام کے طور پر سامنے آجاتا ہے۔ اس صورت حال میں نیا انقلابی نظام ان خصوصیات اور خوبیوں کا حامل ہوتا ہے جو روایتی نظام اقتدار اور حشمت و رعب کے اقتدار، دونوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر یہ انقلابی نظام اقتدار کامیاب ہو جاتا ہے، تو پھر یہ جلد ہی ایک روایتی نظام اقتدار میں ڈھل جاتا ہے۔ مزید برآں، یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر یہ انقلابی جدوجہد شدید اور طویل ہو، اکثر اپنے اصل مقصد سے ہٹ کر حشمت و رعب کے اقتدار کی جدوجہد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بہر حال، ایک نئے عقیدے اور انداز فکر کے ساتھ وفاداریاں اور وابستگیاں نفسیاتی طور پر حریصانہ لحاظ سے بہت ہی زیادہ مختلف ہیں اور ان کے اثرات زیادہ اہمیت اور زیادہ استقلال کے حوالے سے مناسب اور موزوں ہوتے ہیں۔

میں اس وقت چار مثالوں کے ذریعے انقلابی نظام اقتدار کو مفصل طور پر بیان کروں گا، یعنی

1- ابتدائی دور کی مسیحیت

2- اصلاحی تحریک[1]

3- فرانسیسی انقلاب اور قوم پرستی

4- سوشلزم اور روسی انقلاب

1- ابتدائی دور کی مسیحیت

مسیحیت نے نظام اقتدار اور سماجی ڈھانچے پر کیا اثرات مرتب کیے؟ اس وقت یہی موضوع میرے زیر بحث ہے۔ مزید برآں مسیحیت (مذہب) کی ذاتی نوعیت کا اس بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اپنے ابتدائی دور میں مسیحیت کا سیاست سے قطعی کوئی تعلق نہ تھا۔ ہمارے دور میں مسیحیت کی اس ابتدائی اور قدیم نوعیت وشکل کی بہترین مثال ''کرسٹاڈیلفین''[2] (Christadelphain) ہیں جن کے نزدیک اس دنیا کا خاتمہ قریب ہی ہے اور وہ اس ضمن میں کسی لادینی عنصر پر یقین نہیں رکھتے۔ بہرحال، اس قسم کا انداز فکر اور نقطہ نظر ایک چھوٹے سے فرقے ہی کے لئے قابل قبول اور ممکن ہے۔ جیسے جیسے مسیحیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور کلیسا کو بھی زیادہ قوت واختیار حاصل ہوا، تو پھر کلیسا (مذہب) کی طرف سے ریاست کو اپنے زیر تسلط رکھنے کی خواہش کا پیدا ہونا ناگزیر عمل تھا۔ ڈائیوکلیٹین[3] (Diocletain) کو دی جانے والی اذیتوں اور اس پر کئے جانے والے ظلم وستم کے باعث، یہ خواہش ایک مسلمہ حقیقت کا روپ دھار چکی تھی۔

کانسٹینٹین[4] (Canstantine) کی تبدیلی کے مقاصد کم وبیش مبہم ہی رہے لیکن یہ تو واضح ہے کہ وہ دراصل سیاسی تھے جس سے مراد یہ تھی کہ کلیسا کو سیاسی طور پر بہت زیادہ طاقت واثر ورسوخ حاصل ہو گیا تھا۔ کلیسا کی تعلیمات اور رومی سلطنت کے روایتی نظام اقتدار کے نظریے اور فلسفے میں اس قدر وسیع فرق تھا کہ کانسٹینٹین کے وقت رونما ہونے والے انقلاب کو معلوم انسانی تاریخ کا سب سے اہم اور مشہور واقعہ قرار دینا چاہیے۔

اقتدار واختیار کے حوالے سے مسیحی نظریات اور فلسفوں میں سب سے اہم یہ نظریہ اور فلسفہ تھا:

''ہمیں انسان کے بجائے خدا کی اطاعت وفرمانبرداری کرنی چاہیے۔''

صرف یہودیوں کے علاوہ اس ضابطہ ہدایت کی پہلے کہیں مثال موجود نہ تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ [illegible] فرمانبردار [illegible] فرائض موجود تھے لیکن یہودیوں اور مسیحیوں کے علاوہ ان کا سیاسی

ذمہ داریوں اور فرائض سے کبھی بھی اختلاف رونما نہیں ہوا۔ حالانکہ مذہب مخالف افراد ان بادشاہوں کے دعویٰ روحانیت کو خالص فلسفیانہ سچائی سے عاری سمجھتے تھے لیکن پھر بھی مذہب مخالف افراد بادشاہوں کے مسلک کے مطابق عمل کرنے کے لئے آمادہ تھے۔ اس کے برعکس، مسیحیوں کے لئے خالص فلسفیانہ حقیقت اور سچائی بہت ہی اہم لمحے پر مشتمل تھی: وہ یہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے ایک سچے خدا کے بجائے کسی اور ذات کی عبادت کی تو پھر انہوں نے عذاب اور غیض وغضب کا خطرہ مول لیا جس کی کم از کم سزا موت تھی۔

انسان کے بجائے خدا کی اطاعت اور خدمت گزاری کے اصول کی وضاحت مسیحیوں نے دومختلف انداز میں کی ہے۔ انسانوں تک خدا کے احکامات یا تو براہ راست اور یا کلیسا کے ذریعے پہنچائے جاسکتے ہیں۔ ہمارے اپنے دور تک ہنری سوئم (Henry III) (شاہ انگلستان) اور ہیگل (Hegel) (جرمن فلسفی) کے سوا کسی نے بھی نہ یہ کہا اور سمجھا کہ خدا کے احکامات ریاست کے ذریعے بھی پہنچائے جاسکتے ہیں۔ اس لئے مسیحی تعلیمات کے مطابق ریاست کی طاقت ورنوعیت معدوم ہے اور اس کے مقابلے میں یا تو نجی رائے عامہ طاقت واختیار کی مالک ہے اور یا پھر کلیسا کی قوت واختیار ترجیحی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر عملی حیثیت کے بغیر پہلے نظریے پر نظر ڈالی جائے تو پھر ایک بے ترتیب اور افراتفری پر مشتمل نظام سامنے آتا ہے جبکہ موخر الذکر نظریے اور انداز فکر میں دو قسم کے بااختیار عنصر یعنی کلیسا اور ریاست شامل ہیں، لیکن اس ضمن میں کوئی ایسا واضح اصول موجود نہیں جس کے مطابق ان دونوں کے دائرہ ہائے کار کی حد بندی کی جاسکے۔ اس کائنات میں موجود کون سی اشیاء سیزر[5] (Caesar) کی ملکیت ہیں؟ اور کون سی چیزوں کا مالک خدا ہے؟ مسیحیوں کے نزدیک یہ ایک فطری یقینی حقیقت ہے کہ اس کائنات میں موجود تمام اشیاء خدا کی مِلک میں ہیں۔ لہٰذا اس ضمن میں کلیسا کا موقف یہ ہوسکتا ہے جو ریاست کے لئے ناقابلِ برداشت ہوگا۔ کلیسا اور حکومت کے درمیان اختلاف کبھی بھی نظریاتی طور پر حل نہیں ہوا اور آج کے اس عہد میں بھی بعض معاملات مثلاً تعلیم کے حوالے سے موجود ہے۔

ممکن ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ کانسٹینٹین کی تبدیلی کے باعث کلیسا اور حکومت کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوجاتی۔ بہرحال اس قسم کا کوئی معاملہ نہ تھا۔ ابتدائی مسیحی شہنشاہ آریائی[6] تھے، اور آریائی جرمانی قبیلوں اور جرمن نسل کے افراد "ونڈال" (Vandal) کے حملوں کے باعث مغربی

ممالک میں روایت پسند مذہبی شہنشاہوں کا دور بہت مختصر تھا۔ بعدازاں، جب مشرقی شہنشاہوں کی کیتھولک فرقے کے ساتھ وابستگی اور وفاداری بالکل واضح ہوگئی تو اس وقت مصر، توحید فطرت مسیحؑ کا قائل تھا اور مغربی ایشیا کا زیادہ تر حصہ اس عقیدے کا پیرو تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کی ذات میں انسانی اور الوہی وجود یکجا ہیں۔ ان ممالک میں مذہب مخالف افراد نے بازنطینی حکومت سے کم اذیت رساں ہونے کے باعث پیغمبر کے پیروکاروں کو خوش آمدید کہا۔ ان بے شمار مقابلوں میں مسیحی حکومتوں کے خلاف ہر جگہ مسیحی کلیسا کامیاب رہا، جبکہ نئے مذہب اسلام نے ہی ریاستی اقتدار و اختیار کو مذہبی اختیار و قوت پر برتری سے نوازا۔

چوتھی صدی کے اواخر میں کلیسا اور آریائی شہنشاہ کے درمیان اختلاف کی نوعیت کو ملکہ جسٹینا (Justina) اور میلان (Milan) کے لاٹ پادری سینٹ امبروز کے درمیان مقابلے پر مبنی ایک مثال کے ذریعے واضح اور مفصل بیان کیا گیا ہے۔ اس کا بیٹا ویلنٹینیئن (Valentinian) ابھی نابالغ تھا اور وہ اس کے سرپرست کی حیثیت سے تخت پر براجمان تھی، اور یہ دونوں آریائی تھے۔ مقدس ہفتے (Holy Week) کے دوران میلان میں موجود ہونے کے باعث ملکہ کو یہ سبق پڑھایا گیا کہ ایک رومی شہنشاہ اپنی حاکمیت کا دعویٰ کر سکتا ہے، اپنے مذہب کو اعلانیہ پھیلا سکتا ہے، لہٰذا اس نے لاٹ پادری کے سامنے تجویز پیش کی کہ وہ ایک معتدل اور معقول رویّے کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہ وہ شہر یا اس کے مضافات میں واحد کلیسائی خدمات سے استعفےٰ دے دے۔ لیکن امبروز کا رویہ اور طرز عمل قطعی مختلف اصولوں پر مبنی تھا۔ اس کرہ ارض پر واقع محلات سیزر کی ملکیت ہو سکتے تھے لیکن کلیسا تو خدا کے گھر تھے اور لاٹ پادری کے حلقہ اثر کے علاقے میں، وہ بذات خود حواریوں کا ایک قانونی جانشین ہونے کی حیثیت سے، خدا کا نمائندہ تھا۔ مسیحیت کی طرف سے بہم پہنچائی جانے والی دنیاوی یا روحانی سہولیات، صرف سچے پیروکاروں ہی کے لئے مخصوص اور صرف ان تک ہی محدود تھیں اور امبروز کا ذہن اس لحاظ سے مطمئن تھا کہ اس کا دینی موقف اور نقطہ نظر سچائی اور مذہبی معیار کے بالکل عین مطابق ہے۔ لاٹ پادری جس نے شیطان کے چیلوں کے ساتھ کسی بھی قسم کی ملاقات، بحث اور گفتگو کرنے سے انکار کر دیا تھا، نہایت ہی ملائمت لیکن سختی سے اعلان کیا کہ وہ مقدس تعلیمات کی بے حرمتی کا مرتکب ہونے کے برعکس مرنے کو ترجیح دے گا۔

بہرحال، جلد ہی یہ معلوم ہوگیا کہ اسے مرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جب اسے

ملکہ کے دربار میں درباریوں کے سامنے پیش کیا گیا اور اس کے پیچھے اس کی حمایت کے لئے لوگوں کا ایک جم غفیر موجود تھا جنہوں نے ملکہ کے محل پر حملہ کرنے اور اس کے بیٹے کو قتل کر دینے کی دھمکی دی۔ جرمانی کرائے کے فوجیوں نے جو اگرچہ آریائی تھے، انہوں نے اس قدر مقدس اور نیک شخص کے خلاف کارروائی کرنے میں ہچکچاہٹ ظاہر کی اور ملکہ کی خواہش کے مطابق انقلابی قدم اٹھانے سے انکار کر دیا۔ ویلنٹینین (Valentinian) کی ماں، امبروز کی کامیابی اور فتح کو ہرگز معاف نہیں کر سکتی تھی اور نوجوان شاہی فرد ویلنٹینین (Valentinian) نے نہایت حیرت اور استعجاب کے عالم میں اپنی ماں کو بتایا کہ اس کے اپنے خادم، اس گستاخ پادری کی خاطر اس کے ساتھ غداری کرنے پر آمادہ ہیں۔

اگلے سال (386) میں ملکہ نے سینٹ پر فتح پانے کی دوبارہ کوشش کی۔ ایک شاہی فرمان کے ذریعے اسے ملک چھوڑنے کا حکم دے دیا گیا۔ لیکن اس نے کیتھڈرل (کلیسا) میں پناہ لے لی جہاں اس کے حمایتی دن رات اس کی حمایت کرتے تھے اور وہ لوگ بھی اس کی مدد کر رہے تھے جو کلیسا کی طرف سے خیرات وصول کرتے تھے۔ اس نے اپنے ان حمایتیوں اور مددگاروں کو بیدار اور ہوشیار رکھنے کے لئے میلان کے چرچ میں بلند آواز سے مناجات پڑھنے کا ایک باقاعدہ پروگرام رائج کیا۔ اس کلیسا کے اندر اس نے مختلف معجزاتی اور کراماتی کارروائیوں کے ذریعے اپنے پیروکاروں کے جذبہ شوق کو مزید ہوا دی اور پھر بالآخر، اٹلی کی کمزور اور ناتواں خود مختار حکمران نے محسوس کیا کہ وہ خدا کے پسندیدہ نمائندے کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

اس قسم کے بے شمار مقابلوں نے کلیسا کی خود مختار طاقت وقوت کی مسلمہ حیثیت قائم کر دی۔ اس کی یہ فتح کچھ تو ضرورتمند افراد کو خیرات دینے کے باعث تھی، اور کچھ کامیابی اس لئے بھی حاصل ہوئی کہ اس کے پاس ایک مربوط اور منظم نظام موجود تھا لیکن سب سے زیادہ اہم وجہ یہ تھی کہ اس کے خلاف کسی بھی قسم کے شدید مخالفانہ جذبات موجود نہ تھے۔ جب روم فتح ہو رہا تھا تو ایک رومی محض اس وجہ سے ریاست کی شان و شوکت کو بہت زیادہ طور پر محسوس کر سکتا تھا کیونکہ وہ ریاست کے شاہی وقار کا معترف تھا لیکن چوتھی صدی میں اس قسم کے جذبات باقی نہیں رہے تھے۔ مذہب کے مقابلے میں ریاست کے لئے جذبے اور ولولے میں اضافہ اس وقت ہوا جب جدید زمانے میں قوم پرستی کو عروج حاصل ہوا۔

ہر کامیاب انقلاب کے بعد اقتدار و اختیار کے تار و پود بکھر جاتے ہیں اور سماجی و معاشرتی وابستگی اور نظام کا استحکام خطرے میں گھر جاتا ہے۔ لہٰذا، انقلاب کے ذریعے کلیسا کو قوت و طاقت حاصل ہوگئی۔ جب اقتدار و اختیار کے تمام مہرے کلیسا کے ہاتھ میں آ گئے تو نہ صرف ریاست بہت زیادہ کمزور ہوگئی بلکہ مزید انقلابات کے دروازے بھی کھل گئے۔ مزید برآں، انفرادیت اور راہبانیت، جو ابتدائی مسیحی اقدار کا ایک اہم عنصر تھا، دینی اور لادینی یورش اور سازش کے ایک خطرناک ماخذ کی حیثیت سے موجود اور برقرار رہا۔ جب ایک راہب یا انفرادی فرد کلیسا کے فیصلے کو قبول نہیں کر سکتا تھا، تو اس نے اس اطاعت سے انکار کے لئے انجیل مقدس میں پناہ ڈھونڈھی۔ مذہب کے باغی اگرچہ کلیسا سے ناراض ہو سکتے تھے لیکن ان کی یہ ناراضی ابتدائی مسیحیت کی روح کے منافی نہ تھی۔

یہ مشکل اور مسئلہ ہر اس اختیار و اقتدار کو ابتداء سے ہی لاحق ہوتا ہے جو انقلاب کے ذریعے جنم لیتا ہے۔ اس ضمن میں اس اختیار و اقتدار کو اپنا یہ موقف سختی سے قائم رکھنا چاہئے کہ اصلی انقلاب جائز تھا اور پھر یہ اختیار و اقتدار، منطقی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ اس کے بعد آنے والے تمام انقلاب لازمی طور پر ناجائز اور بداطوار ہوں گے۔[7]

اگرچہ ازمنہ وسطیٰ کے تمام عرصے کے دوران مسیحیت کے اندر موجود انتشار و افتراق کی آگ کہیں گہرے طور پر دفن رہی، لیکن یہ آگ پوری آب و تاب کے ساتھ اس تمام مدت کے دوران روشن رہی۔

2۔ اصلاحی تحریک

اقتدار و اختیار کے حوالے سے اصلاحی تحریک کے دو پہلو ہیں جو ہمارے متعلق ہیں: ایک طرف تو اس کے دینی خلفشار اور انتشار نے کلیسا کو کمزور کر دیا، اور دوسری طرف کلیسا کو کمزور کرنے کے ذریعے ریاست طاقت ور اور بااختیار ہوگئی۔ یہ اصلاحی تحریک عظیم بین الاقوامی ادارے/تنظیم کی جزوی تباہی کے ضمن میں سب سے زیادہ اہم ہے جس نے بار بار خود کو کسی بھی لادینی حکومت سے زیادہ طاقت ور اور مضبوط ثابت کیا۔ کلیسا اور انتہا پسندوں کے خلاف کامیابی حاصل کرنے کے لئے لُوتھر (Luther) کو لادینی شہزادوں[8] کی حمایت پر انحصار کرنا پڑتا تھا، اور لُوتھر مسلک کے

کلیسا نے ہٹلر (Hitler) کے دور تک اس حکومت کے خلاف کبھی بھی وفاداری سے انکار کا اظہار نہیں کیا تھا جو کیتھولک نہیں تھی۔

انگلستان میں ہنری ہشتم نے اس سختی اور بے رحمی کے ساتھ معاملے کو اپنے ہاتھ میں لیا جو اس کا خاصا تھا۔ خود کو کلیسائے انگلستان کے طور پر مقرر کرنے کا اعلان کرتے ہوئے، اس نے مذہب کو لادین اور قوم بنانے کے منصوبے کا آغاز کر دیا۔ اس کی قطعی خواہش نہیں تھی انگلستان میں رائج مذہب، مسیحیت کے عالم گیر مذہب کا ایک حصہ بن جائے بلکہ اس کی خواہش یہ تھی انگلستان میں رائج مذہب خدا کے جاہ وجلال اور وقار کے بجائے اس کے جاہ وجلال اور شان وشوکت کی علامت بن جائے۔ پارلیمانوں کو اپنی حاکیت کے تحت لانے کے ذریعے وہ اپنی مرضی کے مطابق قوانین اور شعار میں تبدیلی کر سکتا تھا۔ مزید برآں، اسے ان لوگوں کو قتل کرنے میں کوئی مشکل درپیش نہ تھی جو اس کی طرف سے کی گئی تبدیلیوں کو ناپسند کرتے تھے۔ پادریوں اور راہبوں کی خانقاہوں کو تحلیل کر دیا گیا جس کے باعث اسے مال و دولت حاصل ہوئی اور اسی وجہ سے ہی وہ کیتھولک باغیوں اور سرکشوں کو اسی طرح آسانی سے تباہ و برباد کرنے میں کامیاب ہو گیا جس طرح "Pilgrimage of Grace"[9] کو بآسانی تباہ کر دیا گیا تھا۔ بارود اور گلابوں کی جنگ نے قدیم جاگیردارانہ آمریت کو کمزور کر دیا تھا، اور وہ جس وقت بھی ان جاگیردار طبقہ امراء سے ناراضی محسوس کرتا، ان کے سر قلم کروا دیتا۔ انگریز لاٹ پادری اور فلاسفر وولزے (Wolsey) جس نے کلیسا کی طاقت وقوت پر انحصار کیا تھا، اس کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔ کرومویل اور کریمر اس کے ہاتھ میں کھلونا بنے ہوئے تھے، اپنے مخالفین کے خلاف وہ ان سے جو چاہتا، کام لے لیتا۔ ہنری وہ پہلا بادشاہ تھا جس نے دنیا کو یہ بتا دیا کہ کلیسا کی طاقت ختم کرنے کے ضمن میں ریاست کس قدر زیادہ بااختیار اور طاقت ور ہو سکتی ہے۔

ممکن ہے کہ ہنری ہشتم (Henry VIII) کی یہ تمام کارروائی مستقل طور پر جاری نہ رہ سکی ہو لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ الزبتھ کے دور حکمرانی میں پروٹسٹنٹ عقائد کے ساتھ منسلک قوم پرستی کی ایک قسم اور صورت فوراً ہی ایک ضرورت اور خوشی واطمینان کی لہر میں ڈھل گئی۔ اپنی انا اور ذات کی حفاظت کا تقاضا یہ سامنے آیا کہ کیتھولک سپین کو شکست سے دوچار کیا جائے اور نہایت ہی آرام وسکون کے ساتھ خزانوں سے لدے ہوئے ہسپانوی بحری جہازوں پر قبضہ کر لیا جائے۔ اس

کے بعد Anglican کلیسا کو خطرہ صرف دائیں بازو کی جانب سے نہیں بلکہ بائیں بازو کے افراد کی جانب سے تھا۔ لیکن بائیں بازو کی جانب سے کیا جانے والا حملہ پسپا کر دیا گیا اور اس طرح کامیابی نصیب ہوئی۔

اچھے شاہ چارلس کے سنہری دن
جلد ہی گزر گئے
جب وفاداری کا اعلیٰ معیار
ہر مادی مطلب سے ماورا تھا

پروٹسٹنٹ عقیدے کے زیر اثر ممالک میں کلیسا کی شکست کا احوال ایک منافق بیان کرتا ہے۔ اب جب کہ مذہب کو برداشت کرنے کے متعلق سوچنا بھی ممکن نہیں تھا، پاپائے اعظم اور عمومی مجالس کی قوت و اختیار کے متبادل کے طور پر صرف یہی دستیاب تھا کہ کلیسا کو ریاست کے ماتحت ہونا چاہئے۔

بہرحال، کلیسا کو ریاست کے ماتحت کرنے کا نظریہ ان لوگوں کے لئے کبھی بھی قابلِ اطمینان نہیں ہوسکتا تھا جو ذاتی طور پر مذہب کے نہایت سختی کے ساتھ قائل تھے۔ عوام سے اس بات کا مطالبہ بہت ہی بے ڈھنگا اور بے تکا محسوس ہوتا تھا کہ وہ پارلیمان کی قوت و اختیار کی اطاعت اس بنیاد اور سوال پر کریں کہ بعد از مرگ صحیح عقیدے کے ساتھ مرنے والی ارواح کی روحانی تطہیر ہو جاتی ہے۔ دینی اور مذہبی قوت و اختیار کے طور پر آزاد خیال افراد نے ریاست اور کلیسا کو یکساں طور پر مسترد کر دیا اور مذہبی تحمل و برداشت کے منطقی اور قدرتی نتیجے کے ساتھ ساتھ آزادی رائے کے نجی حق پر مبنی موقف اپنایا۔ لادینی آمریت اور مطلق العنانی کے خلاف جدوجہد اور جنگ کے ضمن میں یہ نظریہ فوری طور پر کارآمد اور کارگر محسوس ہوا۔ اگر ہر فرد کو اپنے ذاتی مذہبی عقائد کو اپنانے کا حق حاصل تھا تو شاید اسے دوسرے حقوق حاصل نہیں تھے؟ کیا اس وقت قابل تفویض حدود نہ تھیں جو حکومت قانونی طور پر عام شہریوں پر نافذ کرسکتی تھی؟

شہری آزادیوں کے متعلق فرانسیسی دستاویز (Right of Man) پر مبنی نظریہ کرومویل کے شکست خوردہ پیروکار بحراوقیانوس سے لے کر گئے، اور پھر جیفرسن (Jefferson) نے اسے امریکی آئین میں شامل کیا اور فرانسیسی انقلاب کے ذریعے یہ نظریہ واپس یورپ پہنچ گیا۔

3۔ فرانسیسی انقلاب اور قوم پرستی

اصلاحی تحریک کے دور سے لے کر 1843 تک مغربی دنیا مسلسل فساد اور انتشار کا شکار رہی جسے ''شہری آزادیوں کا انقلاب'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔ 1849 میں یہ تحریک سوئٹزر لینڈ میں بہنے والے یورپی دریا Rhine کے مشرقی اطراف میں قوم پرستی کے نظریے میں ڈھل گئی۔ فرانس میں یہ تنظیم 1792 سے ہی موجود تھی جبکہ انگلستان میں اس کا آغاز، ابتدا سے ہی ہو چکا تھا اور امریکہ میں یہ تحریک 1776 سے ہی موجود تھی۔ اس تحریک کے قوم پرستانہ پہلو نے آہستہ آہستہ اس کے ''شہری آزادیوں'' کے پہلو پر غلبہ حاصل کر لیا لیکن موخرالذکر پہلو، ابتدا میں بہت ہی نمایاں اور اہم تھا۔

شہری آزادی کی اس تحریک کو اٹھارہویں صدی کی سطحی فصیح البیانی کے ایک نمونے کے طور پر ہمارے آج کے اس عہد میں نہایت حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر اس نظریے کو فلسفیانہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ نظریہ ناقابلِ دفاع ہے لیکن تاریخی اور عملی طور پر یہ بہت کارآمد تھا اور اس کے ذریعے حاصل ہونے والی بے شمار آزادیوں سے ہم مستفید ہوتے ہیں۔ بینتھامائٹ (Benthamite) کے نظریے کے حامی افراد جن کے نزدیک ''حقوق'' کا مختصر تصور ممکن نہیں ہے، وہ اسے عملی نقطۂ نگاہ اور مقصد کے حوالے سے، مندرجہ ذیل اصطلاح کے تحت بیان کر سکتے ہیں: ''عوام کی روزمرہ زندگی کی خوشیوں میں اس وقت اضافہ ہو جاتا ہے بشرطیکہ ایک خاص دائرہ عمل کو بیان کیا جائے جس کے اندر ایک شخص کسی بیرونی طاقت کی مداخلت کے بغیر اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق ہر قسم کی سرگرمی انجام دیتا ہے۔'' نظامِ انصاف کا قیام و اہتمام بھی ایک ایسا معاملہ تھا جو ''شہری آزادی'' کے علم برداروں کے لئے دلچسپی کا باعث تھا، انہوں نے یہ موقف اپنایا کہ قانونی کارروائی کے بغیر کسی بھی شخص کو زندگی یا آزادی سے محروم نہیں کرنا چاہئے۔ خواہ یہ نظریہ اور موقف صحیح ہو یا غلط، اس میں کسی قسم کا فلسفیانہ ابہام موجود نہیں ہے۔

یہ امر تو نہایت واضح ہے کہ یہ نظریہ بنیادی اور جذباتی لحاظ سے حکومت مخالف ہے۔ ایک آمرانہ اور مطلق العنان حکومت کی عوام کا موقف یہ ہے کہ انہیں اپنی مرضی کے مطابق مذہب اختیار کرنے کی اجازت ہونی چاہئے، افسر شاہی کی مداخلت کے بغیر قانونی طریقے کے ذریعے

اپنا کاروبار کرنے کا حق حاصل ہونا چاہئے، اپنی محبوب فرد سے شادی کرنے کا استحقاق ہونا چاہئے، اور پھر ایک غیر ملکی اور ناجائز غاصب کے خلاف بغاوت کا بھی اختیار ہونا چاہئے۔ ''شہری آزادیوں'' کے علم برداروں کا موقف یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے ضروری فیصلے، عوام کی اکثریت، یا ان کے نمائندوں کی مرضی اور خواہش کے مطابق ہونے چاہئیں۔ مزید یہ کہ یہ فیصلے ایک تحکمانہ اور روایتی بااختیار ادارے مثلاً بادشاہ یا پادری کے ذریعے بھی نہیں ہونے چاہئیں۔ یہ نظریات اور انداز ہائے فکر آہستہ آہستہ تمام مہذب دنیا میں پھیل گئے اور ان کے باعث ''نظامِ آزادی'' پر مبنی ایک نئے اور انوکھے انداز فکر نے جنم لیا جو حکومتی اقدامات کی مشکوک حیثیت کے باوجود قائم رہتا ہے۔

انفرادی آزادی کا نظام منطقی اور تاریخی طور پر پروٹسٹنٹ (مسیحی فرقہ) عقائد سے منسلک ہے جس نے اپنے نظریے کو دینی دائرے میں محدود رکھا حالانکہ اس نے اپنے نظریے کو اکثر اوقات اس وقت ترک کر دیا جب اسے اقتدار و اختیار حاصل ہوا۔ پروٹسٹنٹ کے ذریعے ابتدائی مسیحیت قائم ہوئی اور بے دین ریاست کے خلاف جدوجہد اور جارحیت کو ثبات و استحکام حاصل ہوا۔ ایک انفرادی فرد کے ساتھ تعلق کے حوالے سے اس کا مسیحیت کے ساتھ گہرا رشتہ استوار تھا۔ مسیحی اخلاقیات کے مطابق، حکومت کی کسی بھی ضرورت اور خواہش کے تحت حکام کسی شخص کو گناہ پر مبنی سرگرمی اختیار کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ مسیحی کلیسا کا موقف یہ ہے کہ زبردستی کی شادی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ مزید یہ کہ اذیت رسانی اور آزار دہی کے حوالے سے بھی فرد کی انفرادیت کو فوقیت حاصل ہے، یعنی ایک مرتد (لادین/ مذہب مخالف) کو اذیت رسانی اور آزار دہی کا نشانہ صرف اس وقت بنانا چاہئے جب اسے اپنے فعل پر ندامت اور توبہ کا احساس دلانا مقصود ہو، بحیثیت مجموعی مسیحیت کو فائدہ پہنچانے کے لئے کسی لادین شخص کو اذیت اور آزار پہنچانا روا اور جائز نہیں۔ ایک جرمن فلسفی کینٹ (Kant) کا یہ اصول مسیحی تعلیمات سے اخذ کیا گیا ہے کہ ''ہر انسان، اپنے طور پر ایک مکمل نوعیت کا حامل ہے۔'' مسیحیت کے کیتھولک فرقے کے مطابق، قوت و اختیار کی ایک طویل مدت اور عرصے کے باعث ابتدائی مسیحیت کا نظریہ ''انفرادی آزادی کا نظام'' کسی قدر معدوم پڑ گیا تھا لیکن خاص طور پر پروٹسٹنٹ عقیدے کے عروج کے زمانے میں اس نظریے کا احیاء ہوا اور نظام حکومت کے قوانین میں اس کا نفاذ و اطلاق کیا گیا۔

جس طرح فرانسیسی انقلاب کے دوران حالات پیدا ہوئے، جب انقلابی اور روایتی قوت و اختیار کے پیروکار حکومت حاصل کرنے کے لئے باہم دست و گریباں ہوتے ہیں، تو پھر شکست خوردہ فریق کے حوالے سے کامیاب اور فاتح فریق کی قوت و اختیار، حشمت و رعب کے اقتدار کے زمرے میں آتا ہے۔ انقلابی اور نپولین کی فوجوں نے وسیع پیمانے پر ایک نئے عقیدے کی منظم تشہیری قوت اور حشمت و رعب کے اقتدار کے امتزاج کا مظاہرہ کیا۔ اس سے پہلے یورپ میں اس طرح کی صورت حال کبھی بھی پیدا نہیں ہوئی اور براعظم کے تصور پر اس کا اثر آج بھی قائم ہے۔ روایتی اقتدار و اختیار کے لئے انقلابی اقتدار و اختیار کے پیروکاروں نے ہر جگہ مشکلات پیدا کیں لیکن یہ نپولین کی افواج ہی تھیں جنہوں نے ان مشکلات کو مزید استحکام بخشا۔ نپولین کی فوجیں قدیم ناجائز اور غلیظ اقتدار کے دفاع کے لئے لڑیں، اور جب وہ آخری دفعہ فتح یاب ہوئیں تو انہوں نے اس کے مقابلے میں ایک نظام قائم کر دیا۔ لیکن ان کے کمزور دفاع کے تحت اس کا تشدد، ظلم اور استحصال بھلا دیا گیا۔ گریٹ پیس (Great Peace) کے ختم ہو جانے کے باعث ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنگ ایک شاندار صورت اختیار کر لے گی اور آزادی کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ ''ہولی وار'' (Holy War)[10] کے سالوں میں تشدد اور ظلم کی ایک ''بائرن'' (Byron) قسم پھوٹ پڑی اور آہستہ آہستہ اس نے عوام کے روزمرہ خیالات و احساسات بدل ڈالے۔

اس تمام صورت حال کے آثار اور علامات نپولین کے حشمت و رعب کے اقتدار میں مل سکتے ہیں اور اس کا تعلق انقلاب کی آزادانہ جنگی چیخ و پکار میں سے ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ ہٹلر، مسولینی کے علاوہ سٹالن کی کامیابیاں اور فتوحات، رابس پیری (Robespierre)[11] اور نپولین کی مرہونِ منت ہیں۔

جس طرح نپولین کی مثال سے ظاہر ہے، روایتی اقتدار، حشمت و رعب کے اقتدار میں ڈھل جانے کا نہایت مناسب اور معقول میلان کا حامل ہے۔ جنونیت اور پاگل پن، خواہ غیر ملکی فتح، مذہبی آزار دہی جنگجو طبقے میں موجود ہو، اس کی نوعیت الگ اور ممتاز ہوتی ہے۔ حشمت و رعب کے اقتدار کے حوالے سے یہ تو سچ ہے کہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ایک انفرادی فرد نہیں ہے، بلکہ یہ تو ایک گروہ یا جماعت ہے جو اقتدار و اختیار کی ہوس میں مبتلا ہوتی ہے، اور اس کی طرف سے اقتدار و اختیار کی یہ خواہش اس کے اپنے لئے نہیں بلکہ اس کے اپنے نظریے اور عقیدے کے لئے

ہوتی ہے۔لیکن چونکہ اقتدار واختیار کا اپنا ایک خاص مفہوم ہے،اور ایک طویل تنازعے کے بعد اختتام کو بھول جانا ہی مناسب اور معقول تصور ہوتا ہے،تو پھر اس ضمن میں ایک ایسا رجحان اور میلان پایا جاتا ہے،خاص طور پر کہ جدوجہد طویل اور شدید ہو،یہ جنون اور پاگل پن،آہستہ آہستہ فتح حاصل کرنے کی کوشش اور جدوجہد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔انقلابی اور حشمت و رعب کے اقتدار میں فرق جو ابتدا میں دکھائی دیتا ہے،اکثر اس سے کہیں کم ہوتا ہے۔لاطینی امریکہ میں سپین کے خلاف بغاوت ابتدا میں آزاد خیال اور جمہوری طبقے کی سربراہی میں واقع ہوئی،لیکن اکثر اوقات اس کا اختتام بے شمار مختلف غیر مستحکم آمرانہ حکومتوں پر ہوا جنہیں بغاوت کے ہاتھوں شکست کھانا پڑی۔صرف جہاں جہاں انقلابی نظریہ اور عقیدہ مضبوط اور وسیع اطراف میں موجود ہے،اور فتح کے لئے بھی زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا،وہاں باہمی تعاون کا معمول،انقلاب کے باعث پہنچنے والے نقصان اور صدمے کو تحلیل کر سکتا ہے اور نئی حکومت محض فوجی طاقت پر انحصار کرنے کی بجائے عوام کی حمایت پر انحصار کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔نفسیاتی اختیار و اقتدار کے بغیر ایک حکومت لازمی طور پر مطلق العنان اور آمرانہ ہوتی ہے۔

4-روسی انقلاب

عالمی تاریخ میں روسی انقلاب کی اہمیت کے متعلق فیصلہ ابھی باقی ہے لیکن ابھی تو ہم اس کے مختلف پہلوؤں کے متعلق صرف گفتگو ہی کر سکتے ہیں۔ابتدائی مسیحیت کے مانند،یہ ان نظریات کا پرچار کرتا ہے جو بین الاقوامی اور حتیٰ کہ قوم پرستی کے مخالف ہیں،مثلاً اسلام،لیکن مسیحیت کے برعکس،یہ لازمی طور پر سیاسی نوعیت کا حال ہوتا ہے۔بہرحال،اس کا جو پہلو اور حصہ ابھی تک کامیاب اور موثر ثابت ہوا ہے،وہ ''آزاد خیالی'' کے نظریے کی مخالفت اور اس کا مقابلہ ہے۔ نومبر 1917 تک ''آزاد خیالی'' پر مبنی نظریہ صرف مختلف انقلابیوں نے ہی اپنایا،جبکہ دیگر ترقی پسند افراد کے مانند مارکس کے پیروکاروں نے جمہوریت،آزادی رائے،آزاد ذرائع ابلاغ و اطلاعات، اور بقایا آزاد خیال سیاسی ہتھکنڈوں کی حمایت کی۔جب سوویت حکومت نے اقتدار حاصل کیا تو اپنے عروج کے زمانے میں اس نے کیتھولک عقیدے کو دوبارہ اپنا لیا،یعنی حکومت کا یہ فرض ہے کہ مثبت اور تعمیری تبلیغ اور اپنے مخالف نظریات کی مخالفت کے ذریعے سچائی کا پرچار کرے۔بلاشبہ اس

مقصد کو حاصل کرنے کے لئے سرخ فوج پر انحصار کے ذریعے مستحکم غیر جمہوری آمریت قائم کی گئی۔ اس ضمن میں نئی چیز جو اپنائی گئی، وہ سیاسی اور معاشی قوت کا ادغام تھا جس کے باعث حکومتی اثر میں بے تحاشا اضافہ ہو گیا۔

کمیونسٹ نظریے کا بین الاقوامی پہلو غیر موثر ثابت ہوا ہے لیکن آزاد خیالی کا استراد ایک غیر معمولی کامیابی کی حیثیت رکھتی تھی۔ سوئٹزرلینڈ میں بہنے والے یورپی دریا Rhine سے لے کر بحرالکاہل تک، اس کے تمام مرکزی نظریے تقریباً ہر جگہ مسترد کر دیئے گئے۔ پہلے اٹلی اور پھر جرمنی نے بالشویک (انتہا پسند) کے پیروکاروں کی سیاسی ترکیبات اور طور طریقے اپنا لئے، حتیٰ کہ غیر جمہوری ممالک میں "آزاد خیالی" پر نظریے کی مقبولیت میں کمی واقع ہو گئی۔ مثال کے طور پر "آزاد خیالی" کے حامی کہتے ہیں کہ جب آتش زنی کے ذریعے عمارتیں تباہ کر دی جاتی ہیں، تو پھر پولیس اور قانونی عدالتوں کے ذریعے اصل مجرموں کو تلاش کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے لیکن "نیرو" (Nero) کے مانند جدید انداز فکر حامل افراد کا موقف ہے کہ ٹھوس ثبوت کے ذریعے ہی کسی پر الزام تراشی کی جائے خواہ فریقین کو یہ پسند ہو یا نہ ہو۔ جہاں تک آزادی رائے کا تعلق ہے، سینٹ امبروز کے مانند اس کا بھی یہی موقف ہے کہ آزادی رائے صرف اس کی مخصوص جماعت کو ہی حاصل ہو، دوسری جماعت کو یہ حق حاصل نہیں ہونا چاہئے۔

اس نظریے یا اصول کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے تو تمام قوت و اختیار انقلابی اقتدار و اختیار میں ڈھل جاتا ہے اور پھر ناگزیر تدریجی عمل کے ذریعے حشمت و رعب کے اقتدار میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ خطرہ قریب الوقوع ہوتا ہے، لیکن اس کو روکنے یا اس سے بچنے کے طریقے میں بعد میں بیان کروں گا۔

"آزاد خیال نظام قوت و اختیار" کے زوال کی بہت سی وجوہات ہیں، ان میں سے کچھ فنی/تکنیکی ہیں اور کچھ نفسیاتی ہیں۔ یہ وجوہات اور یہ عناصر جنگ اور پیداواری مراحل اور تراکیب میں پائی جاتی ہیں اور انہیں دیکھا بھی جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ منظم تشہیری مہم کے لئے اضافی سہولیات، قوم پرستی میں بھی یہ وجوہات اور عناصر موجود ہوتے ہیں جو بذات خود "آزاد خیال نظام" کا نتیجہ ہے۔ یہ تمام وجوہات، خاص طور پر جب ریاست کے پاس معاشی قوت کے علاوہ سیاسی قوت بھی موجود ہوتی ہے، حکومت کی طاقت میں بے تحاشا اضافہ کر دیتی ہیں۔ ریاست کے

حوالے سے ایک فرد کے مسائل جو ہمیں آج کے دور میں درپیش ہیں، وہ نئے مسائل ہیں جنہیں لوکی[12] (Locke) اور مونٹسکیو (Montesquieu) حل نہیں کر پائیں گے۔ بالکل اٹھارہویں صدی میں موجود معاشرے کے مطابق، اگر آج کے جدید معاشرے کو بھی خوشی اور خوشحالی درکار ہے تو پھر اسے انفرادی افراد کی طرف سے ابتدائی اقدام پر مشتمل ایک لائحہ عمل کی ضرورت ہے، لیکن اس لائحہ عمل کی تازہ ترین حد متعین کر دینی چاہئے اور نئے نئے طریقوں اور تراکیب کے ذریعے اسے تحفظ بھی فراہم کر دینا چاہئے۔

حوالہ جات

1- اصلاحی تحریک (Reformation): سولہویں صدی کے لگ بھگ یورپ میں رومی کلیسا کی بدعنوانیوں کی اصلاح کے لئے پیدا ہونے والی تحریک جس کے نتیجے میں اصلاح یافتہ (Reformed) اور پروٹسٹنٹ (Protestant) فرقے بنے۔

2- کرسٹاڈیلفین (Christadelphain): عیسائی فرقہ یا اس کا کوئی فرد جو تثلیث کے عقیدے کو رد کرتا ہے اور حضرت عیسیٰ کی دوبارہ آمد کا منتظر ہے۔

3- ڈائیوکلیٹین (Diocletian) (245-313) رومی شہنشاہ (284-305)

4- کانسٹینٹین (Canstantine):

شاہ ہیلینیز (یونان) Kings of Helenese (Greece) (1940)

5- سیزر (Caesar): قدیم روم کا ایک طاقتور خاندان جس میں جولیس سیزر بھی شامل تھا۔

6- آریائی (Arians): مصری پادری اور بزرگ آریوئیس (Arius) کے پیروکار جو حضرت عیسیٰ کی مکمل روحانیت کے قائل نہ تھے۔

7- اس قسم کی کوشش کے بعض اوقات عجیب وغریب نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ آج کے دور میں روس کا نوجوان طبقہ، زاروں کے دور کی انقلابی تحاریک کی تعریف وستائش کے احوال سے بہت اچھی طرح محفوظ ہے۔ کچھ طلبہ کی طرف سے سٹالن کو ہلاک کرنے کے

مجوزہ منصوبے کے متعلق بتانے کے بعد The Letter of the Old Bolshevic (George Allen & Unwin) میں مزید احوال اس طرح درج ہے: ''جن طلبا پر یہ الزام عائد کیا گیا، ان سے یہ اشارہ ملا کہ یہ سب کچھ Professors of political science and party history کا کیا دھرا ہے۔ روسی انقلابی تحریک کی تاریخ کے متعلق اسباق کے صفحات میں سے یہ سب کچھ تلاش کرنا بہت آسان ہے۔ آج کے دور میں روسی انقلابی تحریک، حکومت کے متعلق تنقیدی رویے اور طرز عمل کی پرداخت کے ضمن میں بہت مفید حیثیت رکھتی ہے، اور تیز وتند نوجوان آج کے دور کے متعلق اپنے فیصلوں کو ہمیشہ ہی ان حقائق کے بیان کے ذریعے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو انہیں سکول میں اس لئے پڑھائے گئے کہ یہ سرکاری طور پر مستند تسلیم کئے گئے تھے۔ تمام اگیرانوف (Agranov) کو صرف یہ کرنا تھا کہ ان پروفیسروں کی نشاندہی کر دیتے جو ان کے خیال کے مطابق سازشیوں کے ساتھی تھے۔ اسی طریقے کے ذریعے in the trials of the sixteen میں مدعا علیہان کا پہلا جتھہ بھرتی کیا گیا۔

-8 ''Religion and the Rise of Capitalism'' میں ٹانی (Tawney) لکھتا ہے: ''کسانوں کی جنگ اور اس کی انجیل مقدس کے سامنے متاثر کن درخواست اور پھر خوفناک تباہی و بربادی نے لُوتھر کو اس حد تک خوف زدہ اور وحشت زدہ کیا کہ وہ چیخ چیخ کر کہنے لگا: ''کون ہے وہ شخص جو خفیہ یا اعلانیہ ضرب لگا سکے، سرزنش کر سکے یا پابندیاں لگا سکے۔ یہ وہ شاندار اور بہترین دور ہے جب ایک شہزادہ اپنی عبادت کی بجائے خون ریزی کے ذریعے اپنے خدا کو راضی کر سکتا ہے''، اس کے باعث لُوتھر کے نظام پر لادینی با اختیار قوتوں کے آگے غلامانہ سرشت اختیار کرنے پر مبنی رویے پر مہر ثبت کر دی۔ پھر وہ کچھ اور صفحات میں لُوتھر کے متعلق کہتا ہے: ''کسی کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دنیا پر بغیر خون بہائے حکومت کی جا سکتی ہے۔ خانہ جنگی میں استعمال ہونے والی تلوار لازمی طور پر سرخ اور خون آلود ہونی چاہئے اور ہوگی۔'' اس ضمن میں ٹانی (Tawney) کا تبصرہ درج ذیل ہے۔

''لہٰذا کلہاڑا لوگوں پر برس پڑتا ہے اور قربان گاہ سے ملی ہوئی قوت و طاقت، تخت پر ایک نئی اور لادینی پناہ گاہ تلاش کر لیتی ہے ___ مسیحی اخلاقی اقدار کی برقراری کی ذمہ داری مسترد

پادرانہ قوت واختیار کے ہاتھ سے نکل کر ریاست کی طرف منتقل ہو جانا چاہتی ہے۔ اگلی سنگھوں اور چھپکلیوں کے مانند شکوک حالات کی طرح میکاولی کے دور اور ہنری ہشتم نے اپنی خوش اعتقادی کو تقویت دینے کا سامان عجیب وغریب عفریت "خدا سے ڈرنے والے شہزادے" کی عبادت میں ڈھونڈا۔ اس قسم کی زود اعتقادی اور خوش فہمی، انقلابی عہد کا خاصا ہوا کرتی ہے۔

9- Pilgrimage of Grace: انگلستان کے بادشاہ ہنری ہشتم کے خلاف باغیانہ شورش (1536-37)

10- ہولی الائنس (Holy Alliance): خیرات، امن اور محبت کے لئے مسیحیت کا اتحاد جس کا محرک روس کا بادشاہ سکندر اول تھا اور اس پر یورپ کے ہر بادشاہ نے دستخط کئے تھے۔

11- رابس پیری (Robespierre): (1758-94) فرانسیسی انقلاب کے دوران فرانسیسی سیاست دان۔

12- لوکی (Locke): انگریز فلسفی (1632-1704)

آٹھواں باب

معاشی اقتدار

فوجی اقتدار واختیار کے برعکس معاشی اقتدار واختیار اپنے طور پر وجود میں نہیں آتا بلکہ یہ مختلف حالات اور احوال کے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ایک ملک کے اندر اس کا انحصار ملک میں موجود قوانین پر ہوتا ہے۔ بین الاقوامی تعلقات کے حوالے سے یہ ان چھوٹے چھوٹے معاملات میں سے ایک معاملہ ہوتا ہے جس کا انحصار قانون پر ہے لیکن جب بہت سے معاملات ومسائل درپیش ہو جائیں پھر معاشی اختیار وقوت جنگ یا جنگ کے خطرے کے باعث ہی جنم لیتا ہے۔ کسی بھی تجزیے اور جائزے کے بغیر معاشی قوت واختیار کی موجودگی اور قبولیت ایک معمول اور روایت کی حیثیت رہی ہے اور اس کے باعث آج کے اس جدید دور میں، تاریخ کی عمومی تشریح کے لحاظ سے اسے غیر ضروری اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔

محنت ومشقت کی معاشی قوت وطاقت کے سوا، اپنے حتمی تجزیے اور جائزے کے لحاظ سے دیگر تمام قسم کی معاشی قوت واختیار، اگر ضروری ہوتو، فیصلہ سازی کی اس صلاحیت پر مشتمل ہوتا ہے کہ ایک مخصوص قطعہ زمین پر کون قابض ہوگا، اور کون اس قطعہ زمین پر اپنے مختلف ذرائع پیداوار کے نفاذ اور اعلان کے ذریعے اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ بعض معاملات میں یہ صورت حال نہایت واضح طور پر موجود ہوتی ہے۔ جنوبی فارس کے تیل کی ملکیت اینگلو فارسی کمپنی کے پاس ہے کیونکہ برطانوی حکومت کے حکم کے مطابق کوئی دوسرا شخص، ادارہ، تنظیم یا ملک اس تیل کی ملکیت حاصل نہیں کر سکتا اور برطانوی حکومت کے پاس اپنے اس حکم کے نفاذ واعلان کے لئے مناسب طاقت وقوت موجود ہے۔ لیکن اگر برطانیہ کو ایک حقیقی جنگ میں شکست ہو جاتی ہے تو ممکن ہے کہ تیل کی ملکیت تبدیل ہو جائے۔ رہوڈیشیا میں موجود سونے کی کانیں بعض دولت مند افراد کی ملکیت میں اس لئے

دی گئی ہیں کہ برطانوی جمہوریت کے خیال کے مطابق یہ دولت مند افراد اس قابل ہیں کہ لوبن گلا (Lobengula) کے خلاف جنگ کر سکیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا میں موجود تیل مخصوص تجارتی اور اداروں کی اس لئے ملکیت ہے کہ انہیں قانونی طور پر یہ اختیار حاصل ہے اور امریکا کی مسلح افواج اس قانون کے نفاذ کی صلاحیت رکھتی ہیں، اس کے برعکس ہندوستانیوں کہ بنیادی طور پر یہ تیل جن کی ملکیت ہے، انہیں اس تیل کی ملکیت کا حق اس لئے نہیں ہے کیونکہ جنگ میں انہیں شکست ہو گئی تھی۔ لورین (Lorraine) میں موجود خام لوہا فرانس یا جرمنی کے شہریوں کی ملکیت ہے کیونکہ حالیہ قریبی جنگوں میں یہ دونوں ممالک فتح یاب رہے تھے، وغیرہ وغیرہ۔

لیکن بہت کم واضح معاملات میں بھی یہ تجزیہ اور جائزہ لاگو ہوتا ہے۔ ایک کسان مزارعہ کیوں لازمی طور اپنے کھیت کا کرایہ ادا کرتا ہے، اور وہ اپنی فصلیں کیونکر فروخت کر سکتا ہے؟ اسے اس کھیت کا معاوضہ اور کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے کیونکہ یہ زمین زمیندار کی ملکیت ہوتی ہے۔ یہ زمیندار اس زمین کا اس لئے مالک ہوتا ہے کہ یا تو یہ زمین اس نے خریدی ہوتی ہے یا یہ زمین اسے کسی سے وراثت میں ملی ہوتی ہے۔ اگر ہم اس ملکیت کی سابقہ تاریخ کو کھنگالیں، تو بالآخر ہمیں ایک وہ شخص نظر آتا ہے کہ اس نے یہ زمین کسی درباری کی خاطر ایک بادشاہ کی زبردست قوت استعمال کر کے حاصل کی، اور یا پھر اہل سکسن یا اہلِ نارمن کے مانند ایک وسیع فتح کے ذریعے حاصل کی۔ ان متشدد کارروائیوں کے درمیانی وقفوں میں، ریاستی قوت اس ملکیت کو قانونی طور پر منتقلی کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ مزید برآں، زمین کی ملکیت ایک ایسی قوت و اختیار ہے جو یہ فیصلہ کرے گی کہ اس زمین پر کون قابض ہوگا۔ اسی اجازت اور اختیار کے باعث کسان معاوضہ اور کرایہ ادا کرتا ہے اور اس کے باعث وہ اپنی فصل فروخت کر سکتا ہے۔

صنعتکار کا اقتدار و اختیار بھی اسی قسم کے اختیار و اقتدار کے زمرے میں شامل ہے۔ آخری تجزیے اور جائزے کے مطابق یہ اقتدار و اختیار، کارخانے کی بندش پر منحصر ہے یعنی دوسرے الفاظ میں، اس کا انحصار اس حقیقت پر ہے کہ کارخانے کا مالک کارخانے میں غیر متعلقہ افراد کا داخلہ روکنے کے لئے ریاستی قوت طلب کر سکتا ہے۔ بعض طبقہ ہائے فکر کی رائے کے مطابق، ریاست اس ضمن میں، زمین دار کی حمایت میں پس و پیش کر سکتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کاریگروں کی طرف سے ہڑتال ممکن ہو جاتی ہے۔ جیسے ہی یہ مزدور اور کاریگر ریاست کے لئے قابل برداشت

ہو جاتے ہیں تو قوت وطاقت مکمل طور پر آجر کے ہاتھ میں نہیں رہتی اور کچھ حد تک آجروں میں بھی یہ طاقت وقوت منتقل ہو جاتی ہے۔

کسی دیگر معاشی قوت وطاقت کی نسبت "قرضہ یا ادھار" ایک نا قابلِ فہم حیثیت کا مالک ہے، لیکن ضروری نہیں ہے کہ یہ مختلف ہی ہو، اس کا انحصار اس قانونی حق پر ہے جس کے ذریعے اضافی اشیائے صرف کو ان کے تیار کنندگان کی طرف سے ان کاریگروں کی طرف منتقل کر دیا جائے جو براہ راست ان مصنوعات کی تیاری میں شریک نہیں ہیں۔ ایک نجی شخص یا تجارتی ادارہ جو رقم ادھار لیتا ہے، یہ ذمہ داری قانون کے نفاذ کے ذریعے لاگو کی جاسکتی ہے، لیکن ایک حکومت کے حوالے سے حتمی قوت وطاقت دیگر حکومتوں کی فوجی طاقت وقوت ہی ہوتی ہے۔ یہ قوت وطاقت ناکام بھی ہوسکتی ہے جیسے انقلاب کے بعد روس میں ہوا، اور جب یہ قوت وطاقت ناکام ہو جاتی ہے تو پھر قرض خواہ، قرض دار کی جائیداد پر قبضہ کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ قبل از جنگ کے حصہ دار نہیں تھے بلکہ سوویت حکومت تھی جس کے پاس فیصلہ سازی کا یہ اختیار حاصل تھا کہ لینا (Lena) میں موجود سونے کی کانوں پر کس کا قبضہ ہوگا۔

لہٰذا نجی افراد کی معاشی قوت واختیار کا انحصار بوقت ضرورت حکومت کے اپنی مسلح افواج کو استعمال کرنے کے فیصلے پر ہے، اور یہ استعمال اور ان قواعد وضوابط کے مطابق ہوگا کہ کون شخص اس زمین پر قبضے کا حقدار ہے، جبکہ حکومت کی معاشی قوت وطاقت کا انحصار کچھ حد تک اس طور پر اس کی مسلح فوج اور کچھ حد تک دوسرے ممالک کے ساتھ معاہدات اور بین الاقوامی قانون کی پابندی پر ہوتا ہے۔

حکومت کے ساتھ معاشی قوت کا تعلق کچھ حد تک باہمی اشتراک پر ہے، یعنی افراد کا ایک گروہ باہمی رضامندی کے ذریعے فوجی طاقت وقوت حاصل کرسکتا ہے، اور اس فوجی طاقت کے حصول کے بعد معاشی قوت وطاقت بھی حاصل کرسکتا ہے۔ دراصل معاشی قوت وطاقت کے حصول کے ذریعے بالآخر یہ دونوں یعنی حکومت اور معاشی اختیار ایک دوسرے کے ساتھ ملنے پر مبنی اپنا اصلی مقصد حاصل کر لیتے ہیں۔ اس ضمن میں مثال کے طور پر اس صورت حال پر غور کیجئے جو سونے کے کانوں کی دریافت کے باعث 1849 میں کیلیفورنیا میں ایک نیم ابتری اور افراتفری کی حالت اختیار کر گئی تھی، اور یا پھر وہ صورت حال جو چند سال بعد وکٹوریہ میں رونما ہو چکی تھی۔ ایک

شخص جس نے قانونی طور پر سونا حاصل کرلیا ہو، وہ اس وقت تک معاشی قوت وطاقت حاصل نہیں کرسکتا جب تک وہ اس سونے کو بنک میں جمع نہیں کرادیتا۔ اس وقت تک اس کا سونا چھن جانے، چوری ہو جانے اور یا اس شخص کے بذات خود قتل ہو جانے کا خطرہ موجود رہتا ہے۔ جب ایک دوسرے کے خلاف جنگ کے باعث مکمل بدانتظامی، افراتفری اور بے ترتیبی پھیل جاتی ہے تو سونا اس وقت تک بے کار اور ناکارہ رہتا ہے، سوائے اس کے کہ یہ شخص اس قدر ہوشیار اور مستعد ہو کہ وہ اپنے پستول کے ساتھ کسی بھی قاتل کے خلاف اپنا دفاع کرنے کے قابل ہو، اور اس کا یہ مقصد اس کے لئے خوشگوار ثابت ہو کیونکہ وہ رقم کی ادائیگی کے بغیر ہی قتل کے خطرے کے بغیر اپنی ضروریات وخواہشات کی تکمیل کرے۔ اس قسم کی صورت حال، اس وقت لازمی طور پر غیر مستحکم ہو سکتی ہے، سوائے اس کے کہ جہاں ممکنہ طور پر خوراک اکٹھا کرنے کے لئے ایک قلیل آبادی موجود ہو۔ زراعت اس وقت تک ناممکن ہے جب تک فصلوں پر ناجائز قبضے اور چوری کو روکنے کے لئے ذرائع موجود ہوں۔ اس امر میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ کم وبیش نیم ابتر مہذب افراد پر مشتمل معاشرے میں، سونے کی ریل پیل کی صورت حال میں موجود افراد کے مانند، جلد ہی یہ افراد کسی بھی قسم کی حکومت قائم کرلیں گے، مثلاً ایک کمیٹی یا قانون کا نفاذ کرنے والی ایک کمیٹی کا رکن ہوشیار اور مستعد افراد، مخالفین کی طرف سے کسی حملے یا لوٹ مار سے بچنے کے لئے اکٹھے ہو جائیں گے، اگر ان کے معاملات میں دخل دینے والی کوئی بیرونی قوت موجود نہ ہو تو وہ اپنے مخالفین کو بھی لوٹ کھسوٹ سکتے ہیں لیکن وہ یہ سب کچھ جدید انداز میں انجام دیں گے کہ کہیں وہ ہنس ہلاک نہ ہو جائے جو سونے کے انڈے دیتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ اپنی آمدن کا کچھ حصہ (فی صد) اپنے تحفظ کے لئے دے سکتے ہیں۔ اسے ''آمدن پر محصول'' (Income Tax) کہتے ہیں۔ جیسے ہی ان افراد کو تحفظ فراہم کرنے کے ضمن میں قواعد وضوابط اور قوانین تشکیل پاتے ہیں، تو پھر اسی وقت فوجی قوت وطاقت، قانون کی حکمرانی کے روپ میں آموجود ہوتی ہے اور پھر افراتفری، بدنظمی اور بے ترتیبی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن قانون اور معاشی تعلقات کی حتمی بنیاد، قانون نافذ کرنے والے افراد کی فوجی قوت ہی ہوتی ہے۔

اس امر میں کسی بھی قسم کا کوئی شبہ نہیں کہ تاریخی ترویج، ترقی اور نشوونما، مندرجہ بالا عمل سے مختلف رہی ہے کیونکہ ایک تو یہ بتدریج واقع ہوئی اور دوسرے یہ کسی کی محتاج نہیں تھی۔ مزید برآں،

ایک عمومی اصول کے طور پر، یہ ان افراد پر لاگو تھی جو اس وقت کے لوگوں کی نسبت زیادہ مہذب اداروں کی روایات کے مطابق زندگی بسر کر رہے تھے۔ بہرحال، مندرجہ بالا قسم کی صورت حال اس وقت بھی رونما ہو سکتی ہے جب غیر ملکی تسلط واقع ہوتا ہے، خاص طور پر اس وقت جب یہ غیر ملکی فاتحین ایک چھوٹی سی اقلیت پر مشتمل ہوں، اور زمین کی ملکیت، کسی بھی فاتح کے نام آسانی سے تلاش کی جا سکتی ہو۔ بین الاقوامی معاشی تعلقات کے حوالے سے ہم ابھی تک اس مرحلے پر نہیں پہنچے جو قانون نافذ کرنے والے اور اس کے نفاذ کی نگرانی کرنے والے افراد کی کمیٹی کی تشکیل کو ظاہر کرتا ہو۔ مزید برآں، انفرادی طور پر طاقت ور اقوام ابھی تک کمزور اقوام سے ان کو موت کی دھمکی دے کر ان سے رقوم اینٹھتی ہیں۔ اس ضمن میں تیل کے معاملے میں برطانیہ اور میکسیکو کے درمیان معاملات کی مثال دی جا سکتی ہے یا پھر یہ سب کچھ زیادہ بہتر طور پر مونرو (Monroe) حکومت کے حوالے سے زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں ایک اور اچھی اور بہترین مثال معائدہ ورسلز Versailles Treaty کی Reparation Clauses کی تھی۔ لیکن مہذب ممالک میں رائج اندرونی معاشی نظام، قانونی بنیادی اساس بہت ہی پیچیدہ اور گنجلک ہے۔ کلیسا کی آمدن کا انحصار روایتی طریقوں پر ہے، مزدور اور محنت کش، مزدوروں کی سوداکاری تنظیم کے نظام اور سیاسی قدم کے ذریعے کچھ حد تک فائدہ اٹھا چکے ہیں، بیویوں اور بچوں کے بھی حقوق ہیں جن کا انحصار معاشرے کی اخلاقی اقدار اور جذبات پر ہے۔ لیکن ریاست کی طرف جو بھی معاشی قوانین بنائے جاتے ہیں، ان کا انحصار اس فوجی قوت پر ہے جو ان قوانین کے نفاذ کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ایک نجی فرد کے معاملے میں، ریاست کی جانب سے مرتب کئے جانے والے قوانین، قانون کے متعلقہ حصے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ دیگر تمام قوانین کے مانند، قانون کا یہ حصہ بھی صرف اس وقت موثر ثابت ہوتا ہے جب رائے عامہ اس پر متفق ہو۔ ''آٹھویں حکم'' کے مطابق رائے عامہ چوری کو ایک برا فعل سمجھتی ہے اور ''چوری'' کو ایک ایسے عمل کے برابر سمجھتی ہے کہ جس کے تحت کسی بھی شخص کا مال و اسباب، رقم یا جائیداد، مروجہ قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے حاصل کی جائے۔ لہٰذا ایک نجی فرد کی معاشی قوت کا حتمی انحصار رائے عامہ یعنی اخلاقی طور پر چوری کی مذمت، اور اس کے ساتھ ساتھ علاوہ ان احساسات و جذبات پر ہے جن کے ذریعے قانون ''چوری'' کے

فعل کی تشریح و تصریح کرتا ہے، جب اس قسم کے جذبات و احساسات کمزور ہوں یا سرے سے موجود ہی نہ ہوں تو پھر نجی فرد کی جائیداد، رقم اور مال و اسباب خطرے میں پڑ جاتا ہے، مثال کے طور پر سٹالن (Stalin) نے اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز ایک مہذب ڈاکو کی حیثیت سے کیا جس نے اپنے پیشہ کو کمیونزم کے مفاد کے لئے استعمال کیا۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ پاپائے اعظم نے تیرہویں صدی میں اپنی طاقت کے ذریعے کس طرح لوگوں کو "آٹھویں احکام" کی اخلاقی بندش سے آزاد کیا تاکہ اطالوی بنکاروں پر گرفت حاصل کی جا سکے۔

ایک ملک کے اندر اگرچہ معاشی قوت و طاقت بالآخر ملکی قوانین اور رائے عامہ کے ذریعے ہی حاصل ہوتی ہے لیکن یہ بآسانی ایک آزاد حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔ معاشی قوت و طاقت بدعنوانی کے ذریعے ملکی قانون اور منظم تشہیری مہم کے ذریعے رائے عامہ کو متاثر کر سکتی ہے۔ یہ سیاست دانوں کو ایسی ذمہ داریوں کے تحت لے کر آ سکتی ہے کہ جہاں سے ان کے معاملات میں مداخلت کر سکے۔ مزید برآں، معاشی قوت، مالی بحران کے خطرے کا بھی باعث ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کی کامیابیوں کی ایک قطعی حد بھی مقرر ہے۔ جب سیزر کے قرض خواہوں کو اس کی کامیابی کے سوا رقم کی واپسی کی کوئی امید نہ رہی تو انہوں نے اقتدار حاصل کرنے میں سیزر کی مدد کی، مگر جب وہ اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ اس قدر طاقتور ہو چکا تھا کہ ان کے مطالبات سے صرف نظر کر سکے۔ چارلس پنجم (Charles V) نے شہنشاہ کے منصب کو خریدنے کے لئے فگرز (Fuggers) سے رقم ادھار حاصل کی لیکن جب وہ شہنشاہ بن گیا تو اس نے اپنی مٹھی بند کر لی اور وہ اپنی ادھار دی ہوئی رقم سے محروم ہو گئے۔[1] ہمارے اپنے زمانے میں جرمنوں کی بحالی کے ضمن میں لندن شہر کو بھی اسی تجربے میں سے گزرنا پڑا، اور اسی طرح تھائی سن (Thyssen) نے بھی ہٹلر کو اقتدار دلانے کے ضمن میں اسی طرح مدد کی۔

ایک لمحے کے لئے ایک جمہوری ملک میں طبقہ امراء کی طاقت و قوت کے متعلق غور کریں۔ یہ طبقہ امراء، ابتدائی ایام میں تھوڑی سی مقدار کے علاوہ کیلیفورنیا یا آسٹریلیا میں ایشیائی محنت کش طبقے کو متعارف کرانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مزید برآں سوداکاری تنظیموں کے نظام کو بھی یہ تباہ کرنے میں ناکام رہا۔ خاص طور پر برطانیہ میں دولت مند افراد کو بھاری محصولات سے محفوظ رکھنے سے بھی قاصر رہا۔ علاوہ ازیں، ان کی سوشلسٹوں کی منظم تشہیری مہم کے آگے کچھ پیش نہ گئی، اس

کے برعکس یہ طبقہ سوشلسٹ حکومتوں کو سوشلزم کے پرچار اور تبلیغ سے روک سکتا تھا، لیکن اگر یہ حکومتیں اپنا یہ رویہ اور طرز عمل برقرار رکھتیں تو انہیں ایک بحران پیدا کر کے اور منظم تشہیری مہم کے ذریعے شکست سے دوچار کیا جا سکتا تھا۔ اگر یہ ہتھکنڈے ناکام ثابت ہوتے تو پھر سوشلزم کے قیام کے لئے خانہ جنگی کا اہتمام بھی کیا جا سکتا تھا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جہاں معاملہ بہت ہی سادہ اور رائے عامہ قطعی نوعیت کی ہو، وہاں یہ طبقہ امراء بے بس ہو جاتا ہے، لیکن جہاں اختلافی رائے عامہ موجود ہو اور معاملات کی پیچیدگی کے باعث یہ الجھن و مشکل کا شکار ہو جائے، تو پھر یہ طبقہ امراء مطلوبہ سیاسی نتائج حاصل کر سکتا ہے۔

محنت کشوں کی قائم کردہ سوداکاری تنظیموں کے نظام کے ہاتھ میں مرتکز قوت و طاقت، دولت مند افراد کی قوت و طاقت کے اُلٹ اور متضاد ہے۔ سوداکاری تنظیمیں رنگ دار محنت کش افراد کو ملازمت پر برقرار رکھ سکتی ہیں، اپنے آپ کو ختم ہونے سے بچا سکتی ہیں، کام کے دوران مرنے والے مزدوروں کے لئے بھاری فوائد حاصل کر سکتی ہیں، آمدن پر بھاری محصول بھی حاصل کر سکتی ہیں اور اپنی طرف سے منظم تشہیری مہم چلانے کے لئے اپنی آزادی برقرار رکھ سکتی ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ تنظیمیں سوشلزم لانے میں ناکام رہیں اور نہ ہی وہ ان حکومتوں کو اقتدار میں لانے میں کامیاب ہو سکیں جو ان کی پسندیدہ تھیں لیکن اکثریت کے نزدیک یہ نہایت پسندیدہ تھیں۔

لہٰذا ایک جمہوری ملک میں معاشی تنظیموں کی طرف سے سیاسی فیصلوں پر اثر انداز ہونے کی طاقت اس رائے عامہ کے لحاظ سے محدود ہوتی ہے جو بہت سے اہم معاملات کے ضمن میں نہایت ہی شدید اور مبالغہ آرائی پر مبنی منظم تشہیری مہم کے سامنے بھی سر جھکانے سے انکار کر دیتی ہے۔ جن ممالک میں جمہوریت موجود ہوتی ہے، وہاں یہ اپنے مخالف سرمایہ داری نظام کی طرف سے حقیقت کا ادراک کرنے کی نسبت زیادہ حقیقت پسند ہوتی ہے۔

اگرچہ معاشی قوت کسی نہ کسی طرح قانون کے دائرے کے اندر کام کرتی ہے لیکن بالآخر اس کا انحصار زمین کی ملکیت اور اس کے قبضے پر ہوتا ہے، یہ کوئی وہ برائے نام زمین دار نہیں ہوتے جن کا جدید معاشرے میں بہت زیادہ اہم کردار اور حصہ ہوتا ہے۔ جاگیرداری کے زمانے میں، جو لوگ زمین کے مالک تھے، ان کے پاس ہی قوت و طاقت تھی، وہ اسی طرح مزدوروں کے معاوضوں کے معاملات طے کر سکتے تھے جس طرح State of Labourers کرتے تھے اور

قرض کے ذریعے قرض داروں کو تباہ و برباد کر ڈالتے تھے۔ لیکن جہاں نظام صنعتکاری وجود میں آیا، تو پھر قرض/ادھار کو زمین کی برائے نام ملکیت سے زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ زمین دار سوچ سمجھ کر یا بغیر سوچے سمجھے رقم ادھار لیتے اور پھر بینکوں کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا عام اصول ہے جسے عام طور پر پیداواری تراکیب اور طریقوں میں تبدیلی کا مکمل نتیجہ سمجھا جاتا ہے۔ بہر حال درحقیقت جس طرح یہ صورت حال ہندوستان میں وقوع پذیر ہوئی، جہاں زرعی تراکیب و طریقے جدید نہیں تھے، یہ سب کچھ حکومت کی طرف سے قوانین نافذ کرنے کی قوت اور عزم کا نتیجہ تھا۔ جہاں قانون مکمل طور پر طاقت ور نہیں ہوتا، رقم ادھار دینے والے افراد وقفے وقفے سے اپنے قرضداروں کے ہاتھوں قتل ہو جاتے ہیں، جو اس کے ساتھ ہی وہ دستاویزات بھی جلا دیتے ہیں جو قرض کا ثبوت ہوتے ہیں۔ شہزادے سے لے کر کسان تک جو بھی زمین کا مالک ہوتا ہے، وہ رقم ادھار لینے کا ابتداء ہی سے عادی ہو جاتا ہے، لیکن جہاں قانون کا احترام کیا جاتا ہے، وہاں ان لوگوں کو اس وقت تک سود ادا کرنا پڑتا ہے جب تک یہ لوگ تباہ و برباد نہیں ہو جاتے۔ جہاں ایسی صورت حال موجود ہوتی ہے، وہاں زمین کی ملکیت کے باعث جنم لینے والی معاشی قوت قرضدار کے ہاتھ سے نکل کر قرض خواہ کے ہاتھ میں منتقل ہو جاتی ہے۔

ایک بہت ہی بڑے جدید تجارتی ادارے میں، ملکیت اور قوت کسی نہ کسی طرح لازمی طور پر یکجا ہو جاتی ہیں۔ جس طرح یہ صورت حال ریاست ہائے متحدہ امریکا میں بدرجہ اتم موجود ہے، اس کے متعلق برلے (Berly) اور میز (Means) کی ایک بہت ہی اہم کتاب "The Modern Corporation and Private Property" (1932) میں نہایت زوردار انداز میں ذکر کر دیا گیا ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ ملکیت اگرچہ قوت کا ذریعہ نہیں بنتی لیکن معاشی قوت، طاقت واقتدار کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ مزید برآں، ایک نہایت ہی محتاط اور محنت آمیز تحقیق کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ دو ہزار افراد ریاست ہائے متحدہ امریکا کی نصف صنعت پر قابض ہیں (صفحہ 33)۔ وہ جدید زمانے کے تجارتی اداروں کے سربراہوں کو قدیم زمانے کے شہنشاہوں اور پاپا ہائے اعظم کی طرح سمجھتے ہیں، ان کی رائے میں سکندر اعظم جیسے افراد کو آدم سمتھ (Adam Smith) کی کتابوں میں موجود مذکور کاروباری افراد کا جانشین سمجھنے کی بجائے ان کی زندگیوں کے مطالعے ہی سے بہت کچھ سیکھا اور معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ یہ دلیل

بھی دیتے ہیں کہ ان بڑے بڑے تجارتی اداروں کے ہاتھوں میں قوت و طاقت کا ارتکاز قدیم زمانے میں کلیسا یا قومی ریاست کے مترادف ہے، اور اسی کے باعث یہ تجارتی ادارے ریاست کے ساتھ یکساں انداز میں مقابلہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

اس امر کی آگاہی اور ادراک تو بہت ہی آسان ہے کہ قوت کا یہ ارتکاز کس طرح عمل میں آتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک ریلوے کمپنی کے عام حصہ دار کو کمپنی کی انتظامیہ میں کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوتی، کیونکہ اس کی رائے کو اتنی ہی اہمیت دی جاتی ہے جنہیں ایک عام رائے دہندہ کی رائے کی اہمیت پارلیمانی انتخاب کے ذریعے ملک کا انتظام و انصرام چلانے کے حوالے سے ہوتی ہے، لیکن عملی طور پر اس کی اہمیت اس سے بھی کم ہوتی ہے۔ ریلوے کی معاشی قوت و اختیار چند ہاتھوں میں ہوتا ہے، اور امریکا میں یہ طاقت و اختیار عموماً صرف ایک ہی شخص کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ہر ترقی یافتہ ملک میں معاشی قوت و اختیار کا زیادہ تر حصہ افراد کے ایک چھوٹے سے گروہ یا ادارے کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ افراد نجی سرمایہ دار ہوتے ہیں، جیسے امریکا، فرانس اور برطانیہ میں، اور بعض اوقات یہ افراد سیاستدان ہوتے ہیں، جس طرح جرمنی، اٹلی اور روس میں۔ موخر الذکر صورت حال اس وقت واقع ہوتی ہے جب معاشی اور سیاسی قوتیں باہم اشتراک کر لیتی ہیں۔ چند ہاتھوں میں معاشی قوت و طاقت کا ارتکاز ایک عام معمول ہے لیکن یہ رجحان معاشی قوت کے حوالے سے نہیں بلکہ عمومی قوت و اختیار کے لحاظ سے مستعمل ہے۔ سیاسی اور معاشی قوت میں ادغام پر مبنی نظام، ان دونوں اداروں کے ابتدائی مراحل میں نہیں بلکہ ان کے عظیم اداروں میں ڈھل جانے پر مشتمل آخری مراحل کے ذریعے قائم ہوتا ہے، عین اسی طرح جس طرح سٹیل ٹرسٹ (Steel Trust) کی ترقی کے آخری مراحل پر فولاد تیار کرنے والے بے شمار مسابقتی ادارے اس کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ لیکن ابھی بھی، میں ایک آمرانہ اور مطلق العنان حکومت کے متعلق گفتگو کرنا نہیں چاہتا۔

معاشی قوت و اختیار کے ارتکاز کے ذریعے فوجی قوت و طاقت یا منظم تشہیری مہم کی قوت بھی حاصل کی جا سکتی ہے لیکن صورت حال اس کے الٹ بھی ہو سکتی ہے۔ قدیمی صورت حال میں عام طور پر فوجی طاقت دیگر مقاصد کے لئے استعمال ہوتی ہے، مثلاً مختلف ممالک کے درمیان تعلقات کے قیام کے حوالے سے فوجی قوت اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ سکندر اعظم، ایرانیوں کے

مانند دولت مند نہیں تھا، اور اس طرح رومی، اہلِ کیتھرجن کے مانند امیر نہیں تھے، لیکن ان ہر دو معاملات میں اپنے دشمنوں پر فتح پانے کے ذریعے یہ دونوں اپنے دشمنوں کے مقابلے میں امیر ہو گئے۔ اسی طرح مسلمان اپنی فتوحات کے ابتدائی زمانے میں بازنطینیوں سے کہیں غریب تھے، اسی طرح ٹیوٹانک حملہ آور، مغربی سلطنت کے مقابلے میں انتہائی غریب تھے۔ ان تمام معاملات میں فوجی قوت، معاشی قوت کا بنیادی ذریعہ تھی لیکن عرب قوم میں پیغمبر اور اس کے خاندان کی فوجی اور معاشی قوت منظم تشہیری مہم کے ذریعے حاصل کی گئی، اسی طرح جیسے مغربی ممالک میں کلیسا نے طاقت اور دولت حاصل کی۔

ہمارے پاس بے شمار ایسے ممالک کی مثالیں موجود ہیں جنہوں نے معاشی قوت کے ذریعے فوجی اقتدار حاصل کیا۔ اس ضمن میں زمانہ قدیم کے لحاظ سے سمندر سے ملحق یونانی شہر اور کارتھیج (Carthage) بہت ہی مشہور مثالیں ہیں، پھر ازمنہ وسطیٰ میں اطالوی عوامی جمہوریتیں، اور پھر اس جدید زمانے میں پہلے ہالینڈ اور پھر انگلستان، بہت ہی مشہور مثالیں ہیں۔ جزوی طور پر انگلستان کو چھوڑ کر ان تمام ممالک میں صنعتی انقلاب کے بعد معاشی قوت کا انحصار تجارت پر نہیں بلکہ خام مال کی ملکیت پر تھا۔ بعض شہروں اور ممالک نے مہارت اور جغرافیائی سہولتوں کے باہمی تعامل کے ذریعے تجارت پر جزوی اجارہ داری حاصل کی۔ (صرف موخرالذکر صورت حال ہی کافی نہ تھی کہ جس طرح سترہویں صدی میں سپین کے زوال کی صورت حال پیدا ہوئی)۔ تجارت کے ذریعے حاصل ہونے والی دولت کو جزوی طور پر منافع جات حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا گیا اور اس طرح اسے فوجی طاقت و اقتدار کے حصول کے ایک ذریعے کے طور پر اپنایا گیا۔ اس طریقے میں خرابی اور نقص یہ تھا کہ اس میں بغاوت یا وسیع پیمانے پر دھوکے بازی کا خطرہ موجود تھا۔ اسی وجہ کے باعث میکاولی اس طریقے کے خلاف ہے اور شہریوں پر مشتمل افواج کے حق میں آواز اٹھاتا ہے۔ اس کا یہ موقف تو تجارت سے بھرپور ایک بہت بڑے ملک کے ضمن میں تو مفید ثابت ہو گا لیکن یونانی شہری ریاستوں یا چھوٹی اطالوی جمہوریت کے ضمن میں بے کار تھا۔ تجارت کی بنیاد پر قائم معاشی قوت و طاقت صرف اس وقت مستحکم رہ سکتی ہے جب اس کا تعلق ایک بڑے ملک یا ایک ایسے ملک سے ہو جو اپنے پڑوسی ممالک کی نسبت زیادہ تہذیب یافتہ ہو۔

بہر حال تجارت اپنی اہمیت کھو چکی ہے۔ ذرائع مواصلات میں بہتری اور ترقی کے باعث

جغرافیائی حالات پہلے جیسے اہم نہیں رہے، اور پھر استعماریت کے باعث اہم ممالک کو اب پہلے کی طرح بیرونی تجارت کی ضرورت نہیں رہی۔ بین الاقوامی تعلق داری میں معاشی قوت و طاقت کی اہم صورت اب خام مال اور خوراک کی ملکیت ہے، اور سب سے اہم خام مال وہ ہیں جو جنگ کے لئے درکار ہوتے ہیں۔ لہٰذا اب فوجی اور معاشی قوت میں امتیاز بہت ہی مشکل ہے۔ مثال کے طور پر تیل کے متعلق غور کیجئے ایک ملک تیل کے بغیر جنگ لڑ نہیں سکتا اور تیل کے کنوؤں پر اس وقت تک قبضہ نہیں کر سکتا جب تک یہ لڑنے کے قابل نہ ہو۔ اس میں سے کوئی بھی صورت اور شرط بے کار ثابت ہو سکتی ہے، اہل فارس کے لئے ان کا تیل ان کے لئے بے کار ہے کیونکہ ان کے پاس مناسب اور معقول مسلح افواج نہیں ہیں، اور جرمنی کی مسلح افواج اس کے لئے اس وقت بے کار ہو گی جب تک انہیں تیل نہیں مل جاتا۔ خوراک کے بارے میں بھی ایسی ہی صورت حال موجود ہے، ایک طاقت ور اور مضبوط جنگی قوت بننے کے لئے خوراک کی پیداوار کی صورت میں مختلف اقسام کی قومی توانائیاں درکار ہیں، لہٰذا ایک ملک ایک مضبوط اور طاقت ور جنگی قوت صرف اس وقت ہی بن سکتا ہے جب اس کی مسلح افواج ایک وسیع زرخیز علاقے پر قابض ہوں۔

معاشی اور فوجی قوتیں، آج کے اس عہد جدید کی نسبت ماضی میں کبھی بھی اس قدر باہم منسلک نہیں رہیں کوئی بھی قوم ایک ترقی یافتہ صنعتی نظام اور خام مال کے علاوہ خوراک تک رسائی و ملکیت کے بغیر مضبوط نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس، یہ فوجی قوت و طاقت ہی ہوتی ہے جس کے ذریعے ایک قوم وہ خام مال حاصل کر لیتی ہے جو اس کے اپنے علاقے میں موجود نہیں ہوتے۔ جنگ کے دوران، جرمنی نے رومانیہ کی فتح کے ذریعے اس کا تیل اور یوکرائن کی فتح کے ذریعے اس کی فصلیں حاصل کر لیں اور جو ممالک اپنا خام مال منطقہ حارہ کے علاقوں سے حاصل کرتے ہیں، اپنی نوآبادیوں کو اپنی یا اپنے اتحادیوں کی فوجی طاقت کے ذریعے برقرار رکھتے ہیں۔

تعلیم کے پھیلاؤ کے باعث قومی قوت و طاقت کے حوالے سے منظم تشہیری مہم کا کردار اب پہلے سے زیادہ ہو گیا ہے۔ جدید دور کی جنگ میں ایک قوم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک لوگوں کی کثیر تعداد مشکلات برداشت کرنے کے لئے تیار اور بہت سے لوگ مرنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ ان میں یہ آمادگی پیدا کرنے کے لئے حکمرانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے عوام کو یہ یقین دلا دیں کہ یہ جنگ ایک اہم مقصد کے لئے ہے، ایک ایسا اہم مقصد جس کے لئے جان بھی قربان کی

جا سکتی ہے۔ جنگ میں اتحادیوں کی فتح کی ایک بڑی وجہ منظم تشہیری مہم تھی، مزید برآں، 1919 سے 1920 کے درمیانی سالوں میں سوویت فتح کی بھی یہی واحد وجہ تھی۔ یہ حقیقت تو نہایت ہی واضح ہے کہ یہی وجوہات جو فوجی اور معاشی قوت کے باہمی تعلق اور الحاق پر منتج ہوتی ہیں، انہی وجوہات کی باعث یہ دونوں قوتیں باہم مل کر اپنے اقتدار کے لئے منظم تشہیری مہم کو اپناتی ہیں۔ دراصل ایک واحد ادارے میں جو لازمی طور پر ایک ملک ہونا چاہئے، تمام قسم کی قوتوں کو یکجا کرنے کا عمومی رجحان موجود ہے۔ جب تک مخالف قوتیں اپنا کردار ادا نہیں کرتیں اس وقت تک اقتدار و اختیار کی مختلف اقسام کے درمیان امتیاز جلد ہی محض ایک تاریخی دلچسپی کا امر اختیار کر جائے گا۔

اس مرحلے پر ہمیں کارل مارکس کے ایک معقول نظریئے پر غور کرنا ہوگا جس کے مطابق سرمایہ دارمی نظام کے تحت عوام میں سے مختلف جنگی طبقات پیدا کئے جاتے ہیں جو بالآخر اپنے ہر قسم کے مخالفین پر قابو پالیں گے۔ اس مرحلے پر مارکس کے اس نظریئے کی تشریح کسی بھی طرح آسان نہیں ہے لیکن محسوس ایسے ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک زمانہ ہائے امن میں تمام معاشی قوتوں کا تعلق زمین داروں اور سرمایہ داروں سے ہوتا ہے جو اپنی گرفت کو انتہائی حد تک کریں گے، اور اس طرح محنت کش طبقے میں بغاوت اور سرکشی کا جذبہ پیدا ہوگا۔ ایک وسیع اکثریت کی حیثیت سے یہ مزدور اور محنت کش طبقہ، جیسے ہی متحد ہوگا، اسی قدر جلد ہی یہ جنگ جیت لے گا اور جلد ہی ایک ایسا نظام وضع کرے گا جس کے ذریعے زمین اور سرمایے کے ذریعے جنم لینے والی معاشی قوت کا رخ مجموعی طور پر تمام معاشرے کی طرف ہو جائے گا۔ یہ نظریہ، مارکس کے نظریے کے مطابق ہو نہ ہو، لیکن اگر وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو یہ نظریہ جدید دور میں موجود کمیونسٹوں کے نظریے کے عین مطابق ہے، لہٰذا اس کا جائزہ اور تجزیہ قابل قدر اہمیت کا حامل ہے۔

یہ نظریہ کہ تمام معاشی قوت کا تعلق زمین داروں اور سرمایہ داروں سے ہوتا ہے، ایک ایسا نظریہ ہے، جو اگرچہ اندازاً درست ہے، لیکن میرے خیال کے مطابق پھر بھی اہم حدود و قیود کا حامل ہے۔ زمین دار اور سرمایہ دار، مزدوروں اور پھر ہڑتالوں کے بغیر بے بس ہیں، لیکن جب ان کی تعداد مناسب اور معقول ہو جاتی ہے اور ان کے کاروبار وسیع ہو جاتے ہیں، وہ مزدور طبقے کے لئے معاشی قوت کا ایک حصہ محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ لیکن ہڑتالوں کے متعلق امکانات ایک ایسا معقول و مانوس نظریہ ہے کہ اس کے متعلق میں مزید کچھ نہیں کہنا چاہوں گا۔

یہاں دوسرا سوال جو پیدا ہوتا ہے، وہ یہ ہے: درحقیقت کیا سرمایہ دار اپنی طاقت وقوت کو زیادہ سے زیادہ اپنے مفاد کے لئے استعمال کریں گے؟ اب جہاں وہ عقلمندی اور فہم وفراست سے کام لیں گے، وہ یہ کام محض اس خوف کی بنا پر نہیں کریں گے کہ جس طرح کے نتائج مارکس کے پیشِ نظر تھے۔ اگر وہ اپنی کامیابی، منافعے اور خوشحالی میں کاریگروں کو بھی کسی حد تک شریک کرتے ہیں تو وہ کارکنوں کو انقلابی حیثیت اختیار کرنے سے روک سکتے ہیں۔ اس اصول یا اندازِ فکر کی سب سے مشہور مثال ریاست ہائے متحدہ امریکا میں دیکھی جا سکتی ہے جہاں تمام کے تمام ماہر کاریگر قدامت پرست ہیں۔

اگر ہم فرض کرلیں کہ پرولتاری اکثریت میں ہیں، تو اس پر بہت زیادہ اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ یہ صورت حال اور اصول ان زرعی ممالک میں قطعی طور پر سچائی کی حامل نہیں ہے جہاں کسان زمینوں کے مالک ہوتے ہیں۔ اور ان ممالک میں جہاں دولت بکثرت موجود ہوتی ہے اور اس کے ختم ہونے کا بھی امکان نہیں ہوتا، اکثر لوگ جو معاشی نقطہ نظر کے مطابق پرولتاری ہوتے ہیں، وہ سیاسی طور پر دولت مند افراد کے حامی ہوتے ہیں کیونکہ ان کی ملازمت کا انحصار تعیّشات کے مطالبات پر ہوتا ہے۔ اگر کسی نہ کسی طرح مختلف طبقات کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے تو پھر یہ جنگ یقینی طور پر پرولتاری طبقے کی فتح پر منتج ہوگی۔

اور پھر آخر میں یہ بھی ہے کہ کسی بحران کے موقعے پر عوام کی اکثریت طبقاتی امتیاز سے بے نیاز ہو کر قوم پرستی کے جذبے کا اظہار کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ صورت حال ہمیشہ ہی موجود ہو، لیکن 1914 سے اب تک اس صورت حال میں تبدیلی کے کسی بھی قسم کے آثار ناپید ہیں جب تقریباً تمام برائے نام عالمگیریت کے حامی محبّ وطن اور جنگجو بن گئے۔ اس لئے طبقاتی جنگ کا امکان اگرچہ مستقبل بعید میں بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے، پھر بھی اس کا امکان بمشکل ہی محسوس ہوتا ہے کیونکہ قومی خانہ جنگی کا خطرہ اسی قدر زیادہ ہوتا ہے جس طرح موجودہ زمانے میں موجود ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ سپین میں موجودہ خانہ جنگی اور دوسرے ممالک میں اس کا ردعمل، اس امر کا شاہد ہے کہ اب خانہ جنگی پر مبنی انداز فکر، قوم پرستانہ جذبات پر حاوی ہو چکا ہے۔ بہرحال میرا نہیں خیال ہے کہ حالات کا بہاؤ اس نقطہ نظر کا غماز ہے۔ فرانکو کی حمایت کرنے کے لئے جرمنی اور اٹلی کے پاس قوم پرستی پر مبنی بنیادیں اور وجوہات موجود ہیں، جبکہ برطانیہ اور فرانس کے پاس اس کی

مخالفت کرنے کے لئے بھی یہی سہارا موجود ہے۔ یہ تو سچ ہے کہ انگلستان کی جانب سے فرانکو کی مخالفت اس مخالفت سے کہیں کم رہی ہے، جو اس وقت ہوتی جب صرف اور صرف برطانوی مفاد ہی حکومت کے طرف سے کسی عملی قدم کا تعین کرتا کیونکہ قدرتی طور پر قدامت پرست اس کے ساتھ تھے۔ بہرحال، جہاں تک مراکش میں موجود خام مال (معدنیات اور دیگر وسائل) یا بحرہ روم میں سمندری برتری جیسے معاملات کا تعلق ہے، برطانوی مفادات، سیاسی ہمدردیوں پر غالب آجاتے ہیں۔ روسی انقلاب کے باوجود، عظیم طاقتوں کا باہم اتحاد دوبارہ اسی طرح ہے جیسے یہ 1914 سے پہلے تھا۔ آزاد خیال زار کو ناپسند کرتے تھے جبکہ قدامت پرست سٹالن کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن نہ تو سرای گرے (Sir E. Gray) اور نہ ہی برطانوی حکومت اس قسم کی صورت حال کی اجازت دے سکتے تھے جس کے باعث برطانوی مفادات پر ضرب لگتی۔

اس باب کا خلاصہ اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے، فوجی اکائی (اس میں کئی ایک آزاد اور خودمختار ریاستیں شامل ہوسکتی ہیں) کی معاشی قوت کا انحصار مندرجہ ذیل عناصر پر ہے:

ا۔ اپنے علاقے کے دفاع کی صلاحیت اور استعداد

ب۔ دوسرے ممالک کے علاقوں کے لئے خطرہ بن جانے کی صلاحیت و استعدد

ج۔ خام مال، خوراک اور صنعتی مہارت پر ملکیت و قبضہ

د۔ دیگر فوجی اکائیوں کو مطلوب اشیاء اور خدمات فراہم کرنے کی صلاحیت اور استعداد

مندرجہ بالا تمام صورتِ احوال میں معاشی اور فوجی عناصر ناقابل فہم انداز میں یکجا ہو جاتے ہیں، مثلاً جاپان نے صرف اور صرف اپنی فوجی قوت کے بل بوتے پر چینی خام مال پر قبضہ کرلیا ہے جو اس کی عظیم فوجی طاقت کے لئے ضروری ہے اور اسی طرح انگلستان اور فرانس نے مشرقِ قریب میں تیل پر قبضہ کرلیا ہے لیکن یہ دونوں طرح کی صورت حال گزشتہ دور میں بے پناہ صنعتی ترقی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ زمانہ جنگ میں معاشی عناصر کی اہمیت، اس وقت مسلسل اور متواتر بڑھتی جاتی ہے جب جنگ زیادہ سے زیادہ مشینی اور سائنسی ہوتی جاتی ہے۔ لیکن یقینی طور پر یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ برتر معاشی وسائل کی حامل قوت لازمی طور پر فتح مند ہوگی۔ قوم پرستانہ جذبات و احساسات پیدا کرنے کے حوالے سے جس قدر اہمیت معاشی عناصر کو حاصل ہے، اسی طرح منظم تشہیری مہم بھی یکساں اہمیت کی حامل ہے۔

ایک واحد ملک کی اندرونی معاشی صورت حال کے مطابق ہی وہاں کے قوانین طے کرتے ہیں کہ دوسرے ممالک سے دولت حاصل کرنے یا ان کی دولت پر قبضہ کرنے کے ضمن میں کیا طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ جس قسم کی اجارہ داری کے دوسرے ممالک یا افراد خواہاں ہوتے ہیں، ایک فرد یا جماعت کو بھی لازمی طور پر اس قسم کی مکمل یا جزوی اجارہ داری حاصل ہونی چاہیئے۔ یہ اجارہ داریاں قانون کے نفاذ کے ذریعے بھی تخلیق کی جاسکتی ہیں، مثلاً تجارتی اشیاء کے نام کے حقوق، ایک مصنف کی شائع شدہ کتاب کی ملکیت کے حقوق، یا زمین کی ملکیت کے حقوق۔ یہ اجارہ داریاں باہمی طور پر مل جل کر بھی پیدا کی جاسکتی ہیں، مثلاً کسی فلاحی مقصد کے لئے تشکیل دیئے جانے والے وقف ادارے یا کارکنوں کی سوداکاری تنظیمیں۔ ایک فرد یا جماعتیں جو کچھ سوداکاری کے ذریعے حاصل کرتی ہیں، تو اس صورت میں ریاست کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ بوقتِ ضرورت زبردستی حاصل کرلیا جائے۔ اور پھر بارسوخ جماعتیں ریاست کو اپنا یہ حق استعمال کرنے پر اُکسا سکتی ہیں، علاوہ ازیں یہ بارسوخ جماعتیں ریاست کو جنگ چھیڑنے پر اس انداز میں مجبور کرسکتی ہیں اگر چہ یہ قدم قوم کے مفاد میں نہ ہو، لیکن ان کے لئے مفید ثابت ہو، اس کے علاوہ وہ ریاستی قانون کو بھی اپنے حق میں ڈھال سکتے ہیں، مثلاً یہ بارسوخ جماعتیں کارکنوں کی بجائے آجروں کے اتحاد کو ممکن بنا سکتی ہیں۔ لہٰذا ایک فرد یا جماعت کے پاس موجود معاشی قوت کی اصل اہمیت کا انحصار فوجی طاقت وقوت پر ہوتا ہے، اور منظم تشہیری مہم کے ذریعے دباؤ اور طاقت کا حصول قطعی طور پر ان عناصر پر ہوتا ہے جو عام طور پر معاشیات میں پیش نظر رکھے جاتے ہیں۔ معاشیات کی ایک مختلف الگ تھلگ اور سائنسی حیثیت غیر حقیقی ہے اور اس صورت میں گمراہ کن ہے، اگر اسے علمی راہنمائی کے طور پر اختیار کیا جائے۔ اگر وسیع تناظر میں دیکھا جائے، یہ سچ ہے کہ یہ ایک ایسا واحد عنصر ہے، جو ہر قسم کی قوت وطاقت کی بنیاد ہے۔

حوالہ جات

1- فگرز (Fuggers)، ہیپس برگز (Hapsburgs) کو رقم ادھار دینے سے کبھی بھی انکار نہیں کرسکتے تھے۔ انہوں نے نہ صرف چارلس پنجم بلکہ اس سے پہلے شہنشاہ میکسی میلین

(Maximilian) کو بھی رقم ادھار دی، اور اس کے بعد ان کے ہسپانوی جانشینوں کو بھی قرض کے طور پر رقم دی۔ Fuggers News Letters کے تعارفی کلمات کے مطابق: "ہسپانوی بادشاہوں نے فگرز سے کم از کم چار ملین طلائی سکّے ادھار لئے اور کبھی بھی واپس نہیں کیے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ آرائی نہیں ہوگی ہیپس برگرز کے ساتھ کاروبار میں انہیں اندازاً آٹھ ملین فلورنز (Florins) کا نقصان ہوا۔ لیکن فگرز کے نزدیک جرمنی میں اصلاحات، بغیر کسی مخالفت کے مغرب و مشرق میں ممکنہ طور پر ان کے لئے فتح کا باعث ہوتیں۔ اس گھر (House) کے سب سے قابل ترین اراکین صدیوں تک کوشش کرتے رہے لیکن رقم ادھار لینے کی دستاویزات کے ایک ڈھیر اور زمینیں رہن رکھنے کے کاغذات کے سوا ان کے پاس کچھ نہ بچا۔

نواں باب

اقتدار بذریعہ انتخاب (رائے عامہ)

یہ نقطہ نظر اور موقف نہایت آسانی سے اختیار کیا جا سکتا ہے کہ رائے عامہ (انتخاب) ہی سب سے برتر اور فائق ہے اور ہر قسم کا اقتدار و اختیار یہیں سے تخلیق پذیر ہوتا ہے۔ افواج اس وقت تک ناکارہ ثابت ہوتی ہیں جب تک فوجی اس وجہ اور سبب کو سمجھ نہیں پاتے جس کے لئے وہ لڑ رہے ہوتے ہیں، یا پھر کرائے کے فوجیوں کی حیثیت سے انہیں یہ اعتماد نہیں ہوتا کہ ان کا سالار انہیں فتح سے ہمکنار کر دے گا۔ اسی طرح ملکی قوانین کی بھی اس وقت تک اہمیت نہیں ہوتی جب تک رائے عامہ اس کا احترام نہیں کرتی اور عمومی طور پر ان کی پابندی نہیں کی جاتی۔ معاشی اداروں کا انحصار قانون کے احترام اور اس کی پابندی پر ہوتا ہے، غور فرمایئے، مثال کے طور پر اگر ایک عام شہری جعل سازی اور دھوکے بازی کو قابلِ اعتراض اور برا نہیں سمجھے گا تو پھر نظامِ بنکاری کا کیا حال ہوگا۔ عام طور پر مذہبی عقائد، ریاستی عقائد سے زیادہ طاقت ور ثابت ہوتے ہیں۔ اگر کسی ملک میں عوام کی اکثریت سوشلزم کے حق میں ہو تو وہاں سرمایہ داری نظام ناقابلِ عمل ہو جاتا ہے۔ ان تمام مباحث اور تصریحات کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ معاشرتی معاملات میں رائے عامہ ہی حتمی طور پر فائق و برتر ہے۔

لیکن یہ اصول نصف سچ ہوگا کیونکہ یہ اصول طے کرتے ہوئے اُن عناصر کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جن کے باعث رائے عامہ تشکیل پاتی ہے۔ جب یہ حقیقت اور سچ ہے کہ فوجی قوت و طاقت میں ''رائے'' ایک لازمی عنصر کی حیثیت رکھتی ہے، اسی طرح یہ بھی سچ ہے کہ فوجی طاقت و قوت ''رائے'' تخلیق کرتی ہے۔ اس وقت تقریباً ہر یورپی ملک ایک ایسے مذہب کا پیروکار ہے جو سولہویں صدی کے آخر میں، ایک حکومت کی حیثیت سے موجود تھا اور اس صورت حال کو، کئی

ممالک میں مسلح افواج کی طرف سے صرف ترغیب وتحریک اور منظّم تشہیری مہم ہی کا مرہونِ منت قرار دیا جا سکتا ہے۔ روایتی طور پر ذہنی اسباب کی بنا پر رائے عامہ کا احترام کیا جاتا ہے لیکن یہ چند فوری وجوہات کے باعث ہی درست اور صحیح سمجھا جاتا ہے۔ عام طور پر پس منظر میں ایک ایسی قوت موجود ہوتی ہے جو اس عقیدے کی حامی ہوتی ہے۔

اس کے برعکس، ایک عقیدے یا نظریے کی تخلیق کسی قوت وطاقت کی مرہونِ منت نہیں ہوتی اور ایک وسیع رائے عامہ کی تشکیل میں ابتدائی اقدامات صرف ترغیب وتحریک ہی پر مشتمل ہوتے ہیں۔

لہٰذا، ہمیں اس وقت ایک الجھی ہوئی صورت حال پیش آتی ہے۔ پہلے تو یہ کہ خالص ترغیب وتحریک کے ذریعے اقلیتی رائے کو تبدیل کیا جا سکتا ہے، اور پھر بقایا رائے عامہ کو برقرار رکھنے کے لئے استعمال کی جانے والی قوت صحیح منظّم تشہیری کی مرہونِ منت ہوگی، اور پھر آخرکار، عظیم اکثریت کا بنیادی عقیدہ سامنے آتا ہے جو قوت کے استعمال کو دوبارہ غیر ضروری بنا دیتا ہے۔ رائے عامہ کے بعض ادارے پہلے مرحلے کو ہی عبور نہیں کر پاتے، جبکہ کچھ دوسرے مرحلے تک پہنچ جاتے ہیں اور پھر ناکام ہو جاتے ہیں، اور بعض ادارے ان تینوں مراحل میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن کروموبل کے زمانے میں ان مراحل تک رسائی حاصل نہ کرنے والے اداروں نے ریاستی قوت حاصل کی لیکن اقتدار کے حصول کے بعد وہ اپنی منظّم تشہیری مہم میں ناکام ہو گئے۔ تین صدیوں پر مشتمل کوشش کے بعد کانسٹینٹین (Constantine) کے عہد میں ریاست کے اقتدار پر قبضہ کر لیا، اور پھر طاقت وقوت کے بل پر منظّم تشہیری مہم کا ایک ایسا نظام قائم کر دیا جس نے اپنے تقریباً تمام مخالفین کے عقائد تبدیل کر دیئے اور مسیحیت کو ظلم واستبداد پر مبنی حملے اختیار کرنے کے قابل بنا دیا۔ مارکس نظریہ دوسرے مرحلے تک پہنچ چکا ہے، اگرچہ روس میں یہ تیسرے مرحلے تک نہیں پہنچا، لیکن اس کے علاوہ یہ ہر جگہ پہلے مرحلے تک ہی محدود ہے۔

بہرحال کسی بھی مرحلے پر قوت وطاقت کے استعمال بغیر رائے عامہ کے اثر ورسوخ کی کچھ اہم مثالیں بھی موجود ہیں۔ ان میں سے سب قابلِ ذکر سائنس کی رونمائی اور عروج ہے۔ عہدِ حاضر میں مہذب ممالک میں ریاست سائنس کی نشو ونما میں مدد دیتی ہے لیکن اپنے ابتدائی زمانے میں سائنس، ریاستی حمایت اور حوصلہ فزائی سے محروم تھی۔ گلیلیو (Galileo) کو اپنے

نظریات سے دستبردار ہونا پڑا، نیوٹن کو ٹکسال کا سربراہ بننے سے روک دیا گیا، لیوو زیر کو گلوٹین کا سامنا کرنا پڑا۔ بہرحال پھر بھی یہ افراد اور ان جیسے چند دیگر افراد جدید دنیا کے تخلیق کار تھے، اور یسوع مسیح وارسطو کو چھوڑ کر معاشرتی زندگی پر ان کے اثرات تاریخ عالم میں موجود کسی بھی ہستی سے کہیں زیادہ تھے۔صرف ایک شخص جس کا اثر مقابلتاً اہم تھا، فیثا غورث (یونانی فلسفی) تھا لیکن اس کی موجودگی مشکوک نظر آتی ہے۔

انسانی معاملات میں ایک قوت اور اثر کی حیثیت سے ''منطق اور وجہ'' کی مذمت، اس عہد میں ایک روایت اور معمول کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ حالانکہ دوسری طرف، سائنس کی رونمائی اور عروج ایک غالب اور عظیم وجہ اور استدلال کی حیثیت سے موجود ہے۔ سائنسی علوم میں ماہر افراد، اَن پڑھ اور جاہل افراد سے زیادہ ذہین اور سمجھدار ثابت ہوئے، یعنی ایک مخصوص قسم کی ذہانت، فوجی بہادری وشجاعت اور دولت کا سبب بنتی ہے، اور یہ دونوں قسم کی ذہانتیں اس قدر شدید طور پر مطلوب ہوئیں کہ ایک نئی قسم کی ذہانت، مذہب کی روایتی قوت اور آمدنیوں کے علاوہ کیتھولک مذہبی عقائد کے ساتھ منسلک جذباتی وابستگی کے باوجود ازمنہ وسطیٰ میں موجود ذہانت پر غالب آ گئی۔ دنیا نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ حضرت موسیٰ کے جانشین جوشوا (Joshua) نے سورج کو ٹھہر جانے پر مجبور کر دیا تھا کیونکہ عقربی علم نجوم، جہاز رانی کے لئے مفید و مددگار تھا، سائنس کے باعث ارسطو کے طبیعاتی نظریے ترک کر دیئے گئے کیونکہ زمین پر گرتے ہوئے اجسام پر مبنی گلیلیو کے نظریے نے توپ کے گولے کے خط پرواز کی پیمائش کو ممکن بنا دیا تھا۔ سائنس کے باعث سیلاب کے قصے کو مسترد کر دیا گیا کیونکہ علم الارضیات نے کان کنی کی ممکن حیثیت کو نمایاں اور واضح کر دیا تھا۔ اب یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ زمانہ جنگ کے علاوہ زمانہ امن میں موجود صنعتوں کے لئے سائنس ناگزیر ہے، اور یہ بھی سائنس کے بغیر کوئی بھی قوم نہ تو دولت مند ہو سکتی ہے اور نہ ہی طاقت وقوت حاصل کر سکتی ہے۔

رائے عامہ پر یہ تمام اثر سائنس نے محض اس حقیقت کو متاثر کرنے کے ذریعے حاصل کیا: عمومی نظریات کے بارے سائنس کا جو بھی موقف ہو، ممکن ہے کہ اس پر اعتراض کیا جا سکے، لیکن اس کے طریقہ کار کے حوالے سے اس کا نتیجہ سب کے لئے یکساں اور مستند تھا۔ سائنس نے سفید فام فرد کو اس دنیا کی فرمانروائی عطا کی، لیکن یہ فرمانروائی اس وقت زوال پذیر ہونا شروع ہو

گئی جب جاپانیوں نے یہ طریقہ کار اپنا لیا۔

اس مثال کے ذریعے عمومی لحاظ سے استدلال کی قوت کے بارے کچھ نہ کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ سائنس کے معاملے میں منطق تعصب پر غالب آ گئی کیونکہ منطق نے موجود مقاصد کے ادراک کے راستے فراہم کیے، اور اس لئے بھی کہ یہ ثابت ہو گیا کہ جو کچھ بھی اس نے کیا، فائق اور برتر حیثیت کا حامل تھا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انسانی معاملات میں منطق اور استدلال کی کوئی اہمیت نہیں، وہ یہ دو شرائط نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اگر محض استدلال کی خاطر آپ کسی شخص کو اپنے بنیادی مقاصد تبدیل کرنے کے لئے کہتے ہیں، یعنی کہ وہ شخص اپنی قوت و طاقت کے بجائے اپنے لئے عمومی خوشی کے حصول کے لئے کوشش کرے، آپ ناکام ہو جائیں گے اور آپ ناکام ہونے کے مستحق ہوں گے کیونکہ صرف استدلال اور منطق کے ذریعے زندگی کے مقاصد کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ اور آپ اس وقت بھی ناکام ہو جائیں گے جب آپ اپنی جڑوں میں موجود تعصب پر حملہ کرتے ہیں جبکہ آپ کے استدلال پر ابھی بھی اعتراض کیا جا سکتا ہے، یا پھر اس قدر مشکل ہے کہ سائنسی علوم میں ماہر فرد ہی اس کی قوت و طاقت محسوس کر سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ ثبوت کے ذریعے اسے ثابت کر سکتے ہیں جو ہر اس معقول اور سمجھدار شخص کے لئے قابلِ قبول ہے جو اس کا جائزہ لینے کی زحمت گوارا کرتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ کے پاس آپ کی موجودہ خواہشات کی تکمیل کو آسان بنانے کے لئے ذرائع موجود ہیں تو پھر آپ کسی حد تک اعتماد کے ساتھ یہ توقع کر سکتے ہیں کہ آخر کار دوسرے افراد آپ کے کہے پر یقین کر لیں گے۔ درحقیقت اس میں لازمی شرط یہ ہے کہ جن موجودہ خواہشات کی آپ تکمیل کر سکتے ہیں، ان افراد کی ہوتی ہیں جن کے پاس ان کے حصول کی قوت ہوتی ہے، یا وہ انہیں حاصل کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔

جہاں تک انسانی معاملات میں استدلال یا منطق کی اہمیت و قوت کا تعلق ہے، میں اب تحریک و ترغیب کی ایک اور کمزور شکل کی طرف آتا ہوں، یعنی مذاہب کے بانی۔ اب یہ مرحلہ اس بنیادی طریقہ کار تک محدود ہو جاتا ہے: اگر ایک مخصوص مفروضہ درست ہے تو پھر میں اپنی تکمیل میں کامیاب ہو جاؤں گا، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ یہ مفروضہ سچا ثابت ہو، اس لئے جب تک مجھ میں غیر معمولی ذہنی اور علمی خود ضبطی نہیں ہوتی، میں اسے سچ سمجھتا ہوں۔ مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ راسخ العقیدگی اور ایک نیک و پاک باز زندگی، میری موت کے بعد مجھے جنت میں لے جائے گی

اور اس عقیدے کی اپنائیت ہی میں اطمینان اور خوشی ہے، اور اس لئے اگر یہ عقیدہ میرے سامنے زبردستی پیش کیا جاتا ہے تو شاید میں اس پر یقین کرلوں گا۔ اس مرحلے پر اس یقین کی وجہ، سائنس میں پوشیدہ نہیں ہے، یا پھر حقیقت کے ثبوت میں مضمر نہیں ہے، لیکن خوشگوار احساسات نے اس عقیدے میں سے جنم لیا، اور اس کے ساتھ ساتھ اس دعوے کی شدت اس ماحول میں پیدا ہو گئی تاکہ اس عقیدے کی اہمیت کم کی جاسکے۔

اشتہار بازی کی قوت بھی اسی زمرے میں شامل ہے۔ چونکہ فلاں گولیاں آپ کو بہتر صحت کی امید دلاتی ہیں، اس لئے ان پر یقین کر لینا ایک اچھا اور خوشگوار عمل ہے۔ اگر آپ ان گولیوں کی افادیت مسلسل محسوس کرتے ہیں اور ان کے اثرات درست سمجھتے ہیں تو پھر ممکن ہے کہ آپ ان پر یقین کرلیں۔ ایک منطقی اور استدلالی منظم تشہیری مہم کے مانند، غیر منطقی اور غیر استدلالی منظم تشہیری مہم سے لازمی طور پر موجود خواہشات متاثر ہونی چاہیں لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ اس منظم تشہیری مہم کو تسلسل کے ساتھ جاری رکھا جائے۔

منطقی اور غیر منطقی اثرات کے درمیان فرق عملی طور پر مندرجہ بالا تجزیے کی نسبت کم واضح ہے۔ عام طور پر ہمیشہ ایک منطقی اور معقول ثبوت ہوتا ہے، حالانکہ یہ کافی حد تک نتیجہ خیز نہیں ہوتا تو پھر غیر منطقی رویہ، اسے بہت زیادہ اہمیت دینے کے باعث ہی غیر منطقی رویہ کہلاتا ہے۔ اعتقاد، نظریہ اور خیال، جب یہ محض روایتی نوعیت کا نہیں ہوتا، یہ بے شمار عناصر کے باعث جنم لیتا ہے مثلاً خواہش، ثبوت اور ارادہ۔ جب بھی خواہش یا ثبوت موجود نہیں ہوتے، تو پھر اس وقت اعتقاد، نظریہ یا خیال پیدا نہیں ہوگا، اور جب کوئی بیرونی عوامل بھی نہیں ہوں گے، تو پھر اعتقادات، نظریات اور خیالات استثنائی صورتوں میں پیدا ہوں گے، مثلاً مذاہب کے بانی، سائنسی ایجادات اور جنونی کیفیات معاشرتی اہمیت کے حامل وسیع پیمانے پر موجود اعتقاد پیدا کرنے کے لئے، کسی نہ کسی حد تک یہ تین عناصر موجود ہونے چاہئیں۔ لیکن اگر ایک عنصر کی مقدار زیادہ ہو جاتی ہے اور دوسرے عنصر کی مقدار کم ہو جاتی ہے تو پھر پیدا ہونے والے اعتقاد کی مقدار غیر تبدیل شدہ ہو سکتی ہے۔ اس عقیدے کی مقبولیت کے لئے زیادہ منظم تشہیری مہم درکار ہے جس کے لئے مضبوط ثبوت کے حامل عقیدے کی نسبت زیادہ ثبوت چاہیے، بشرطیکہ دونوں عقائد، خواہش کی تکمیل کے لئے یکساں طور پر کافی ہوں۔

یہ صرف مسلسل اور متواتر منظم تشہیری مہم کا ہی نتیجہ ہوتا ہے کہ با اقتدار اور با اختیار افراد، اس عقیدے پر اثر انداز ہونے کی قدرت وصلاحیت حاصل کر لیتے ہیں۔ سرکاری تشہیری مہم، پرانی اور نئی اشکال، دونوں میں موجود ہے۔ مذہب کے پاس ایک ایسی ترکیب اور طریقہ کار ہے جو کئی پہلوؤں کے لحاظ سے قابلِ تعریف ہے، لیکن طباعت کے دور سے کہیں پہلے اسے ترقی حاصل ہوئی، اور اس لئے آج کے عہد میں اس کا استعمال بہت کم مفید ہے۔ ریاست نے صدیوں سے کئی ایک طریقے اختیار کر رکھے تھے، مثلاً سکّوں پر بادشاہوں کے چہرے کی تصویر، رسوم تاج پوشی اور صد سالہ تقریبات، بری اور بحری فوج کے شاندار کردار وغیرہ۔ لیکن یہ طریقے جدید ترین طریقوں سے کہیں کم مفید ہیں، مثلاً تعلیم، ذرائع ابلاغ واطلاعات، فلم بینی، ریڈیو وغیرہ وغیرہ۔ یہ طریقے مکمل طور پر آمر ریاستوں میں اپنائے جاتے ہیں لیکن ان کی کامیابی کا تعین ابھی قبل از وقت ہے۔

میں نے کہا تھا کہ منظم تشہیری مہم، لازمی طور پر خواہشات پر اثر انداز ہونا چاہئے، اور یہ ریاستی منظم تشہیری مہم کی ناکامی کے ذریعے اس اصول کی تصدیق وتوثیق ہو جاتی ہے، جب یہ منظم تشہیری مہم قومی احساسات کے منافی اور مخالف ہوتی ہے۔ جس طرح جنگ سے پہلے آسٹریا ہنگری کے بڑے حصوں میں یہ صورت حال واقع ہوئی۔ اس قسم کی صورت حال 1922 تک آئرلینڈ میں موجود رہی، اور ہندوستان میں آج بھی موجود ہے۔ منظم تشہیری مہم اس وقت کامیاب ہوتی ہے جب یہ کسی مریض میں موجود کسی بھی چیز سے ہم آہنگ اور منطبق ہوتی ہے، اس کی لافانی زندگی کی خواہش، صحت کی خواہش، اپنی قوم کی عظمت کی خواہش وغیرہ وغیرہ۔ جب اس ہم آہنگی اور مطابقت کے لئے بنیادی وجہ موجود نہ ہو، تو پھر اختیار واقتدار کے دعوے کو خبطی اور شدید شکوک کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ حکومتی نقطہ نظر کے مطابق جمہوریت کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے ایک عام شہری کو بآسانی دھوکا دیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ جمہوری حکومت کو اپنی حکومت سمجھتا ہے۔ جنگ کی مخالفت جو نہایت تیزی کے ساتھ کامیاب نہیں ہوتی ہے، کسی دیگر نظام حکومت کی نسبتاً جمہوریت کے تحت بہت کم پیدا ہوتی ہے۔ جمہوری نظام حکومت میں، اکثریت صرف اس وقت حکومت کے خلاف ہو سکتی ہے جب وہ پہلے یہ تسلیم کرتی ہے کہ انہوں نے اپنے راہنماؤں کے انتخاب میں غلطی کی، اور یہ اعتراف مشکل بھی ہوتا ہے اور ناخوشگوار بھی۔

جمہوری ممالک میں اس وقت منظم تشہیری مہم کا نظام وسیع پیمانے پر مذہب، کاروباری

اشتہار بازی، سیاسی جماعتوں، طبقہ امراء اور ریاست میں منقسم ہے۔ عام طور پر یہ تمام قوتیں مخالف سیاسی جماعتوں کو چھوڑ کر ایک ہی طرح کام کرتی ہیں، اگر انہیں اقتدار حاصل ہونے کی امید بھی ہوتی ہے، وہ ریاستی منظم تشہیری مہم کے بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی کرتی دکھائی نہیں دیتیں۔ جن ممالک میں مطلق العنان اور آمر حکومتیں قائم ہوتی ہیں، وہاں ریاست عملاً منظم تشہیری مہم کی مالک ہوتی ہے۔ لیکن جدید منظم تشہیری مہم کی طاقت وقوت کے باوجود جنگ میں شکست کی صورت میں سرکاری موقف مقبولیت عام حاصل کرے گا۔ اس صورت حال کے باعث حکومت کو کمزوری و ناتوانائی کا وہ احساس حاصل ہو جاتا ہے جو صرف قومی احساسات کے مقابلے میں ایک اجنبی اور غیر مقبول حکومت ہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ مزید برآں کامیابی کے امکانات کو جس قدر زیادہ جنگجوانہ جذبہ وجوش پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہوتا ہے، تو اس کا ردعمل اتنا ہی شدید ہوگا جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فتح ناقابلِ حصول ہے لہٰذا یہ توقع ہو سکتی ہے کہ گزشتہ سال کے مانند آئندہ جنگ ختم ہونے پر انقلابات کی فصل اُگے گی اور یہ فصل 1917 اور 1918 کے انقلابات سے زیادہ شدید ہوگی کیونکہ جنگ زیادہ سے زیادہ تباہ کن ہوگی۔ یہ بھی امید ہوتی ہے کہ حکمرانوں کو یہ احساس ہو جاتا ہے کہ انہوں نے عوام کے ہاتھوں قتل ہو جانے کا خطرہ موجود رہے گا جو کم از کم حد تک اس خطرے سے زیادہ ہوتا ہے کہ فوجی دشمن کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر جائیں گے۔

مسابقت کی غیر موجودگی میں خاص طور پر سرکاری منظم تشہیری مہم کی طاقت وقوت کے متعلق مبالغہ آرائی پر مبنی رویے کی اپنائیت بہت ہی آسان ہے۔ اس وقت یہ منظم تشہیری مہم بذات خود جھوٹ کا پلندہ ہوتی ہے جس کی جعلسازی اور مصنوعی پن وقت خود ثابت کر دیتا ہے۔ اس وقت اس کی حیثیت اس قدر بری ہوتی ہے کہ جیسے ارسطو کی حامیوں کی حالت گلیلیو کی مخالفت کے باعث تھی۔ ایک ملک میں جو مخالف جماعتیں موجود ہونے کی صورت میں، جو جماعت عوام میں جنگی فتوحات کا احساس پیدا کر دیتی ہے، اگر دونوں جماعتوں کو نہ سہی، لیکن ایک جماعت کو لازمی طور پر سرکاری بیانات کے استرداد کے غیر معمولی صورت حال کے تجربے میں سے گزرنا پڑتا ہے۔

جب ہر قسم کی مخالفانہ تشہیری مہم ممنوع قرار دی جاتی ہے، تو پھر حکمران یہ سوچتے ہیں کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق ہر قدم اٹھا سکتے ہیں، اور وہ ہر قسم کی معقولیت، سمجھداری اور احتیاط سے ماوراء ہو جاتے ہیں۔ جھوٹی منظم تشہیری مہم کو اپنی افادیت، قدر و قیمت اور توانائی قائم رکھنے کے لئے

مسابقت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

اقتدار کی دیگر تمام اقسام کی مانند، اقتدار اور رائے عامہ میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ باہمی اختلاط اور ارتکاز کار جحان و میلان موجود ہوتا ہے، جس کا منطقی نتیجہ ریاستی اجارہ داری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن جنگی صورت حال کے علاوہ بھی یہ سمجھنا ایک جارحانہ عمل ہوگا کہ منظم تشہیری مہم پر مبنی ریاستی اجارہ داری کے باعث حکومت کو لازمی طور پر کوئی ضرر لاحق نہیں ہو سکتا۔ اگر طویل المدت اثرات کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے پاس اقتدار ہوتا ہے، وہ عوام کے مفادات سے اس قدر شرمناک طور پر لاتعلق ہو جاتے ہیں جس طرح لوتھر (Luther) کے دور میں پاپاہائے اعظم تھے۔ پھر جلد یا بدیر کچھ نئے لوتھر ریاست کی حاکمیت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے، اور اپنے پیش روؤں کے مانند اس قدر تیزی کے ساتھ کامیابی حاصل کرلیں گے کہ ان پر قابو پانا ناممکن ہو جائے گا۔ یہ صورت حال محض اس لئے واقع ہوگی کیونکہ حکمران یہ سمجھیں گے کہ ایسا تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن اگر یہ تبدیلی بہتری ہی کی خاطر ہو اس کی پیش بینی ناممکن ہوتی ہے۔

دیگر تمام معاملات کی مانند، تنظیم اور اتحاد کا اثر، انقلاب میں تاخیر پر منتج ہوتا ہے، لیکن اس کی آمد پہلے سے زیادہ خطرناک اور متشدد ہوتی ہے۔ جب سرکاری طور پر صرف ایک ہی نظریے کی ترویج کی اجازت ہوتی ہے، تو پھر عوام اس کا متبادل تلاش کرنے کے لئے غور و فکر، یا اس غور و فکر کی اہمیت کو نظر میں رکھنے کی عادت میں مبتلا نہیں ہوتے، اس وقت صرف پُر جوش اور ولولہ انگیز انقلاب ہی روایتی نظام کا تختہ الٹ سکتا ہے اور پھر مخالفین میں کامیابی کے حصول کے لئے مناسب حوصلہ اور جارحیت پیدا کرنے کے لئے حکومتی نظریات کی سچائی سے صرف نظر انتہائی ضروری ہو جائے گا۔ صرف ایک چیز تبدیل نہیں ہوگی، اور وہ چیز فوری طور پر کسی بھی قسم کا روایتی نظام قائم کرنے کی اہمیت ہے کیونکہ اسے کامیابی اور فتح کے لئے ضروری سمجھا جائے گا۔ لہٰذا ایک منطقی نقطہ نگاہ کے مطابق ایک آمرانہ حکومت میں ضروری نہیں کہ انقلاب ان بنیادوں پر برپا ہو جن سے خوشی و مسرت حاصل ہو سکے۔ اس ضمن میں مزید یہ چاہیئے ہوتا کہ احساس تحفظ میں بتدریج اضافہ ہوتا کہ سکون میں وجذبے میں کمی واقع ہو اور کاہلی و سست روی کے دروازے کھل جائیں اور یہ خوبی ایک آمرانہ حکومت کے حکمران میں سب سے زیادہ موجود ہوتی ہے، جو کبھی کبھار ہی اس قسم کے کسی حکمران میں موجود نہیں ہوتی۔

دسواں باب

عقائد بطورِ ذریعہ حصولِ اقتدار

ملکی اقتدار کا انحصار نہ صرف اس کے عوام کی تعداد، اس کے معاشی وسائل اور اس کی تکنیکی صلاحیت واستعداد پر ہوتا ہے بلکہ ملکی اقتدار کا انحصار اس کے عقائد ونظریات پر بھی ہوتا ہے۔ ایک ملک کے عوام کا شدت پسندی اور جارحیت پر مبنی عقیدہ اور نظریہ عام طور پر اس کی طاقت وقوت میں اضافے کا باعث بنتا ہے، اور کبھی کبھار اس میں کمی کا بھی باعث بنتا ہے۔ انیسویں صدی کی نسبت آج کل شدت پسندی اور جارحیت پر مبنی عقائد زیادہ مروج ہیں، اقتدار وقوت پر ان کے اثرات کی نوعیت کہیں زیادہ عملی اہمیت کی حامل ہے۔ جمہوریت کے خلاف ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ شدت پسندوں اور جنونی افراد پر مشتمل ایک قوم کو جنگ میں عقلمند اور سمجھدار افراد کی اکثریت پر مشتمل قوم کے مقابلے میں کامیابی کے زیادہ امکانات میسر ہوتے ہیں۔ آیئے تاریخ عالم کے تناظر میں اس دلیل کا جائزہ لیتے ہیں۔

اس جائزے کی ابتدا کی خاطر ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ مثالیں اور صورت احوال جہاں شدت پسند اور جارحانہ طرز عمل کے باعث کامیابی نصیب ہوئی، قدرتی طور پر یہ مثالیں اور واقعات ان ممالک کی نسبت زیادہ مشہور ہیں جہاں اس عقیدے کے باعث ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ ناکامی کے یہ واقعات وحالات، نسبتاً تاریخ عالم میں زیادہ عیاں نہیں ہو سکے۔ لہٰذا اس ضمن میں ایک نہایت ہی سرسری جائزہ معقولیت کے خلاف ہے، لیکن اگر ہم جانتے ہیں کہ یہ غلطی کہاں واقع ہوئی، تو پھر اس غلطی سے اجتناب چنداں مشکل نہیں ہے۔

شدت اور جارحیت پسندی کے ذریعے قوت واقتدار کے حصول کی شاہکار مثال اسلام کی نشوونما ہے۔ محمدؐ نے عرب میں نہ تو کسی علم وفضل میں اضافہ کیا اور نہ ہی عرب کے مادی

وسائل و ذرائع میں بڑھاوا کیا، لیکن پھر بھی ان ؐ کی وفات کے چند ہی سالوں کے اندر، عربوں نے اپنے سب سے زیادہ طاقت ور ہمسایوں کو شکست دے کر ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر لی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پیغمبرؐ نے جو مذہب پیش کیا، ان ؐ کی قوم کی کامیابی میں ایک اہم عنصر تھا۔ اپنی وفات کے عین نزدیک انہوںؐ نے بازنطینی سلطنت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ مسلمانوں کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ وہ رقم یا گھوڑے یا مال و اسباب، فصلیں اور موسم گرما کی شدید اور نا قابل برداشت تپش سے نجات چاہتے تھے۔

پیغمبرؐ نے برہمی سے کہا ''دوزخ میں اس سے بھی زیادہ تپش ہے۔'' انہوںؐ نے عربوں سے کام لینے کے لئے ان کی تحقیر کی لیکن اپنی واپسی پر انہوںؐ نے پچاس دنوں کے اخراج کے دوران سب سے زیادہ گنہگاروں کی شدید ملامت کی۔ (یہ الفاظ ای گبن (E.Gibbon) کی کتاب میں سے لئے گئے ہیں اور ضروری نہیں کہ ان میں سچائی بھی ہو: مترجم)۔ محمدؐ کی زندگی اور انؐ کی وفات سے چند سال کے اندر اندر جارحیت اور شدت پسندی نے عرب قوم کو متحد کر دیا، میدان جنگ میں انہیں اعتماد سے سرفراز کیا اور کافروں کے خلاف جنگ میں شہید ہونے والوں کے ساتھ جنت کا وعدہ کر کے ان میں حوصلہ و ہمت پیدا کی۔

لیکن اگر چہ جارحیت اور شدّت پسندی کے باعث عربوں کی ابتدائی کوششوں میں ولولہ انگیزی پیدا ہوئی، اس کے علاوہ مزید دیگر وجوہات بھی موجود ہیں جن کے باعث انہوں نے طویل عرصے تک فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ بازنطینی اور فارسی سلطنتیں دونوں طویل اور بے نتیجہ جنگوں کے باعث کمزور ہو گئی تھیں۔ مزید برآں، رومی افواج ہمیشہ ہی کمزور رہیں اور گھڑسوار دستوں کے خلاف رہیں۔ عرب شہ سوار نا قابل یقین حد تک متحرک تھے، وہ برق کے مانند ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے تھے، اور انہوں نے خود کو ان مشکلات کا عادی بنا لیا تھا جنہیں ان کے عیش پسند ہمسائے اپنے لئے نا قابلِ برداشت سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کی ابتدائی کامیابی کے لئے یہ حالات نا گزیر تھے۔

اور پھر جلد ہی کسی بھی عظیم کام کے آغاز سے بھی کہیں پہلے، جارحیت پسندی اور جارحیت نوازی کو حکومت میں سے خارج کر دیا گیا۔ پیغمبرؐ کے داماد نے حقیقی جوش و خروش اور ولولہ زندہ رکھا لیکن خانہ جنگی میں انہیںؓ شکست ہوئی اور بالآخر انہیں قتل (شہید) کر دیا گیا۔ ان کے بعد

خلافت خاندان بنوامیہ نے سنبھال لی جو محمدؐ کے شدید ترین دشمن رہے تھے اور ان کے مذہب پر سیاست کی حد سے زیادہ اتفاق نہیں کیا تھا۔ پیغمبرؐ کے داماد کے قاتلوں نے ان کی وراثت پر ناجائز قبضہ کرلیا اور بت پرستی کے علمبردار اس کے مذہب اور سلطنت کے مالک بن بیٹھے۔ ابوسفیان کی مخالفت شدید اور بے لچک تھی، مسلمان ہونے میں اس نے بہت ہی سست روی دکھائی تھی اور وہ پس وپیش بھی کررہا تھا، اس نے جو نیا مذہب اختیار کیا تھا، اس کی ضرورت اور مفاد پرستی کا نتیجہ تھا۔ اس نے اپنے نئے مذہب کی بہت خدمت کی، اس کی خاطر دشمنوں سے جنگ کی اور شاید وہ اپنے نئے مذہب پر ایمان بھی لے آیا تھا، اور دور جاہلیت کے گناہ خاندان بنوامیہ کے حالیہ استحقاق کے باعث دھل گئے تھے۔ اس کے بعد سے آزادی رائے، تحمل برداشت اور بردباری ایک طویل عرصے تک خلافت کا طرہ امتیاز رہی جب کہ مسیحیت، شدت پسندی اور جارحیت میں گرفتار رہی۔ ابتدا میں مسلمانوں نے مسیحی مفتوحین کے ساتھ رواداری اور تحمل و برداشت کا سلوک کیا، جو کیتھولک مسیحیت کی شدید اذیت رسانی اور آزاد دہی کے بالکل متضاد تھا اور مسلمانوں کا یہی رویہ ان کی فتوحات میں آسانی اور ان کی سلطنت کے استحکام کی بڑی اور اہم وجہ تھی۔

شدت اور جارحیت پسندی کی واضح کامیابی کی ایک اور مثال کرومویل کے تحت آزادی پسندوں کی فتح تھی۔ لیکن یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ شدت اور جارحیت پسندی کا کرومویل کی فتوحات میں کس قدر ہاتھ تھا۔ بادشاہ کے ساتھ مقابلے میں پارلیمان کو محض اس لئے فتح حاصل ہوئی کیوں کہ اس نے لندن اور مشرقی ممالک، دونوں کو اپنی افرادی قوت کے ہاتھ میں رکھا اور اس کے معاشی وسائل و ذرائع بادشاہ کے پاس موجود معاشی وسائل و ذرائع سے کہیں زیادہ تھے۔ قدیم کلیسائی فرقے کے ارکان ہمیشہ ہی انقلاب میں اعتدال پسندوں کے ساتھ رہے تھے۔ انہیں آہستہ آہستہ محض اس لئے نکال باہر کردیا گیا کیونکہ وہ دلی طور پر فتح کے خواہشمند نہیں تھے۔ اقتدار حاصل کرنے کے بعد کرومویل بذات خود ایک عملی سیاستدان بن گیا جو بحرانوں کو حل کرنے کا شائق تھا، لیکن وہ اپنے حامیوں کی شدت اور جارحیت پسندی کو نظرانداز نہ کرسکا، اور اس وجہ سے اس قدر نامقبول ہوگیا کہ قیادت کرنے کے بھی اہل نہ رہا، بالآخر اس کی جماعت مکمل طور پر زوال پذیر ہوگئی۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ طویل المدت حالات کے تناظر میں جارحیت اور شدت پسندی کے باعث انگریز آزاد خیالوں کو اپنے پیش رووں سے زیادہ کامیابی نصیب ہوئی۔

اگر وسیع تناظر میں دیکھا جائے، انقلاب فرانس کی تاریخ کی مثال، انگلستان میں دولتِ مشترکہ جیسی ہے یعنی جارحیت اور شدت پسندی، فتح، ظلم وستم، زوال اور پھر ردِ عمل۔ ان دونوں بہترین مثالوں میں بھی جارحیت اور شدت پسندی کی کامیابی مختصر عرصہ پر محیط تھی۔

تاریخ عالم ان مثالوں سے بھری پڑی ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شدت اور جارحیت پسندی کے باعث سوائے تباہی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ شدت اور جارحیت پسندی کے باعث اگر کامیابی حاصل بھی ہوئی تو وہ عارضی اور وقتی نوعیت کی تھی۔ اسی کے باعث ٹائٹس (Titus) تباہ و برباد ہو گیا، اور 1453 میں قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) کو بھی تباہی کا سامنا کرنا پڑا جب مشرقی اور مغربی مسیحیت کے درمیان معمولی نظریاتی اختلاف کے باعث مغربی ممالک کو تحقیر اور نفرت کا سامنا کرنا پڑا اور انہیں دھتکار دیا گیا۔ اس کے باعث پہلے موروں (Moors) اور یہودیوں (Jesus) کے اخراج کے ذریعے پہلے سپین کو زوال نصیب ہوا اور پھر ہالینڈ میں بغاوت برپا ہوئی اور پھر مذہبی جنگوں کا ایک بے سود اور لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کے برعکس کامیاب اقوام وہ تھیں جو زمانہ قدیم سے زمانہ جدید تک، وراثتی اذیت و آزار کی کم از کم عادی رہیں۔

بہرحال عالمی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی بھی قوم کی مضبوطی اور استحکام کے لئے نظریے کی یکسانیت اور وحدت ازحد ضروری ہے۔ جرمنی اور روس میں نہایت سختی کے ساتھ اس اصول کو اختیار کیا گیا اور اسے عملی طور پر اپنایا بھی گیا لیکن اٹلی اور جاپان میں اس اندازِ فکر کو کہیں کم شدت کے ساتھ اختیار اور نافذ کیا گیا۔ فرانس اور انگلستان میں فسطائیت کے بہت سے مخالفین یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں کہ اظہار رائے کی آزادی فوجی کمزوری کا باعث ہے۔ آیئے اب ہم اس سوال کا ایک دفعہ پھر نہایت جامع اور تجزیاتی انداز میں جائزہ لیتے ہیں۔

جو سوال میں پوچھ رہا ہوں، وہ وسیع تناظر میں نہیں ہے: کیا اظہار رائے کی آزادی مکمل طور پر رائج ہونی چاہئے یا پھر کم از کم طور پر قابل برداشت ہونی چاہئے؟ میں ایک نہایت ہی مختصر النوعیت سوال پوچھ رہا ہوں: کس حد تک یہ نظریہ اور اعتقاد یکساں؟ اور واحد ہونا چاہئے، کیا یہ نظریہ اضطراری طور پر پیدا ہونا چاہئے یا ریاست کی طرف سے نافذ ہونا چاہئے یا پھر اقتدار و اختیار کا ذریعہ ہونا چاہئے؟ اور بصورت دیگر کس حد تک اظہار رائے کی آزادی، اقتدار و اختیار کا ذریعہ ہے؟

جب 1905 میں تبت پر فوجی مہم جوئی کے ذریعہ حملہ کیا تو ابتدا میں اہلِ تبت نے نہایت بہادری سے مقابلہ کیا کیونکہ لامہ نے انہیں گولیوں کے مقابلے میں طلسمی سحر عطا کیا تھا۔ بہر حال جب اہلِ تبت ہلاک ہونے لگے تو لامہ نے یہ موقف اختیار کیا کہ ان گولیوں کے سروں پر لوہا لگا ہوا تھا اور اس کا سحر صرف سیسے والی گولیوں کے لئے موثر تھا۔ اس کے بعد تبتّی افواج نے کہیں کم جوش و جذبے کا مظاہرہ کیا۔ جب بیلا کون (Belakun) اور کُرٹ آئزر (Kurt Eisner) نے کمیونسٹ انقلاب برپا کیا تو انہیں اعتماد تھا کہ منطقی نظام مادہ پرستی ان کی حمایت میں جنگ لڑ رہا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ کومنٹرن (Comintern) کے لاماؤں نے اپنی ناکامی کی کیا توجیہہ پیش کی تھی۔ ان دو مثالوں میں عقیدے اور نظریے کی یکسانیت اور وحدانیت فتح کا باعث نہ بن سکی۔

اس معاملے میں حقیقت کا ادراک حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دونوں متضاد سچائیوں کے درمیان یکسانیت اور اتفاق پیدا کیا جائے۔ ان میں سے پہلی سچائی یہ ہے۔ جن افراد کو اپنے نظریات اور اپنے عقائد پر بھروسا اور یقین ہوتا ہے ان افراد کی نسبت باہمی طور پر زیادہ تعاون کر سکتے ہیں جنہیں اپنے عقائد اور نظریات پر بھروسا اور یقین نہیں ہوتا۔ دوسری سچائی یہ ہے: جن افراد کے اعتقادات و نظریات حقیقت کے مطابق ہوتے ہیں، ان کی کامیابی کا امکان ان افراد سے زیادہ ہوتا ہے جن کے نظریات و اعتقادات حقائق پر مبنی نہیں ہوتے۔ آیئے اب ہم ان عام سچائیوں کا جائزہ لیتے ہیں:

باہمی تعاون میں مدد دینے کے لئے اس یکسانیت اور اتفاق کا کردار نہایت واضح ہے۔ سپین میں خانہ جنگی کے دوران انتشار پھیلانے والوں، کمیونسٹ اور باسک (Basquo) قوم پرستوں کے درمیان باہمی تعاون بہت ہی مشکل تھا حالانکہ یہ عام یکساں طور پر فرانکو کی شکست کے خواہاں تھے۔ اسی طرح اگرچہ کم از کم حد تک، بصورت دیگر کارل مارکس کے حامیوں اور جدید انداز کے فسطائیوں کے درمیان تعاون بہت ہی مشکل تھا۔ فوری طور پر مسائل حل کرنے کے لئے اتفاق و مصالحت کے علاوہ مخصوص قسم کی مزاجی مطابقت اور موافقت کی ضرورت ہے لیکن جہاں یہ سب عناصر موجود ہوتے ہیں وہاں بڑے بڑے اختلاف رائے بے ضرر ثابت ہو سکتے ہیں۔

پینن سولر وار (Penin salar War) کے مورخ ولیم نیپئر نے نپولین کی تعریف کی اور ولنگٹن کو ناپسند کیا۔ اس کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے وہ نپولین کی شکست کو قابلِ معافی سمجھتا

ہے۔لیکن ذات پات کے لئے اس کے جذبات اورفوجی ذمے داری کے لئے اس کے احساسات، اس قسم کے خالص علمی و ذہنی یقین پر غالب آ گئے اور وہ فرانسیسیوں سے اس طرح بہادری سے لڑا جیسے وہ ایک بہترین ٹوری (Tori) تھا۔ اسی طرح اگر اس طرح کا کوئی واقعہ پیش آتا، آج کے دور کے برطانوی ٹوری اسے جذبے اور شوق سے ہٹلر کے خلاف لڑتے جیسے وہ اس کو پسند نہیں کرتے تھے۔

وہ اتحاد اور اتفاق جو ایک قوم، ایک مذہب، با جماعت کو اقتدار و اختیار عطا کرنے کے لئے درکار ہے، جذبات اور عادت پر مبنی عملی اتحاد و اتفاق ہے۔ اس صورت حال میں علمی و ذہنی اعتقاد و ایمان کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ آج کے دور میں یہ صورت حال انگلستان میں موجود ہے لیکن 1745 کے بعد سے یہ صورت حال موجود نہ تھی۔ یہ صورت حال فرانس میں 1792 میں یا جنگ عظیم کے دوران روس میں اور پھر اس کے بعد ہونے والی خانہ جنگی میں موجود نہ تھی۔ اس دور میں یہ صورت حال سپین میں موجود نہیں ہے۔ ایک حکومت کے لئے اظہار رائے کی آزادی کو سلب کرنا اس وقت مشکل نہیں ہوتا جب یہ عملی وفاداری پر انحصار کر سکتی ہے۔ لیکن یہ ایسا نہیں کر سکتی، تو مقابلہ مزید گھمبیر ہو جاتا ہے۔ یہ تو ظاہر اور واضح ہے کہ منقسم تشہیری مہم کی آزادی خانہ جنگی کے دوران ناممکن ہے اور جب خانہ جنگی کا مستقبل قریب میں امکان نہیں ہوتا تو پھر منظم تشہیری مہم کو روکنے کے لئے استدلال بہت ہی کم طاقت ور رہ جاتا ہے۔ لہٰذا خطرناک حالات میں، اتفاق و اتحاد کا قیام مجبوری بن جاتا ہے۔

آیئے اب ہم دوسری سچائی کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہ سچائی یہ ہے کہ حقائق کے مطابق اعتقاد و نظریے کی اپنائیت مفید ہے۔ جہاں تک براہ راست فائدوں کا تعلق ہے، یہ صرف مخصوص قسم کے اعتقادات اور نظریات تک ہی محدود ہے: مثلاً زہریلی گیسوں اور تیز دھماکہ خیز مادوں کی خصوصیات کے مانند فنی معاملات، اور دوسرے مخالف قوتوں کی باہمی خوبیوں کے متعلق معاملات۔ ان معاملات کے متعلق بھی یہ کہا جا سکتا ہے، کہ صرف وہ جن کے باعث حکومتی حکمت عملیوں اور فوجی کارروائیوں کے متعلق فیصلہ ہوتا ہے، وہ درست نقطہ نظر کے حامل ہوتے ہیں۔ مطلوب یہ ہوتا ہے کہ عوام کو فتح کا یقین ہونا چاہئے اور فضائی حملوں کا امکان کم سے کم ہونا چاہئے۔ صرف حکومت، فوجی سربراہان اور ان کے فنی عملے کو حقائق کا علم ہونا چاہئے، اور پھر ان سب کے علاوہ سب سے

زیادہ اندھے اعتماد اور اطاعت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اگر انسانی معاملات، شطرنج کے مانند قابلِ یقین ہوتے تو پھر سیاست دان اور سپہ سالار شطرنج کے کھلاڑیوں کے مانند ہوشیار ہوتے، اس نظریے میں کچھ نہ کچھ سچائی اور حقیقت ہوسکتی ہے۔ایک کامیاب جنگ کے فوائد مشکوک ہوتے ہیں لیکن ایک ناکام جنگ کے نقصانات یقینی اور قطعی ہوتے ہیں۔اس لئے اگر ان معاملات میں قائدانہ کردار ادا کرنے والے افراد یہ اندازہ کر سکتے کہ کون فتح یاب ہوگا، تو پھر جنگوں کا وجود بھی نہ ہوتا۔لیکن درحقیقت جنگوں کا وجود ہوتا ہے، اور ہر جنگ میں دونوں فریق نہیں تو ایک فریق کی ضرور حکومت ہوتی ہے، جو جنگ کے متعلق کسی بھی قسم کی پیش گوئی نہیں کر سکتی۔اس کی بھی کئی وجوہات ہیں: مثلاً فخر اور گھمنڈ، جہالت اور پھر مسلسل جوش اور جذبہ۔جب عوام کو بے خبر رکھتے ہوئے اعتماد میں رکھا جاتا ہے، تو ان کے اعتماد اور ان کے جنگجوانہ جذبے سے حکمرانوں کو با آسانی مطلع کیا جاسکتا ہے، جو بمشکل ناخوشگوار حقائق کو اسی جذبے کے معیار کے مطابق تول سکتے ہیں، جن کی انہیں خبر تو ہوتی ہے، لیکن انہیں ان خوشگوار حقائق کے مانند چھپاتے ہیں جن کا ذکر ہر اخبار اور ہر گفتگو میں موجود ہوتا ہے۔شدید جذباتی ہیجان اور خود پرستی وعظمت کا وہم حکومت پر غالب آجاتا ہے حکومت مدافعت کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہے۔

جب جنگ چھڑ جاتی ہے تو پھر حقائق پوشیدہ رکھنے پر مبنی حکمت عملی کے باعث وہ اثرات ونتائج پیدا ہوسکتے ہیں جو خواہشات کے بالکل برعکس ہوتے ہیں۔کم از کم کچھ ناخوشگوار حقائق، جو اس سے پہلے چھپائے گئے ہوتے ہیں سب کو معلوم ہوجاتے ہیں، اور جس قدر زیادہ افراد کو احمقوں کی جنت میں رہنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے، اسی قدر زیادہ وہ حقائق سے خوف زدہ ہونے کے علاوہ حوصلہ ہار جائیں گے۔ان حالات میں انقلاب یا اچانک زوال قریب الواقع ہوتا ہے لیکن آزادی اظہار رائے کے باعث عوام الناس تکلیف دہ حالات کے لئے پہلے ہی ذہنی طور پر تیار ہوجاتے ہیں۔

جب محکوم افراد کی طرف سے اطاعت وفرمانبرداری پر مبنی رویہ اور طرز عمل اختیار کیا جاتا ہے، تو یہ عمل معقولیت اور دانشمندی کے لئے ضرر رساں اور اس کے مخالف ہوتا ہے۔ایک ایسے ملک میں جہاں عوام کو خواہ بزدلی سے ہی، ایک نہایت ہی ناقابل فہم اور نامعقول نظریے کو مقبول کرنا پڑتا ہے، تو پھر ان میں سے ذہین ترین اور قابل ترین افراد بھی یا تو بے وقوف بن جاتے ہیں، اور یا پھر

غیر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معقولیت اور دانائی کی سطح میں کمی واقع ہو جائے گی جو لازمی طور پر فنی مہارت میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ یہ اصول خاص طور پر اس وقت سچ اور درست ثابت ہوتا ہے جب سرکاری عقیدہ اور نظریہ وہ طے پاتا ہے جسے چند ذہین اور عقلمند افراد، ایمانداری سے قبول کر سکتے ہیں۔ نازیوں نے اپنے بعض قابل ترین افراد کو جلاوطن کر دیا تھا، جس کے باعث جلد یا بدیر، ان کی فوجی صلاحیتوں پر بہت ہی بُرے اثرات مرتب ہوئے۔ کوئی بھی صلاحیت یا فنی مہارت، سائنس کے بغیر زیادہ دیر تک ترقی نہیں کر سکتی، اور آزادی اظہار رائے کے بغیر سائنس بھی نشوونما نہیں پا سکتی۔ نتیجے کے طور پر ایک یکساں اور واحد نظریے پر اصرار حتیٰ کہ ان معاملات میں بھی جن کا جنگ کے ساتھ دور کا واسطہ نہیں ہوتا، بالآخر ایک سائنسی دور میں فوجی استعداد اور صلاحیت کے لئے مہلک ثابت ہوتا ہے۔

اب ہم اپنی ان دو سچائیوں اور حقیقتوں کے عملی تجزیے کا عمل شروع کر سکتے ہیں۔ سماجی وابستگی اور پیوستگی کے لئے ایک عقیدہ اور نظریہ یا پھر ایک متعین رویہ، یا پھر ایک مروج جذبہ درکار ہوتا ہے۔ اور یا پھر سب سے بڑھ کر، ان تینوں عناصر کے مرکب کی ضرورت پیش آتی ہے، اس قسم کے لئے کسی ایک عنصر کی غیر موجودگی میں ملک منتشر ہو جاتا ہے اور ایک ظالم یا غیر ملکی حکمران کا محکوم بن جاتا ہے لیکن اگر اس سے یہ مراد ہو کہ پیوستگی اور وابستگی موثر ہونی چاہئے، تو پھر اسے زیادہ گہرے طور پر محسوس کرنا چاہئے، اور اسے معمولی اقلیت پر طاقت کے ذریعے مسلط کر دینا چاہئے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ مخصوص ذہانت یا کردار کے ذریعے خاص طور پر اہم نہ ہوں لیکن یہ عمل عظیم اکثریت کے حوالے سے حقیقی اور غیر ارادی ہونا چاہئے۔

راہنما، قومی افتخار اور مذہبی جوش وجذبے کے ساتھ وفاداری تاریخی طور پر پیوستگی اور وابستگی کے حصول کے بہترین ذریعے کے طور پر ثابت ہو چکی ہے۔ موروثی خودمختاری کے زوال کے باعث، اور آزادی اظہار رائے کے سبب مذہبی جوش و جذبے کو خطرہ درپیش ہونے کے پیش نظر، ایک راہنما کے لئے وفاداری پر مبنی رویے کی اثر آفرینی میں تسلسل جاری نہیں رہا۔ پھر قومی افتخار باقی رہ جاتا ہے جو ماضی کے ادوار کی نسبت زیادہ اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ ایک سرکاری نظریے اور عقیدے کے باوجود جو بذات خود روس کے لئے ضرر رساں ہونا چاہئے، اگرچہ زیادہ نہیں لیکن پھر بھی مسیحیت کی نسبت زیادہ ضرر رساں ہے، پھر بھی سوویت یونین میں اس نظریے کے احیاء کا

مشاہدہ دلچسپی پر مبنی ہے۔

قومی افتخار قائم اور برقرار رکھنے کے لئے آزادی میں مداخلت کس حد تک ضروری ہے؟ جو رکاوٹیں، واقعی درپیش ہوتی ہیں ان کی نظر میں زیادہ تر یہی نقطہ نظر موجود ہوتا ہے۔ روس میں یہ کہا جاتا ہے جو افراد سرکاری روایتی نظریے اور عقیدے کے ساتھ اختلاف کرتے ہیں، ان کے ساتھ غیر محابانہ رویہ اختیار کیا جانا چاہئے۔ جرمنی اور اٹلی میں حکومت کی طاقت وقوت کا انحصار، قوم پرستی کے جذبے کے ساتھ وفاداری پر ہے، اور اس جذبے کی کسی بھی قسم کی مخالفت کو باسکو کے مفاد میں سمجھا جاتا ہے۔ اگر فرانس میں آزادی ختم ہو جاتی ہے تو شاید یہ جرمنی کے حمایت یافتہ افراد کی طرف سے غداری کو روکنے کا عمل سمجھا جائے گا۔ ان تمام ممالک میں مشکل یہ ہے کہ قومی اختلاف پر طبقاتی اختلاف غالب آ جاتا ہے جس کے باعث کسی حد تک قومی مفاد کے بجائے جمہوری ممالک میں سرمایہ داری نظام اور فسطائی ممالک میں سوشلزم اور کمیونسٹ نظام غالب آ جاتا ہے۔ اگر قومی مفادات کی مخالفت روکی جا سکتی ہے تو پھر ملک کی مضبوطی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک مقصد کے طور پر ذہانت کی مجموعی سطح کو کم کرنے کے لئے یہ ضروری تو نہیں ہے۔ حکومتوں کے لئے یہ مسئلہ بہت ہی مشکل ہے کیونکہ قوم پرستی ایک نہایت ہی نامعقول اور احمقانہ جذبہ ہے، اور ذہین و ہوشیار افراد یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے باعث یورپ میں تباہی واقع ہو رہی ہے۔ سب سے بہترین حل یہ ہے کہ اسے کسی بین الاقوامی نظریے مثلاً جمہوریت یا کمیونزم یا اجتماعی تحفظ وسلامتی کے پردے کے پیچھے چھپا دیا جائے۔ جہاں یہ عمل واقع نہ ہو سکتا ہو، جس طرح اٹلی اور جرمنی میں ہوا، تو پھر بظاہر یہ یکسانیت اور اتفاق، ظلم وستم پر مبنی رویے کا تقاضا کرتی ہے اور آسانی کے ساتھ حقیقی اندرونی جذبہ پیدا نہیں کرتی۔

مختصر یہ کہ ایک عقیدہ نظریہ یا کسی قسم کا جذبہ، معاشرتی وابستگی اور پیوستگی کے لئے لازمی ہے لیکن اسے طاقت وقوت کا ایک ذریعہ بننے کے لئے، جن افراد پر فنی استعداد کا انحصار ہوتا ہے، ان افراد سمیت عوام کی ایک بہت بڑی اکثریت کی طرف سے حقیقی اور گہرے طور پر محسوس کیا جانا چاہئے۔ جہاں اس قسم کی صورت حال موجود نہیں ہوتی، حکومت پابندیوں اور ستم رسانی کے ذریعے اس قسم کی صورت حال پیدا کر سکتی ہے، لیکن اگر یہ پابندیاں اور ستم رانیاں بہت ہی شدید ہوں تو پھر عوام حقیقی دنیا سے بہت دور چلے جاتے ہیں، اور یا پھر ان حقائق سے بے خبر اور لاعلم ہو جاتے

ہیں جن کا علم ان کے لئے اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ چونکہ اقتدار پر متمکن افراد اپنی ہوسِ اقتدار کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں، اس لئے آزادی کے ساتھ مداخلت کی مقدار جو زیادہ تر قومی استحکام کا باعث ہوتی ہے، ہمیشہ اس مقدار سے کم ہوتی جو حکومت کے خیال میں مناسب ہوتی ہے، لہٰذا مداخلت کے خلاف ایک منتشر اور پریشان خیال جذبہ، بشرطیکہ یہ افراتفری پیدا کرنے کا سبب نہ ہو، قومی استحکام میں اضافے کا موجب ہوسکتا ہے لیکن مخصوص حالات کے سوا ان عمومی اصولوں سے اجتناب ناممکن ہے۔

مندرجہ بالا ان تمام تر بحث و مباحث کے ذریعے ہم نے شدت پسندی اور جارحانہ انداز پر مبنی رویے اور اعتقاد کے انتہائی فوری اثرات کے متعلق غور کیا ہے۔ اس کے طویل المدتی اثرات قطعی مختلف ہیں۔ ایک عقیدہ جو اقتدار و اختیار کا ذریعہ ہوتا ہے، کچھ وقت کے لئے عظیم کوششوں کے لئے مفید ثابت ہوتا ہے، لیکن اگر یہ کوششیں خاص طور پر جب یہ زیادہ کامیاب نہ ہوں اور ناکامی و مایوسی کا باعث ہوں، اور یہ مایوسی اور ناکامی، شکوک و شبہات پیدا کرے۔ ابتدا میں ایک قطعی اعتقاد ثابت نہیں ہوتا جو ایک ذہنی مستعد اور توانا لائحہ عمل ہوتا ہے، لیکن صرف مستحکم اور پائیدار اعتقاد کی عدم موجودگی ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ مزید برآں ایک منظم تشہیری مہم کے لئے جس قدر زیادہ طریقے جوش و جذبہ پیدا کرنے کے لئے استعمال کئے جائیں گے، اس وقت تک ردِ عمل میں اتنا ہی زیادہ ہوگا جس کے بعد ایک خاموش اور پُرسکون زندگی کا حصول ہی قابلِ اہمیت معلوم ہوتا ہے۔ جب ایک خاموش اور پُرسکون عرصے کے بعد عوام دوبارہ جوش و جذبے سے لبریز ہو جاتی ہے، اسے ایک نئی تحریک اور ولولے کی ضرورت ہوگی کیونکہ پہلی عام تحریکات، امنگیں اور ولولے بیزار کن اور بے کیف ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اپنے اثرات کے لحاظ سے مروج اعتقادات و نظریات بہت ہی زیادہ شدید اور عارضی ثابت ہوتے ہیں۔ تیرہویں صدی میں عالم انسانیت پر تین قسم کے عظیم افراد کے اثرات مرتب ہوئے، پاپائے اعظم، شہنشاہ اور سلطان۔ شہنشاہ اور سلطان کا وجود عدم وجود میں تبدیل ہو چکا ہے جب کہ پاپائے اعظم کی قوت ماضی کی قوت کا ایک شائبہ معلوم ہوتی ہے۔ سولہویں اور پھر سترہویں صدیوں کے اوائل میں یورپ، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کی جنگوں کے زیر اثر رہا، اور ان میں سے کسی ایک یا دونوں عقائد کے حق میں ایک زبردست منظم تشہیری مہم چلائی گئی۔ لیکن آخری فتح کسی کو بھی حاصل ہوسکی لیکن یہ فتح انہیں حاصل ہوئی جو اپنے

درمیان موجودان معاملات کو غیر اہم سمجھتے تھے۔ بگ اینڈیز (Big Endiaus) اور لٹل اینڈیز (Little Endiaus) کے درمیان اپنی جنگوں میں سوئفٹ (Swift) ان کا مضحکہ اڑاتا ہے، جین سینسٹ (Jansenist) کے ساتھ خود کو قید خانے میں پا کر وولٹائر کا پرٹن، حکومت کو وہ اتنا ہی بے وقوف اور اہم سمجھتا ہے کہ وہ اس کی طرف سے معافی کی خواہشمند ہے، اور وہ اس سے انکار بھی چاہتی ہے۔ اگر مستقبل قریب میں یہ دنیا کمیونسٹوں اور فسطائیوں میں منقسم ہو جاتی ہے، فتح ان لوگوں کے علاوہ کسی کو بھی حاصل نہیں ہوتی جو کندھے اچکا کر یہ کہتے ہیں، ہمیں دنیا سے کیا مطلب، ہم تو صرف آرام، سکون اور طاقت چاہتے ہیں۔ ایک عقیدے کی طاقت و قوت کی سختی اور آخری حد بیزاریت، مایوسی اور آرام و آسائش سے محبت کے ذریعے مقرر و متعین ہوتی ہے۔

گیارھواں باب

تنظیموں کی تشکیل اور کارکردگی

اس سے پہلے ہم ان جذبات ونظریات کے بارے غور کرتے رہے ہیں جو اقتدار واختیار کا سب سے اہم نفسیاتی ذریعہ ہیں: مثلاً روایت جو خاص طور پر پادریوں اور بادشاہوں کے لئے عزت واحترام کی صورت میں موجود ہے۔ خوف، ڈر اور ذاتی خواہش اور تمنا جو جبر واستبداد کی قوت وطاقت کے ذرائع ہیں، یعنی ایک قدیم اور پرانے عقیدے اور نظریے کے بجائے ایک نیا عقیدہ اور نظریہ جس کے ذریعے انقلابی اقتدار واختیار وجود میں آتا ہے، اور پھر عقائد اور اقتدار کے ذرائع کے درمیان باہمی تعلق اور ربط۔ اب ہم اپنے موضوع کے نئے پہلو کی طرف آتے ہیں۔ مختلف تنظیموں کا جائزہ جن کے ذریعے اقتدار واختیار کو عملی طور پر اختیار ونافذ کیا جاتا ہے، سب سے پہلے انہیں ان کی اپنی زندگی کا مادہ بقا سمجھا جاتا ہے، پھر انہیں حکومت کی اقسام کے لحاظ سے زیر غور لایا جاتا ہے، اور پھر آخر میں ان کو تشکیل دینے والے افراد کی زندگیوں پر اثرات کے حوالے سے انہیں جانچا جاتا ہے۔ ہمارے اس موضوع کے اس حصے میں جہاں تک ممکن ہو، ان کی عضویاتی تشکیل پر ان کے مقاصد مدنظر رکھے بغیر بالکل اسی طرح غور کیا جائے گا جس طرح ایک انسان کی عضویاتی ساخت اور تشکیل پر غور کیا جاتا ہے۔

اس باب میں زیر بحث موضوع یعنی تنظیموں کی تشکیل اور کارکردگی کا انحصار اس حقیقت پر ہے کہ ایک تنظیم یا ادارہ، ایک مادۂ بقا بھی ہے جس کی اپنی بھی زندگی ہے، اور جسے عروج وزوال حاصل ہو سکتا ہے۔ تنظیموں اور اداروں کے درمیان تقابل اسی طرح ہے جس طرح جانوروں اور پودوں کے درمیان تقابل کیا جاتا ہے اور اسے کم وبیش ڈارون (Darwin) کے نظریے کے لحاظ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن دوسروں کے مانند اس تشہیر کو وسیع تناظر میں نہیں دیکھا جانا چاہئے، یہ

کسی فرضی نظریے کو تو بیان کر سکتا ہے، لیکن اس کا عملی نفاذ ممکن نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ہمیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ سماجی تنظیموں اور اداروں کے لحاظ سے زوال ایک ناگزیر امر ہے۔

اقتدار و اختیار کا انحصار مکمل طور پر تو نہیں مگر کافی حد تک تنظیم پر ہے۔ افلاطون یا گلیلیو کے مانند خالص نفسیاتی قوت و طاقت، متعلقہ سماجی حالت کے بغیر بھی موجود ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر اصولی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ طاقت و قوت اس وقت تک اہم ثابت نہیں ہوتی جب تک اسے مذہب، سیاسی جماعت یا کسی ایسی ہی سماجی نامیاتی عنصر کی طرف سے مہمیز نہ ملے۔ فی الحال میں اس قوت و طاقت کو زیر بحث نہیں لا رہا جو کسی تنظیم سے منسلک نہیں ہے۔

ایک تنظیم ان افراد کا ایک گروہ ہوتا ہے جو مشترکہ مفادات کے تحت مختلف سرگرمیاں بجا لانے کے لئے اکٹھے ہوتے ہیں۔ یہ تنظیم خالص رضاکارانہ یعنی کلب کے مانند بھی ہو سکتی ہے، ایک خاندان یا قبیلے کے مانند یہ ایک قدرتی حیاتیاتی گروہ بھی ہو سکتا ہے، ایک ریاست کے مانند، یہ زبردستی کا اکٹھ بھی ہو سکتا ہے، یا پھر ایک ریلوے تجارتی ادارے کے مانند ایک مرکب اور پیچیدہ آمیزہ بھی ہو سکتا ہے۔ تنظیم کا مقصد واضح اور مبہم بھی ہو سکتا ہے۔ شعوری اور لاشعوری بھی ہو سکتا ہے، یہ مقصد فوجی یا سیاسی بھی ہو سکتا ہے، معاشی یا مذہبی، تعلیمی یا کسرتی بھی ہو سکتا ہے۔ اپنی کرداری اور مقصدی خصوصیات کے قطع نظر ہر تنظیم کا انحصار قوت و طاقت کی تقسیم در تقسیم پر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک حکومت، اپنی مجموعی نوعیت کے لحاظ سے فیصلے کرتی ہے، اور کسی نہ کسی طرح اپنے اصل مقصد کے باوجود ایک انفرادی افراد سے زیادہ قوت و طاقت کی حامل ہوتی ہے۔

جب عوام زیادہ مہذب اور فنی مہارت زیادہ پیچیدہ ہو جاتی ہے، تو پھر اشتراک کے فوائد زیادہ سے زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ اشتراک ہمیشہ آزادی و خودمختاری اور من مرضی کی خواہشات کو کسی نہ کسی طرح پس پشت ڈال کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے، ہم دوسرے افراد پر زیادہ سے زیادہ غلبہ حاصل کر سکتے ہیں، لیکن یہ لوگ بھی ہم پر غالب آ سکتے ہیں۔ اور اس سے بھی بڑھ کر انفرادی افراد کے ذریعے نہیں، بلکہ افراد کے گروہوں کے ذریعے فیصلے کئے جاتے ہیں۔ اور جب تک ان افراد کی تعداد بہت کم نہ ہو، ان گروہوں کے فیصلے بھی حکومت کے ذریعے نافذ کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا صنعتی دور سے قبل معاشروں کی نسبت ایک جدید معاشرے میں حکومت لامحالہ ایک بہت ہی اہم کردار ادا کرتی ہے۔

حتیٰ کہ ایک مکمل جمہوری حکومت میں ــــ اگر یہ تمام حالات ممکن تھے ــــ تو پھر بھی اس میں اختیار کی تقسیم در تقسیم موجود ہوتی ہے۔ اگر ایک مشترکہ فیصلے میں ہر ایک فرد برابر رائے کا حقدار ہوتا ہے، اور اگر (فرض کریں) دس لاکھ افراد ہیں، تو پھر ایک واحد جانور کے مانند دوسروں پر نہیں بلکہ اپنی ذات پر قابو رکھنے کے مانند، ہر شخص کو مکمل دس لاکھ افراد پر غالب آنے کی نسبت اپنے دس لاکھویں حصے پر غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ اس کے باعث، افراد کے بے ترتیب اکٹھ کے تناظر میں ایک بہت ہی مختلف انداز فکر پیدا ہوتا ہے۔ اور جہاں کسی حد تک یہی صورت حال ہمیشہ ہی موجود ہوتی ہے، حکومت مکمل طور پر جمہوری نہیں ہوتی تو پھر نفسیاتی اثر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ حکومتی ارکان جمہوری طور پر منتخب نہ بھی ہوئے ہوں، تو پھر بھی ان کی قوت و طاقت دوسرے لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اور اسی طرح ان افسران کی قوت و طاقت دوسروں سے زیادہ ہوتی ہے جنہیں جمہوری حکومت مقرر کرتی ہے۔ جس قدر زیادہ بڑا ادارہ یا تنظیم ہوگی، اسی قدر اس کے افسران کی طاقت وقوت زیادہ ہوگی۔ اس لئے جب تنظیموں کے حجم میں کسی بھی قسم کا اضافہ ہوتا ہے تو پھر عام ارکان کی بیک وقت کم ہوتی ہوئی طاقت وقوت اور حکومت کی طرف سے اٹھائے جانے والے اقدامات کی حدود میں اضافے کے باعث طاقت کی ناہمواریوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک عام شخص اس لئے اطاعت گزاری اختیار کرتا ہے کیونکہ انفرادی حیثیت کی نسبت باہمی طور پر زیادہ کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر اس پر دولت کی ہوس میں مبتلا فرد بہت خوش ہوتے ہیں کیونکہ اسے قوت واقتدار حاصل کرنے کا موقع حاصل ہوتا ہے بشرطیکہ جب تک بلاشبہ، حکومت موروثی نہ ہو، یا پھر حکومت کی ہوس میں مبتلا فرد ایک ایسے گروہ (کچھ ممالک میں یہودی) سے تعلق نہ رکھتا ہو جسے اہم حیثیتوں اور مناصب پر فائز ہونے کی اجازت نہ ہو۔

اقتدار و اختیار کے لئے مسابقت اور مقابلہ دو اقسام کا ہوتا ہے۔ ایک تو مختلف تنظیموں کے درمیان حریفانہ تعلقات پائے جاتے ہیں اور پھر ایک تنظیم کے اندر مختلف افراد کے درمیان قیادت کے لئے مسابقت پائی جاتی ہے۔ مختلف تنظیموں کے درمیان حریفانہ تعلقات اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ان کے مقاصد کم وبیش ایک ہی جیسے مگر غیر منطبق ہوتے ہیں۔ یہ مسابقت معاشی، یا فوجی یا منظم تشہیری مہم کے ذریعے اور یا پھر کسی بھی دو یا ان تمام تینوں ذرائع کے باعث پیدا ہوتی ہے۔ جب نپولین سوئم اپنے آپ کو شہنشاہ بنانے کے لئے کوشش کر رہا تھا، تو اسے ایک ایسی تنظیم بنانے

کی ضرورت پیش آئی جو اس کے مفادات کی نگران ہوتی، اور وہ پھر اس کی برتری کا تحفظ کرتی اور اسے کسی بھی قسم کا نقصان نہ پہنچنے دیتی۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے کچھ افراد میں سگار تقسیم کئے — یہ معاشی مفادات تھے، دوسروں کو اس نے کہا کہ وہ اپنے چچا کا بھتیجا تھا — یہ منظم تشہیری مہم تھی، — اور پھر آخر میں اس نے اپنے کچھ مخالفین کو ہلاک کروادیا — یہ فوجی طاقت کا اظہار تھا۔ اس دوران، اس کے مخالفین حکومت کی ''عوامی جمہوریہ'' طرز کی تعریف تک ہی محدود رہے، اور انہوں نے سگار اور گولیوں کو نظر انداز کر دیا۔ ایک جمہوری حکومت پر آمرانہ اقتدار مسلط کرنے کی یہ ترکیب یونانی ادوار سے ہی مشہور اور مستعمل ہے اور یہ ترکیب و طریقہ ہمیشہ ہی رشوت ستانی، منظم تشہیری مہم اور تشدد پر مشتمل ہوتا ہے۔ بہر حال یہ طریقہ اس عہد جدید کا مرکزی خیال نہیں ہے جو تنظیموں کی حیاتیاتی ساخت

مزید برآں، دو پہلو بہت ہی اہم ہیں جن کے لحاظ سے تنظیموں کی مختلف اقسام تشکیل پاتی ہیں۔ ایک تو حجم اور دوسرا جسے اس کی قوت کی شدت اور ٹھوس پن کہتے ہیں، اس سے میری مراد یہ ہے کہ یہ تنظیم کس حد تک اپنے ارکان پر قابو اور اثر رکھتی ہے۔ اقتدار کی ہوس کے باعث جوان لوگوں میں ممکنہ طور پر پائی جاتی ہے جو حکومتی مناصب پر قبضہ کر لیتے ہیں، تو پھر ہر تنظیم، کسی بھی قسم کی مخالفانہ حریف قوت کی عدم موجودگی میں، اس کے حجم اور شدت طاقت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کسی بھی قسم کے اضافے کو جبلی وجوہات کے باعث روکنا ممکن ہے۔ مثال کے طور پر شطرنج کی ایک بین الاقوامی کلب میں، مناسب اور معقول ذہانت اور استعداد کے حامل شطرنج کے تمام کھلاڑی شامل ہو سکتے ہیں، اور ان ارکان میں سے کسی بھی رکن کی سرگرمی پر پابندی لگانے کی خواہش، صرف شطرنج سے متعلق لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک مستعد اور ہوشیار سیکرٹری کے ذریعے، زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ''شطرنج کا شوقین'' بنانے کی کوشش کی جائے، لیکن اگر سیکرٹری بھی شطرنج کا ایک اچھا کھلاڑی ہوا تو پھر یہ بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ایسا ہو جاتا ہے تو پھر شطرنج کے بہترین کھلاڑیوں میں غداری کے باعث کلب تباہ و برباد ہو جائے گا۔ لیکن اس قسم کی صورت حال استثنائی نوعیت کی حامل ہے جہاں تنظیم کا مقصد ایک ہوتا ہے اور اس مقصد کے باعث رائے عامہ بھی اس کی حمایتی ہو جاتی ہے، دولت یا سیاسی غلبہ — حجم میں اضافہ یا تو دیگر تنظیموں کے دباؤ کے باعث ممکن ہوتا ہے، اور یا پھر جب متعلقہ تنظیم بین الاقوامی حیثیت اختیار کر جاتی ہے — اور پھر

شدتِ طاقت میں اضافہ اس وقت روکا جا سکتا ہے جب ذاتی خودمختاری کی خواہش بہت زیادہ شدت اختیار کر جاتی ہے۔

اس امر کی سب سے واضح مثال ایک ریاست کی ہے۔ ہر ریاست جو خود کو بہت زیادہ طاقتور سمجھتی ہے، اس کی نظر غیر ملکی فتوحات پر ہوتی ہے۔ اس سے متضاد صورت حال اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب ایک ریاست کو اپنے تجربے کے ذریعے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اتنی طاقتور نہیں ہے جتنی نظر آتی ہے، یا پھر اپنی ناتجربہ کاری کے باعث خود کو اپنی اصل طاقت سے کہیں کم تر سمجھتی ہے۔ ایک عمومی اصول یہ ہے کہ ایک ریاست اپنی بساط بھر فتوحات کرتی رہتی ہے، اور اس کی فتوحات کی آخری حدود ہوتی ہے جب اس سے زیادہ ریاست اور ریاستیں اپنی طاقت کے ذریعے اس کی فتوحات روک لیتی ہیں۔ برطانیہ، افغانستان پر قبضہ نہیں کر سکا ہے کیونکہ اس کے مقابلے میں روس زیادہ طاقتور ہے، نپولین نے لوزائنا امریکہ کے ہاتھ فروخت کر دیا کیونکہ وہ اس کا دفاع کرنے سے قاصر تھا، وغیرہ وغیرہ۔ جہاں تک جبلی طاقتوں کا تعلق ہے، ہر ریاست تمام دنیا کو فتح کر لینا چاہتی ہے۔ لیکن ایک ریاست کی قوت و طاقت، جغرافیائی طور پر زیادہ یا کم ہو سکتی ہے، اس کی قوت و طاقت دیگر ریاستوں کے مقابلہ میں متوازن ہو جاتی ہے اور جب تک اس کی روایتی قوت مزاحم نہیں ہوتی، اس کی سرحدات بڑھتی جاتی ہیں۔

اس وقت تک جو بھی کہا جا چکا ہے، وہ اس قدر مختصر ہے کہ کسی ترمیم کے بغیر اس کو پچ نہیں سمجھا جا سکتا۔ چھوٹی ریاستیں اپنا وجود نہ صرف اپنی قوت و طاقت بلکہ بڑی ریاستوں کے حسد کے باعث اپنا وجود برقرار رکھتی ہیں۔ مثلاً بلجیم کا وجود محض اس لئے قائم ہے کیونکہ اس کا وجود برطانیہ اور فرانس کے لئے مفید ہے۔ پرتگال کے پاس ایک وسیع مفتوحہ علاقہ اور نوآبادیاں صرف اس لئے موجود ہیں کیونکہ بڑی طاقتیں اس امر پر اتفاق نہیں کر سکتیں کہ اس علاقے کو کیسے تقسیم کیا جائے۔ چونکہ جنگ ایک سنجیدہ اور گھمبیر مسئلہ ہے تو ایک ریاست اس علاقے کو کافی مدت تک اپنے زیر تسلط رکھ سکتی ہے اور اگر کوئی طاقتور ریاست اسے اپنے قبضے میں کرنے کا فیصلہ کر لیتی تو یہ ریاست اپنے اس علاقے سے محروم ہو جاتی۔ لیکن اس قسم کی صورت حال کے باعث ہمارا عمومی اصول زائل نہیں ہوتا، ان حالات کے باعث وہ مزاحمتی قوتیں پیدا ہوتی ہیں جو ایک متشدد ریاست کی کارروائیوں میں تاخیر کا باعث ہوتی ہیں۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس اصول کے حوالے سے امریکا کو یہ استثناء حاصل ہے کہ ایک ریاست اپنی مرضی کے مطابق جب چاہے دوسری ریاست کو فتح کر سکتی ہے۔ یہ امر تو صاف ظاہر ہے کہ میکسیکو اور بلاشک وشبہ تمام لاطینی امریکا کی فتح امریکا کی فتح کے راستے میں کوئی خاص مشکل پیدا نہ کرتی۔ بہرحال موجودہ زمانے میں مخالفانہ قوتوں کی اس صورت حال میں ریاستی فتح کے عمومی مقاصد تکمیل نہیں پاتے۔ خانہ جنگی سے قبل جنوبی ریاستیں استعماری رجحانات کی حامل تھیں جس کے باعث میکسیکو میں جنگ شروع ہوئی، اور اس جنگ کے نتیجے میں ایک وسیع علاقہ زیر تسلط آ گیا۔ خانہ جنگی کے بعد مغربی افراد کی آبادکاری اور معاشی ترقی کے باعث ایک نہایت ہی مستعد اور باصلاحیت قوم کی صلاحیتوں اور توانائیوں کا انجذاب ایک نہایت ہی محنت طلب کام کا تقاضا تھا۔ جیسے ہی یہ صورت حال کسی نتیجے پر پہنچی، تو پھر سپین اور امریکا کے درمیان 1898 کی جنگ کے باعث استعماریت کی دوبارہ نمو کی راہ دوبارہ ہموار ہوئی۔ لیکن امریکی آئین کے تحت کسی غیر ملکی علاقے پر تسلط نہایت ہی مشکل ہے، اس کے لئے نئے رائے دہندوں کی آمد درکار ہوتی ہے، جسے درست اور مفید نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اور پھر سب سے زیادہ اہم امر کیا ہے۔ اس صورت حال کے باعث اندرونی آزاد تجارتی علاقے میں اضافہ ہو جاتا ہے جس کے باعث اہم معاشی مفادات تباہ ہو جاتے ہیں۔ مانرو (Monroe) کا سیاسی نظریہ جس کے مطابق لاطینی امریکا پر تسلط حفاظتی نقطہ نگاہ سے بالکل صحیح ہے، لہٰذا یہ نظریہ اس وقت زیادہ اطمینان بخش ثابت ہوتا ہے جب کسی علاقے کو فتح کرنے کے بجائے اس علاقے پر نظریاتی یا مفاداتی غلبہ حاصل کیا جائے۔ اگر سیاسی فتح معاشی لحاظ سے فائدہ مند ثابت ہوتی تو پھر یہ فتح بلاشک وشبہ جلد ہی وقوع پذیر ہوتی۔

سیاسی میدان میں قوت و طاقت کا ارتکاز ہمیشہ ہی حکمرانوں کا مطمع نظر رہا ہے، اور عوام نے بھی کبھی اس کی مزاحمت نہیں کی ہے۔ رسمی طور پر یہ اصول اور نظریہ ماضی کی عظیم سلطنتوں میں، آج کی جدید آمرانہ حکومتوں کی نسبت مکمل صورت میں موجود رہا ہے۔ لیکن عملی لحاظ سے یہ نظریہ اور اصول صرف وہاں ہی پنپ سکا، جہاں اس کا وجود تکنیکی طور پر ممکن تھا۔ قدیم شاہی سلطنتوں کے لئے سب سے اہم مسئلہ ذرائع مواصلات کا تھا۔ اور مصر اور بابل میں بڑے بڑے دریاؤں نے ذرائع مواصلات فراہم کر دیئے تھے لیکن حکومتِ فارس کا انحصار سڑکوں پر تھا۔ ہیروڈوٹس (Herodotus) ایک عظیم شاہی سڑک کا ذکر کرتا ہے جو سارڈس (Sardis) سے سُوسا (Susa)

تک واقع تھی جس کی طوالت پندرہ سو میل تھی اور اس پر شاہی قاصد اور پیغامبر زمانہ امن میں سفر کرتے تھے اور زمانہ جنگ میں شاہی فوجیں اسے استعمال کرتی تھیں۔ ہیروڈوٹس کہتا ہے کہ اس سڑک کی ایک سچی اور حقیقی روداد یوں ہے "اس تمام سڑک کے ساتھ ساتھ شاہی پڑاؤ اور کاروان سرائیں قائم تھیں، اور اس تمام راستے پر کسی خطرے کا کوئی امکان نہ تھا ___ فریجیا (Phrygia) سے رخصتی کے بعد حالیز (Halys) کو یہ سڑک عبور کرنا تھی، اور اس سڑک سے گزرنے سے قبل بڑے بڑے پھاٹکوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس چوکی پر پہریداروں کی کافی تعداد موجود ہے۔ سیلسیا (Cilicia) اور آرمینیا کے درمیان دریائے یوفریٹس (Euphrates) واقع ہے جسے کشتیوں کے ذریعے عبور کرنا ضروری ہے۔ آرمینیا میں آرام گھروں کی تعداد پندرہ ہے اور فاصلہ ساڑھے چھپن پیراسانگ (تقریباً 180 میل) ہے۔ ایک جگہ پر ایک پہریدار تعینات ہے۔ اس ضلع میں سے چار بڑی بڑی ندیاں ایک دوسرے کے بیچ میں سے گزرتی ہیں جنہیں کشتیوں کے ذریعے عبور کیا جاتا ہے ___ شاہی پڑاؤوں کی کل تعداد ایک سو گیارہ ہے، دراصل یہ پڑاؤ "آرام گھر" ہیں جو سارڈیس اور سُوسا کے درمیان واقع ہیں۔ اس سڑک پر ایک سو پچاس فرلانگ فی دن کے حساب سے (ایک فوج کی رفتار کے لحاظ سے) ایک شخص ٹھیک نوے دن میں سفر مکمل کرے گا۔"

اگرچہ اس قسم کی سڑک کے ذریعے ایک سلطنت کی وسعت پذیری ممکن ہے لیکن بادشاہ کے لئے یہ ممکن نہیں ہو سکا کہ وہ دور افتادہ صوبوں کے حکمرانوں پر مکمل طور پر قابو پا سکے۔ گھوڑے کے ذریعے ایک پیغامبر ممکن ہے کہ سارڈس سے سُوسا تک ایک مہینے میں خبریں لاتا ہے لیکن سارڈی سے سُوسا کی طرف سے پیش قدمی کرنے کے لئے ایک ماہ کی مدت درکار ہوگی۔ جب اہلِ آیون نے ایران کے خلاف بغاوت کی تو ایشیا مائنور (Asia Minor) میں پہلے سے غیر موجود فوج کے ساتھ شامل ہونے کے لئے ان کے پاس کئی مہینے موجود تھے۔ تمام قدیم سلطنتوں کو بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، اور یہ بغاوتیں اکثر صوبائی گورنروں کی سرکردگی میں ہوتی تھیں، اور حتیٰ کہ جب کھلم کھلا بغاوت نہیں بھی ہوتی تو اس وقت بھی مقامی حکومت کی خودمختاری کو تقریباً روکا نہیں جا سکتا تھا سوائے اس کے کہ قریب ہی سے اس پر کوئی فتح حاصل کر لے، اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسے موافق اور موزوں حالات پیدا ہو جاتے تھے کہ یہ حکومت ایک آزاد ریاست میں تبدیل ہو جائے۔ قدیم زمانے میں کوئی بھی عظیم اور بڑی ریاست کا مرکز کی طرف سے اس

طرح انتظام وانصرام نہیں کیا جاتا تھا جس طرح موجودہ زمانے کا معمول ہے، اور اس کی سب سے بڑی وجہ تیز رفتار ذرائع مواصلات کی عدم موجودگی تھی۔

رومی سلطنت نے اہل مقدونیہ کے ذریعے ایران سے سیکھا کہ مرکزی حکومت کو سڑکوں کے ذریعے کیسے مستحکم کیا جاسکتا ہے۔ شاہی ہرکارے دس میل فی گھنٹہ کی اوسط رفتار سے دن اور رات میں مغربی اور جنوبی یورپ، شمالی افریقا، اور مغربی ایشیا کے عام علاقوں سے سفر کرسکتے تھے۔ لیکن ہر صوبے میں شاہی چوکی کا انتظام ایک فوجی سپہ سالار کے ہاتھ میں تھا جس کی فوجیں اپنے راستے میں موجود کسی کو خبر ہونے کے بغیر پیش قدمی کرسکتی تھیں۔ رومی افواج کی مستعدی اور خبروں کی ترسیل سست روی، رومی شہنشاہ کے خلاف باغیوں کے لئے فائدہ مند ثابت ہوتی تھی۔ گال (Gaul) کے شمال سے اٹلی پر حملہ کرنے کے لئے کانسٹینٹین (Constantine) کی پیش قدمی کے بتاتے ہوئے گیوبن (Gibbon) اپنی نقل و حرکت میں آسانی اور ہینی بال (Hannibal) کی مشکلات کے درمیان تقابل کرتا ہے:

> ''جب ہینی بال نے گال سے اٹلی میں پیش قدمی کی تو اسے پہاڑوں پر سے اور وحشی اقوام سے ایک راستہ دریافت کرکے، اور پھر اس راستے کو زیر استعمال پا کر بہت آسانی محسوس ہوئی حالانکہ یہ راستہ کبھی بھی ایک باقاعدہ فوج کے لئے ایک راستے کے طور پر استعمال نہیں ہوا تھا۔ پھر الپس (Alps) کی قدرت نے حفاظت کی اور ان کی حالت قدرت کی فنکاری نے مستحکم کردی۔ لیکن اس عارضی مدت کے دوران ان جرنیلوں کو کسی خاص مشکل یا مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا جنھوں نے اس راستے کو آزمایا تھا۔ کانسٹینٹین کے زمانے میں پہاڑی کسان بہت ہی مہذب اور اطاعت گزار رعایا تھے، ملک میں اشیائے ضرورت وافر مقدار میں موجود تھیں، عظیم اور پرشکوہ شاہراہیں موجود تھیں، رومیوں نے یہ شاہراہیں الپس (Alps) کے اوپر سے بنائی ہوئی تھیں، اور انہوں نے گال اور اٹلی کے درمیان کئی راستے قائم کر رکھے تھے۔ کانسٹینٹین (Constantine) نے کوٹین الپس (Cottian Alps) کی سڑک کو ترجیح دی، یا جسے اب

ماؤنٹ سنیس (Mount Cenis) کہتے ہیں، اور وہ اپنی فوجوں کو اس قدر تیز رفتاری کے ساتھ لے کر گیا کہ دریائے رین (Rhine) کے کنارے سے اس کی رخصتی کی خبر میکسینٹنٹس (Maxtantious) کے دربار (روم میں) پہنچنے سے قبل ہی وہ پیڈمونٹ (Piedmount) کے میدان میں جا پہنچا۔"

نتیجے کے طور پر میکسینٹنٹس (Maxtantious) کو شکست ہوگئی اور مسیحیت، ریاست کے مذہب کی حیثیت سے مروج ہوگئی۔ ممکن ہے کہ دنیا کی تاریخ مختلف ہوتی اگر رومیوں کے پاس خراب ترین سڑکیں ہوتیں یا خبروں کی ترسیل کے تیز رفتار ذرائع ہوتے۔

دخانی جہازوں، ریل گاڑیوں اور پھر ہوائی جہازوں کے باعث حکومتوں کے لئے دور افتادہ صوبوں پر قوت و طاقت کے تیز رفتار استعمال کو ممکن بنا دیا۔ سہارا یا میسوپوٹامیا میں ہونے والی بغاوت کو اب چند گھنٹوں کے اندر ہی کچلا جا سکتا ہے، جب کہ سو سال قبل فوج بھیجنے کے لئے کئی ماہ درکار ہوتے اور پھر اس فوج کو پیاس کے باعث ہلاک ہونے سے روکنے کے لئے بہت مشکل پیش آتی جیسا کہ بلوچستان میں سکندر کے فوجیوں کے ساتھ حالات پیش آئے۔

جس طرح افرادی قوت اور مال و اسباب کی تیز رفتار آمدورفت اہم ہے، اسی طرح خبروں کی ترسیل میں بھی تیز رفتاری نہایت اہم ہے۔ 1812 کی جنگ میں اگرچہ دونوں مخالف افواج میں سے کوئی بھی اس حقیقت سے باخبر نہیں تھا لیکن پھر بھی نیو آریلز کی جنگ "امن کے انتخاب" کے بعد ہی لڑی گئی۔ سات سالہ جنگ کے بعد برطانوی فوجوں نے کیوبا اور فلپائن پر قبضہ کر لیا لیکن اس کا معاہدہ طے ہو جانے کے کہیں بعد یورپ کو اس کی خبر ہوئی۔ برقی تار ایجاد ہونے تک زمانہ امن میں سفیر، اور زمانہ جنگ میں جرنیل لامحالہ طور پر بے تحاشا اختیارات کے مالک تھے کیونکہ فوری طور پر واقع ہونے والے واقعات و حالات کے متعلق وہ کچھ بھی ہدایات اور احکامات جاری نہیں کر سکتے تھے۔ ایک دور افتادہ حکومت کے اہلکاروں کو اکثر اپنے طور پر فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا جاتا تھا، اور اس طرح وہ مرکزی ہدایت یافتہ حکمت عملی سے بھی اہم حیثیت اختیار کر گئے۔

یہی نہیں کہ پیغامات کی ترسیل میں قطعی تیز رفتاری ہی بہت اہم ہے بلکہ ابھی تک یہ حقیقت

بھی مزید اہم ہے کہ پیغامات، انسانوں سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ مطلوبہ مقام تک پہنچ جائیں۔ ابھی تو ایک سو سال سے بھی کم عرصہ گزرا ہے کہ ایک گھوڑے سے زیادہ تیز نہ تو پیغامات اور نہ ہی اور کوئی چیز پہنچ سکتی تھی۔ ایک لٹیرا اور راہزن اپنے قریبی شہر میں اس کے جرم کی خبر پہنچنے سے قبل ہی فرار ہو سکتا تھا۔ آج کے دور میں چونکہ خبریں پہلے ہی پہنچ جاتی ہیں، اس لئے فرار مزید مشکل ہو گیا ہے۔ زمانہ جنگ میں ہر قسم کے تیز رفتار ذرائع مواصلات حکومتوں کے قبضے میں ہوتے ہیں، اور اس کے باعث ان کی طاقت میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔

نہ صرف پیغامات کی ترسیل میں تیز رفتاری بلکہ ریل گاڑیوں، برقی تار، گاڑیوں اور حکومتی منظم تشہیری مہم پر مشتمل جدید طریقوں کے باعث بڑی بڑی سلطنتوں، اب ماضی کی نسبت خود کو مستحکم رکھنے کے قابل ہو گئی ہیں۔ ایرانی صوبے داروں اور رومی گورنروں کو بغاوت کرنے میں بہت آزادی میسر تھی۔ سکندر کی موت واقع ہوتے ہی اس کی سلطنت بھی زوال پذیر ہو گئی۔ اتیلہ (Attila) اور چنگیز خان (Genghis Khan) کی سلطنتیں عارضی تھیں، نیز ایک ”نئی دنیا“ میں یورپ کی بہت سی اقوام نے اپنا مال و اسباب کھو دیا۔ لیکن دور جدید میں اکثر سلطنتیں بیرونی حملے کے علاوہ قطعی طور پر محفوظ ہیں، اور صرف جنگ میں شکست کے بعد ہی انقلاب کا امکان ہوتا ہے۔

یہ امر پیش نظر رہنا چاہئے کہ تکنیکی وجوہات کے باعث، دور افتادہ مقام پر واقع ریاست، مجموعی طور پر اپنی قوت و طاقت کو نہایت آسانی کے ساتھ کام میں نہیں لا سکتی، بعض اوقات ان وجوہات کے اُلٹ اثرات بھی ظاہر ہوئے۔ ہنی بال (Hannibal) کی فوج اپنے ذرائع مواصلات کو کام میں لائے بغیر کئی سال تک برقرار رہی جبکہ ایک عظیم جدید فوج اس قسم کے حالات میں دو یا تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ بحری فوج کا جب تک کشتیوں پر انحصار رہا، یہ فوج دنیا بھر میں کہیں بھی کارروائی کر سکتی تھی، لیکن جب انہیں آج اکثر ہی دوبارہ ایندھن لینے کی لازمی ضرورت محسوس ہوتی ہے، تو پھر یہ فوجی اپنے کسی اڈے سے کہیں دور کارروائی نہیں کر سکتی۔ نیلسن (Nelson) کے دور میں اگر برطانوی ایک علاقے کے سمندر پر قبضہ کر لیتے، ان کی حکمرانی ہر طرف قائم ہو جاتی، اور اب حالانکہ ان کا اپنے وطن میں موجود سمندروں پر قبضہ ہے، مشرق بعید میں ان کا قبضہ بہت ہی کمزور ہے اور انہیں بالٹک (Baltic) تک رسائی بھی حاصل نہیں ہے۔

بہر حال، اب ایک عمومی اصول یہ ہے کہ ماضی کے زمانے کی نسبت اس دور جدید میں مرکز کی طرف سے دور افتادہ مقام پر واقع کسی بھی صوبے یا مقام پر طاقت وقوت نہایت آسانی سے آزمائی جاسکتی ہے۔ نتیجتاً ریاستوں کے درمیان مسابقت کی شدت میں اضافہ ہوگیا ہے، فتح بھی نہایت مکمل طور پر حاصل کی جاسکتی ہے جس کے باعث ریاست کے حجم میں اضافہ، اس کی کارکردگی اور استعداد میں مزاحم نہیں ہوتا۔ اب تکنیکی طور پر ایک عالمگیر سلطنت کا قیام ممکن ہے اور یہ عالمی سلطنت ایک حقیقی سنجیدہ جنگ کے فاتح کے ہاتھوں عمل میں آسکتی ہے اور یا پھر غیر جانبدار اقوام میں سے سب سے طاقتور قوم اس عالمی سلطنت کو وجود میں لاسکتی ہے۔

جہاں تک طاقت وقوت کی شدت اور گہرائی کا تعلق ہے، یا پھر تنظیم یا ادارے کی شدت یا اثر پذیری کا تعلق ہے، اس سلسلے میں پیدا ہونے والا سوال بہت ہی پیچیدہ اور اہم نوعیت کا ہے۔ آج کے اس دور جدید میں ہر مہذب اور تہذیب یافتہ ملک کی حکومت زمانہء قدیم کی نسبت اب کہیں زیادہ مستعد اور فعال ہے۔ روس، جرمنی اور اٹلی میں حکومتیں تقریباً تمام انسانی معاملات میں مداخلت کرتی ہیں۔ چونکہ انسان ہوس اقتدار میں مبتلا ہوتا ہے اور عمومی طور پر جو انسان اقتدار و اختیار حاصل کرلیتا ہے، اس میں اقتدار کی ہوس مزید بڑھ جاتی ہے، تو پھر اقتدار پر قابض شخص میں عام حالات کے لحاظ سے اپنی اندرونی سرگرمیوں مثلاً اپنے علاقے میں اضافے کی خواہش میں اضافے کا امکان ہوتا ہے۔ چونکہ ریاست کی متعلقہ سرگرمیوں میں اضافے کی ٹھوس وجوہات موجود ہیں تو پھر ایک عام شہری میں اس سلسلے میں حکومت کی مرضی اور منشاء کے مطابق اطاعت گزاری اور فرمانبرداری کا میلان اور رجحان پایا جائے گا۔ بہر حال ایک فرد میں آزادی کے لئے ایک ایسی قطعی خواہش موجود ہوتی ہے جو کسی نہ کسی مرحلے پر خواہ عارضی طور پر ہی سہی، اس قدر شدید ہو جائے گی کہ اندازے کی مضبوطی میں مزید اضافے میں مزاحمت کا باعث ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ جب تنظیم ایک مخصوص طاقت حاصل کرلیتی ہے تو افراد میں آزادی کا جذبہ اور تنظیم کے ارباب اختیار میں طاقت واقتدار کا جذبہ کم از کم طور پر متوازن ہوتا ہے تاکہ اگر تنظیم میں آزادی کے جذبے میں اضافہ ہو جائے تو یہ ایک بہت ہی مضبوط قوت بن جاتی، اور اگر اس میں اقتدار واختیار کا سرکاری جذبہ کم ہو جائے تو پھر یہ زیادہ مضبوط ہوتی۔

اکثر اوقات، آزادی کا جذبہ ایک ایسا مختصر واقعہ نہیں ہوتا جس میں بیرونی مداخلت کا کوئی

امکان نہ ہو لیکن حکومت کی طرف سے بعض پابندیاں جو اس کی نظر میں ضروری ہوتی ہیں مثلاً فوج میں جبری بھرتی، مذہبی لگاوٹ کے باعث ایک عام شہری حکومت کی مخالفت کا مرتکب ہوتا ہے۔ بعض اوقات عوام کے یہ جذبات منظم تشہیری مہم اور تعلیم کے عام ہونے کے باعث بتدریج معدوم ہو سکتے ہیں جس کے باعث ذاتی آزادی کی خواہش وتمنا لامحالہ طور پر کمزور پڑ سکتی ہے۔ بہت سے عناصر اور قوتیں مثلاً اسکول، اخبارات، سینما، ریڈیو، فوجی تربیت، جدید معاشروں میں یکسانیت اور مطابقت کا باعث بنتی ہیں۔ آبادی کی اکثریت کے بھی یہی اثرات ہوتے ہیں۔ آزادی اور اقتدار کے جذبے کے درمیان ایک عارضی توازن پیدا ہو جاتا ہے، لہٰذا جدید حالات میں طاقت و اقتدار کی طرف زیادہ سے زیادہ جھکاؤ مطلق العنان اور آمرانہ ریاستوں کے قیام اور کامیابی کے لئے مدو معاون ثابت ہوتا ہے۔ آزادی کے جذبے کو تعلیم کے پھیلاؤ کے ذریعے آج کے اس دور میں نامعلوم حد تک کمزور کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہنا ممکن ہے کہ کوئی بغاوت پیدا کئے بغیر ریاست کی اندرونی طاقت میں بتدریج کس قدر اضافہ ممکن ہے، لیکن اس امر میں کسی شک کی وجہ نظر نہیں آتی کہ وقت کے ساتھ ساتھ اکثر آمرانہ ریاستوں میں بھی اس میں اضافہ موجود سطح سے کہیں زیادہ ہوسکتا ہے۔

ریاستوں اور ممالک کے علاوہ، خاص طور پر تنظیمیں بھی انہیں قوانین کے تحت آتی ہیں جو ہمارے زیر غور رہے ہیں، علاوہ ان کے جو قوت کا استعمال نہیں کر سکتے۔ میں اس وقت ان تنظیموں کو غور کے لئے منتخب نہیں کر رہا جن میں سے بہت کم اقتدار کی خواہش اور ہوس پیدا ہوتی ہے، مثلاً کلبیں وغیرہ۔ اس موضوع کے حوالے سے ہمارے مقصد کے لئے بہت ہی اہم اداروں میں سیاسی جماعتیں، مذہبی ادارے/تنظیمیں اور کاروباری و تجارتی ادارے شامل ہیں۔ اکثر مذہبی ادارے خود کو دنیا بھر میں پھیلانے کے خواہش مند ہوتے ہیں، لیکن بہر حال ان کا یہ مقصد بہت ہی کم ان کے توقع کے مطابق تکمیل پاتا ہے، نیز ان میں سے اکثر ادارے صرف اپنے ارکان کی چند خواہشات ہی کی تکمیل کے لئے باقاعدگی سے کام کرتے ہیں، مثلاً شادی اور تعلیم اطفال۔ جب مذہبی اداروں کی طرف سے یہ سرگرمیاں باقاعدہ حیثیت سے سند پا گئیں تو انہوں نے ریاستی سرگرمیوں کو بھی خود ہی انجام دینا شروع کر دیا۔ جس طرح تبت میں اور سینٹ پیٹر کی جانشینی کے وقت حالات پیش آئے، اور کسی حد تک تمام مغربی یورپ میں ''اصلاحی دور'' تک جاری رہا۔ چند

استثنائی امور کے سوا، مذہبی اداروں کی ہوسِ اقتدار، مواقع کی عدم موجودگی کے باعث محدود رہی ہے، اور اس کی دوسری وجہ لادینیت اور تفرقہ بازی کی صورت میں بغاوت پر مشتمل ہے۔ بہر حال بہت سے ممالک میں قوم پرستی کے باعث ان کی طاقت کو بہت زیادہ دھچکا لگا ہے اور بہت سی ایسی سرگرمیوں کی انجام دہی حکومت کی جانب منتقل ہوگئی ہے جو اس سے قبل مذہبی اداروں کے ذریعے انجام پاتی تھیں۔ مذہب کی قوت وطاقت میں کمی ایک تو قوم پرستی اور دوسرے قومی ریاستوں کے استحکام میں اضافے کے باعث واقع ہوئی۔

سیاسی جماعتیں ابھی تک تنظیمی لحاظ سے بہت کمزور ہیں، جنہوں نے اپنے ارکان کی سرگرمیوں پر قابو پانے کے لئے بہت ہی نحیف کوششیں کیں۔ انیسویں صدی کے تمام عرصے میں پارلیمان کے ممبران اکثر ہی اپنے جماعتی راہنماؤں کے خلاف رائے دیتے رہے جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ آج کے دور کی نسبت تقسیم کے نتائج کا اس وقت اندازہ لگانا کہیں مشکل تھا۔ وال پول (Walpole)، نارتھ (North) اور نوجوان پٹ (Pitt) نے کسی حد تک بدعنوانی اور رشوت کے ذریعے اپنے حمایتیوں کو اپنے قابو میں رکھا، لیکن اس بدعنوانی کے خاتمے کے بعد اور چونکہ سیاست ابھی تک آمرانہ نہج پر قائم تھی، حکومتوں اور جماعتی راہنماؤں کے پاس موثر دباؤ برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ خاص طور پر اب بھی لیبر پارٹی (Labour Party) (ایک برطانوی سیاسی جماعت) میں ارکان روایت پرستی پر مجبور ہیں، اور اس عہد کو ترک کرنے پر انہیں سیاست سے اخراج اور مالی نقصان دونوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دو قسم کی وفاداری درکار رہے: اظہار رائے کی منصوبہ بندی کے لئے اور روزمرہ اٹھائے جانے والے اقدامات کے لحاظ سے راہنماؤں کے لئے منصوبہ بندی اور حکمتِ عملی کا فیصلہ اس طریقے کے ذریعے ہوتا ہے جو برائے نام جمہوری ہوتا ہے بلکہ یہ فیصلے ان پس منظر کی ڈوریاں ہلانے والے افراد کے دباؤ کے تحت ہوتے ہیں جو تعداد میں بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔ اب یہ فیصلے انہیں اپنی پارلیمانی یا حکومتی سرگرمیوں کے ذریعے کرنا ہوتے ہیں کہ آیا وہ یہ منصوبے انجام دینے کی کوشش کریں گے، اگر وہ یہ فیصلہ نہیں کرتے تو پھر یہ ان کی حامیوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی رائے کے ذریعے ان کی طرف سے اعتماد و اعتقاد کی خلاف ورزی کی حمایت کریں، اور وہ اپنی تقریروں کے ذریعے اس امر کا اظہار کریں کہ ایسے تو ہوتا ہی تھا۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس کے تحت راہنماؤں کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ عوام الناس پر

مشتمل اپنے حامیوں پر پابندی لگا دیں اور ان سے مشورہ کئے بغیر اصلاحات متعارف کروائیں۔

لیکن اگرچہ تمام قسم کی سیاسی جماعتوں میں گہرائی بہت حد تک زیادہ بڑھ چکی ہے لیکن پھر بھی یہ جمہوری جماعتوں میں کمیونسٹوں، فسطائیوں اور نازیوں کی نسبت ناقابلِ یقین حد تک کم ہے۔ نازیوں کا ارتقاء بطور سیاسی جماعت نہیں بلکہ تاریخی اور نفسیاتی طور پر ایک خفیہ تنظیم کی حیثیت سے ہوا ہے۔ ایک مطلق العنان حکومت کے تحت جو افراد ایک انقلابی تبدیلی لانا چاہتے ہیں، انہیں پوشیدہ رکھا جاتا ہے اور پیچھے دھکیل دیا جاتا ہے لیکن جب وہ متحد اور اکٹھے ہو جاتے ہیں تو پھر غداری کے خدشے کے پیشِ نظر انہیں سخت نظم و ضبط کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جاسوس اور خفیہ اہلکاروں کے خلاف حفاظت کی خاطر ایک مخصوص قسم کے طرز زندگی کا مطالبہ ایک فطری عمل ہے۔ خطرات و خدشات، راز داری، موجودہ مشکلات اور مستقبل میں فتح کی امید کے نتیجے میں ایک نیم مذہبی وجد اور کیف وجود میں آتا ہے اور ان افراد کے لئے باعث کشش ہوتا ہے جو اس قسم کی صورت حال کو بآسانی قبول کر لیتے ہیں۔ ایک انقلابی خفیہ تنظیم میں بھی، اگرچہ اس کا مقصد انتشار پھیلانا ہی ہو، یہاں بھی شدید قسم کی مطلق العنانیت اور ایک صورت حال جیسے سیاسی سرگرمی کا نام دیا جا سکتا ہے، کے ماورا ایک نگرانی اور حفاظتی اہتمام کا امکان ہوتا ہے۔ نپولین کے زوال کے بعد اٹلی میں خفیہ تنظیموں کی بھرمار ہو گئی، ان میں سے کچھ نے انقلابی نظریات اپنا لئے اور کچھ مجرمانہ سرگرمیوں میں مصروف ہو گئیں۔ دہشت گردی کے عروج کے ساتھ ہی روس میں بھی یہی کچھ ہوا۔ روسی کمیونسٹ اور اطالوی فسطائی، دونوں ذہنی طور پر بہت زیادہ حد تک خفیہ تنظیموں کے وجود کے قائل تھے، اور نازیوں نے بھی ان کا ہی انداز اپنایا۔ جب ان کے راہنماؤں کو اقتدار نصیب ہوا تو انہوں نے ملک پر اسی طرح حکمرانی کی جس طرح وہ ماضی میں اپنی جماعتوں پر حکمرانی کرتے تھے اور دنیا بھر میں اس طرح کے تمام راہنما اپنی رعایا سے اطاعت اور فرمانبرداری کے اسی قسم کے باہمی مشترک جذبے کے طلب گار ہیں۔

معاشی تنظیموں کے حجم میں اضافے کے باعث، اقتدار کے متحرکات کے موضوع پر، کارل مارکس کا نقطہ نظر سامنے آیا۔ اس موضوع پر اس کی کہی ہوئی اکثر باتیں سچ ثابت ہو چکی ہیں لیکن ان کا اطلاق نہ صرف ان تنظیموں پر ہوتا ہے جو معاشی سرگرمیاں انجام دیتی ہیں بلکہ ان عام تنظیموں پر بھی ہوتا ہے جو ہوسِ اقتدار کا اظہار کرتی ہیں۔ پیداواری شعبے میں رجحان یہ ہے کہ ان

تسکین و اطمینان بخش سکیں۔ مثال کے طور پر گھرانے کے لئے ہی محبت و چاہت کے جذبے کو لیجئے۔ اس جذبے میں گھریلو امور، تعلیم اور زندگی کے تحفظ اور ضمانت سے متعلقہ تنظیموں کے باعث اضافہ ہوا ہے یا یہ تنظیمیں اس جذبے میں اضافے کا باعث بنی ہیں، اور مختلف گھرانوں کے یہ معاملات یکساں نوعیت کے حامل ہیں۔ لیکن یہ جذبہ زمانہ حال کی نسبت زمانہ ماضی میں زیادہ موجود تھا جس کے باعث ان تنظیموں کو عروج حاصل ہوا جو ایک گھرانے کے مفادات کو داؤ پر لگا کر اپنے مفادات کے حصول کی نمائندہ تھیں مثلاً مونٹا گیو (Montague) اور کیپولٹ (Capulet) کے پیروکار۔ شاہی خاندان یا موروثیت پر مشتمل سلطنت اس قسم کی تنظیم کی ایک قسم تھی۔ آمرانہ اور مطلق العنان حکومتیں مخصوص گھرانوں کی وہ تنظیمیں ہیں جو دیگر گھرانوں اور تنظیموں کو داؤ پر لگا کر اپنا مفاد حاصل کرتی ہیں۔ ان تنظیموں میں کم و بیش، ہمیشہ نفرت و کراہت پر مبنی جذبات مثلاً ڈر، خوف نفرت، تحقیر وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ جہاں اس قسم کے جذبات شدید طور پر محسوس کئے جاتے ہوں، وہاں یہ جذبات تنظیموں کی نشو و نما میں رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔

دینی عقائد اس قسم کی رکاوٹ کی مثالیں ہیں۔ مسیحیت کے آغاز کے قریب چند صدیوں کے دوران کے علاوہ یہودیوں کو یہ قطعی خواہش نہ تھی کہ غیر یہودیوں کو اپنے مذہب و دین میں شامل کریں۔ وہ اپنے اسی احساسِ برتری پر قناعت کئے ہوئے تھے کہ وہ خدا کے پسندیدہ بندے ہیں۔ شنٹو (Shinto)، جس کی تعلیم یہ ہے کہ جاپان اس کائنات میں سب سے پہلے وجود میں آ گیا تھا، کی بھی قطعی خواہش نہیں ہے کہ غیر جاپانی بھی اس کی طرف متوجہ ہوں۔ ہر شخص کو Auld Lichts کی جنت میں آمد کا قصہ معلوم ہے، اور سب کو یہ بھی علم ہے کہ انہیں اس خدشے کے پیش نظر یہ معلوم کرنے سے روک دیا گیا تھا کہ وہاں اور لوگ بھی موجود ہیں جو ان کی لطف و مسرت اور روحانی لطافت میں خلل ڈال سکتے ہیں۔ اسی قسم کا جذبہ ایک زیادہ خوفناک صورت بھی اختیار کر سکتا ہے۔ اذیت رسانی، اذیت پہنچانے والے کے لئے اس قدر خوش کن ثابت ہو سکتی ہے کہ اس کے لئے بے دینوں کے بغیر یہ دنیا نہایت ہی بیزار کن ثابت ہوتی۔ اسی طرح چونکہ ہٹلر اور مسولینی کے نزدیک انسانی سرگرمیوں میں سے جنگ ایک نہایت ہی شائستہ سرگرمی ہے، اس لئے وہ اس امر پر خوش نہ ہوتے کہ وہ دنیا فتح کر لیتے اور جنگ کرنے کے لئے کوئی دشمن باقی نہ رہتا۔ اسی طرح جماعتی سیاست اس وقت بے کیف و بے مزہ ہو جاتی ہے جب ایک جماعت قطعی طور پر

برتری حاصل کر لیتی ہے۔

لہٰذا ایک ایسی تنظیم جو فخر و تکبر، حسد، نفرت، تحقیر کے جذبات پر مشتمل ہو اور لڑائی، جھگڑے اور اختلافات اس کے لئے خوشی و مسرت کا باعث ہوں، عالمگیر نوعیت کی حامل ہونے کے باوجود بھی اپنے مقاصد حاصل نہیں کر سکتی۔ ایسے جذبات سے بھرپور دنیا میں جو تنظیم عالمی حیثیت اختیار کر لیتی ہے، اس کے ٹوٹ جانے اور منتشر ہو جانے کا امکان یقینی ہوتا ہے کیونکہ یہ اپنے مقاصد سے بھٹک چکی ہوتی ہے۔

جو کچھ ابھی بیان کیا جا چکا ہے، اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ ہم نے جملہ تنظیموں کے عام ارکان کے جذبات ہی کو زیر غور رکھا لیکن ان کی حکومتوں کے جذبات کو نظر انداز کر دیا۔ بہر حال تنظیم کا جو بھی مقصد ہو، اس کی حکومت اقتدار کے ذریعے اپنی طمانیت اور تسکین کا سامان فراہم کرتی ہے اور نتیجے کے طور پر یہ تنظیم وہ مفاد حاصل کرتی ہے جو اس کے ارکان کے ساتھ ہم آہنگ اور منطبق نہیں ہوتا۔

بہر حال تنظیموں کے متحرکات میں سے بہت ہی اہم فرق موجود ہے جن میں وہ جذبات شامل ہیں جنہیں ایک تو باہمی تعاون کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے، اور دوسرے وہ ہیں جن کے باعث لازمی طور پر اختلاف اور جھگڑا پیدا ہوتا ہے۔ اس مضمون اور عنوان کی نوعیت بہت وسیع ہے، اور فی الوقت میں تنظیموں کے مقاصد کو زیر بحث لائے بغیر ان کے جائزے اور مطالعے میں پیش آنے والی مشکلات اور رکاوٹوں کا ہی ذکر کر رہا ہوں۔

میں اس سے پہلے ایک تنظیم کی نشو و نما، ترقی اور اس کی حریفوں کے ساتھ مسابقت اور مقابلے کے بارے بتا چکا ہوں۔ ڈارون کے نظریے کی مکمل مثال سامنے رکھتے ہوئے، اس کے تنزل اور قدیم دور کے متعلق کچھ نہ کچھ کہہ دینا چاہئے۔ یہ حقیقت کہ انسان فانی ہے، تنظیموں کے زوال کی وجہ نہیں لیکن اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ تنظیمیں افراد کی موجودگی کے باوجود پرتشدد زوال کا شکار ہو جاتی ہیں، لیکن اس موضوع کو فی الحال زیر غور نہیں لانا چاہتا۔ اس وقت میں جس امر کی طرف اپنی توجہ مرکوز کرنا چاہتا ہوں، وہ ایک تنظیم کی کمزوری، ناتوانائی اور سست روی ہے اور اس کی مثال اس بوڑھے آدمی کے مانند ہے جو قدیم تنظیموں میں اکثر ہمیں نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے بہترین مثال اس چینی سلطنت کی ہے جو 1911 کے انقلاب سے قبل موجود

تھی۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح یہ دنیا میں ایک قدیم حکومت کی حیثیت سے موجود تھی، رومی سلطنت کے عروج کے دور میں اور پھر خلافت کے عظیم زمانے میں اس کے پاس زبردست فوجی قوت موجود تھی۔ یہاں ایک طویل عرصے سے متمدن اور مہذب معاشرتی روایات اور اقدار رائج تھیں، اور پھر مقابلے کے امتحانوں کے ذریعے منتخب ہونے والے قابل اور ذہین ترین افراد حکومت کا انتظام وانصرام سنبھالتے تھے۔ سخت روایات، صدیوں سے جبر واستبداد کا معمول اس سلطنت کے زوال کا باعث تھا۔ اہل علم کے لئے اس امر کا ادراک نا قابلِ فہم تھا کہ کنفیوشس کے نظریات وخیالات کے علاوہ دوسرے نظریات وخیالات مغربی اقوام کا مقابلہ کرنے کے لئے درکار تھے، یا پھر وہ افکار و نظریات جو نیم استبدادی نسلی گروہوں کے خلاف کارآمد تھے، یورپی اقوام کے مقابلے میں بے کار تھے۔ ایک تنظیم کو اپنی نشوونما اور ترقی کے لئے کامیابی پر مبنی معمولات اور سرگرمیاں درکار ہوتی ہیں، اور پھر جب حالات میں نئی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں کہ کامیابیاں حاصل کرنے کی خواہش اور عادت اس قدر پختہ اور مضبوط ہو چکی ہوتی ہے کہ اس میں دراڑ نمودار ہونے کا خدشہ اور خطرہ باقی نہیں رہتا۔ انقلابی ادوار میں حاکمیت جن کا معمول تھا، وہ یہ فوری احساس نہ کر سکے کہ وہ اطاعت گزاری کے باہمی اصول و معمول کے مزید متحمل نہیں ہو سکتے۔ مزید برآں، وہ عزت واحترام، جو بلند و مناصب و مراتب پر فائز افراد، بنیادی طور پر اپنی بااختیار حیثیت کو مُسلّم کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک ایسے سخت گیر نظامِ قواعد وضوابط میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کے باعث ان کی عملی اور فعال صلاحیتیں کند ہو جاتی ہیں اور وہ اپنی کامیابی اور ترقی کے لئے درکار علم و معلومات حاصل کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ بادشاہ جنگوں کی مزید قیادت نہیں کر سکتے کیونکہ ان کی حیثیت و مرتبہ نہایت مقدس و محترم ہوتا ہے، انہیں تلخ اور ناخوشگوار حقائق سے آگاہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس صورت میں وہ پیغامبر کو قتل کروا دیتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ محض علامتی بادشاہ رہ جاتے ہیں، اور کسی دن عوام پر اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ ان کی یہ علامتی حیثیت بھی محض بے وقعت ہے۔

بہرحال، تنظیموں کے زوال کی یہ وجہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر، امریکی آئین کے مطابق کسی شخص یا ادارے کو اس قسم کے احترام اور تقدیس کا درجہ حاصل نہیں ہوتا جو جہالت اور ناکامی کا باعث ثابت ہو، اور نہ ہی یہ آئین کسی حد تک سپریم کورٹ سے صرف نظر کرتے ہوئے کسی شخص یا ادارے

کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ نئے حالات کے مطابق خود کو نہ ڈھالیں۔ اس قسم کی کوئی ایسی واضح وجہ بھی موجود نہیں ہے کہ ایک تنظیم کو لامحدود مدت تک قائم رہنا چاہئے۔ لہٰذا میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب اکثر اندرونی سخت گیر روایات یا بیرونی وجوہات کی بنا پر ان تنظیموں کی قسمت میں زوال ہی لکھا ہوتا ہے، تو کوئی بھی دائمی وجہ موجود نہیں ہوتی جو قسمت کے اس لکھے کو ٹال سکے۔ اس مرحلے پر اگر ترکیبی اور ہیتی مثال کو سامنے رکھا جائے تو یہ گمراہ کن ثابت ہوتی ہے۔

بارھواں باب

اختیارات اور حکومتی اقسام

ایک تنظیم کے مقصد سے قطع نظر، اس کی چار بہت ہی اہم خصوصیات درج ذیل ہیں:

1- حجم(Size)

2- اپنے ارکان پر اختیار (Power over Members)

3- دیگر افراد پر اختیار (Power over Non-members)

4- حکومتی اقسام (Form of Government)

پہلی خصوصیت، حجم (Size) کے علاوہ بقیہ تین خصوصیات اس باب کا موضوع ہیں۔

ایک ریاست کے علاوہ، قانونی طور پر قائم شدہ تنظیموں کو اپنے ارکان پر اختیار کا حق حاصل ہوتا ہے جو قطعی طور پر قانون کے دائرے تک محدود ہوتا ہے۔ اگر آپ ایک بیرسٹر ہیں، ایک وکیل ہیں، ایک ڈاکٹر ہیں، یا پھر دوڑنے والے گھوڑوں کے مالک ہیں، تو پھر بھی آپ کو اپنے کام سے روکا جا سکتا ہے، آپ کا نام حاضرین کی فہرست سے خارج کیا جا سکتا ہے، یا پھر آپ کو میدان سے نکال باہر کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام سزاؤں میں تحقیر و اہانت کا عنصر شامل ہوتا ہے اور ان کے باعث آپ شدید ترین معاشی مشکلات کا شکار ہو سکتے ہیں۔ لیکن خواہ آپ اپنے پیشے میں کتنے ہی نامقبول کیوں نہ ہوں، آپ کے ہم پیشہ ساتھی قانونی طور پر آپ کے ساتھ اس پیشے کی متعلقہ سرگرمیوں سے روکنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اگر آپ ایک سیاستدان ہیں تو آپ کو متعلقہ سیاسی جماعت سے خارج تو کیا جا سکتا ہے لیکن کسی دوسری سیاسی جماعت میں شامل ہونے یا سیاسی اور پارلیمانی انتخابات سے دور رہ کر ایک پرسکون زندگی بسر کرنے سے قطعاً روکا نہیں جا سکتا۔ ریاست کے علاوہ ایک تنظیم کے لئے اپنے ارکان پر اختیار کے حق کا انحصار، ارکان کو تنظیم

میں سے خارج کر دینے کے حق پر ہے، اور ارکان کو تنظیم میں سے خارج کر دینے کا حق لعن طعن اور اخراج کے باعث پیدا ہونے والی مالی مشکلات کے لحاظ سے زیادہ یا کم شدید ہوتا ہے۔

اس کے برعکس اپنے شہریوں پر ریاست کا اختیار لامحدود ہوتا ہے سوائے اس کے کہ آئین میں اس امر کی گنجائش موجود ہو کہ شہریوں کو زبردستی گرفتار نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی زبردستی ان کا مال و اسباب ہتھیا جا سکتا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا میں کسی شخص کو زندگی، آزادی یا جائیداد سے اس وقت تک محروم نہیں کیا جا سکتا جب تک ایک معقول قانونی کارروائی کے ذریعے، یعنی عدالتی حکام کی طرف سے یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ ایک جرم کا مرتکب ہو چکا ہے جس کے لئے قانون میں پہلے ہی سزا مقرر کی جا چکی ہے۔ اگرچہ انگلستان میں حکومت و قانون کی طاقت و اختیار اسی طرح محدود ہے لیکن مقننہ بھرپور اختیار و طاقت کی مالک ہے، اور یہ ایک ایسا قانون وضع کر سکتی ہے کہ کسی جرم کے مرتکب ہونے کا الزام لگا کے جان سمتھ کو سزائے موت دی جائے یا اس کی جائیداد قرق کر لی جائے۔

"Acts of Attainder" کی شکل میں یہ قوت و اختیار ایک ایسا وسیلہ اور ذریعہ تھا جس کے ذریعے پارلیمان نے حکومت کا انتظام سنبھال لیا۔ ہندوستان اور دیگر مطلق العنان ریاستوں میں، یہ طاقت و اختیار حکومتی ارباب اختیار کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور وہ اسے آزادانہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ صورت حال ان ریاستوں میں موجود روایات اور اقدار کے مطابق ہوتی ہے، اور جو ریاستیں اس مطلق العنانیت سے محروم ہو جاتی ہیں، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے، وہاں شہری آزادیوں کا نظام مروج ہو چکا ہوتا ہے۔

اپنے ارکان کے علاوہ دیگر افراد پر تنظیموں کی طرف سے اختیار و طاقت کے نفاذ کی وضاحت آسان نہیں ہے۔ غیر ملکیوں کے لحاظ سے ریاست کے اختیارات کا انحصار جنگ چھڑنے کے امکان پر ہوتا ہے۔ اس اصول کا اطلاق محصولات اور نقل مکانی (ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقلی) کے قوانین پر ہوتا ہے، اور چین میں یہ دونوں قوانین فوجی شکست کے نتیجے میں طے پانے والے معاہدوں کے ذریعے رائج اور نافذ کئے گئے۔ اگرچہ ایک ریاست کو دوسری ریاست پر قابل قدر برتری حاصل ہو، حتیٰ کہ زیردست ریاست کے عوام کو وہاں سے نکل جانے کا حکم بھی دے دیا جائے، تو پھر ایک ریاست، دوسری ریاست پر فوجی طاقت سے محرومی کے باعث اختیار و قوت استعمال نہیں

کی جا سکتی ہے، اور یہ صورت حال اکثر واقع ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر 'بک آف جوشوا' (Book of Joshua) اہلِ بابل کی گرفتاری اور جنوبی امریکی ہندیوں کی محصوری پر ان تحفظات کے لحاظ سے غور کیجئے جب انہیں نکال باہر نہیں کیا گیا۔

نجی تنظیموں کے بیرونی اختیارات کو ایک ریاست حسد کی نگاہ سے دیکھتی ہے، اور اس لئے یہ اختیارات کافی حد تک ماورائے قانون ہوتے ہیں۔ ان کا انحصار زیادہ تر بائیکاٹ اور ڈرانے دھمکانے کی دیگر انتہائی اور شدید اقسام پر ہوتا ہے۔ اس قسم کا دہشت گردانہ اختیار و رسوخ عام طور پر انقلاب یا افراتفری کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ آئرلینڈ میں قتل عام کے باعث زمین داروں اور جاگیرداروں کو زوال کا سامنا کرنا پڑا اور پھر برطانوی تسلط ختم ہو گیا۔ زارِ روس کے عہد میں انقلابی کارروائیوں کا انحصار بہت حد تک دہشت گردانہ طور طریقوں پر ہوتا تھا۔ نازیوں نے غیر قانونی متشدد کارروائیوں کے ذریعے اپنا راستہ ہموار کیا۔ زمانہء حال میں چیکوسلوویکیہ میں جرمن آبادی میں سے جو لوگ ہینلئن (Henlein) کی جماعت میں شامل نہیں ہوں گے، انہیں اس قسم کی دھمکیاں وصول ہوتی ہیں، مثلاً ''تم ہمارے نشانے پر ہو'' یا ''اب تمہاری باری آئے گی''، اور جب جرمنوں نے آسٹریا پر قبضہ کیا، تو اس وقت مخالفین کے ساتھ جو بیتی اسے پیش نظر رکھتے ہوئے اسی قسم کی دھمکیاں بہت موثر ثابت ہوتی ہیں۔ ایک ریاست جو اس قسم کی لاقانونیت سے مقابلہ نہیں کر سکتی، عام طور پر بہت جلد پریشان کن صورت حال میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ اگر یہ لاقانونیت ایک سیاسی نظریے اور لائحہ عمل کی حامل ایک واحد تنظیم کی طرف سے ہو، تو پھر اس کا نتیجہ انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے لیکن اگر یہ لاقانونیت ڈاکوؤں اور رہزنوں کے جتھوں اور باغی و سرکش فوجیوں کی طرف سے ہو تو پھر نتیجہ محض افراتفری، بدنظمی اور انتشار کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔

جمہوری ممالک میں نہایت ہی اہم تنظیموں کی نوعیت معاشی ہوتی ہے۔ خفیہ تنظیموں کے برعکس، یہ تنظیمیں کسی لاقانونیت کے بغیر دہشت گردی کی مرتکب ہوتی ہیں کیونکہ وہ اپنے مخالفین اور دشمنوں کو قتل کرنے کی دھمکی نہیں دیتیں بلکہ انہیں دھمکانا چاہتی ہیں۔ اس قسم کی دھمکیوں کے ذریعے، جن کے واضح اظہار کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی، وہ پھر بھی حکومتوں کو شکست سے دوچار کر دیتی ہیں، جیسا کہ فرانس میں صورت حال پیش آئی۔

جہاں تک نجی تنظیموں کی طرف سے یہ فیصلہ کرنے کا تعلق ہے کہ ان میں شامل افراد کے پاس کھانے کے لئے کافی کچھ ہوگا یا نہیں ہوگا، تو پھر ریاست کی قوت و طاقت واضح طور پر شدید مشکلات کا شکار ہو جاتی ہے۔ جرمنی اور اٹلی میں، روس کے مانند، اس ضمن میں ریاست کو نجی سرمایے پر غلبہ حاصل ہے۔

اور اب میں مختلف حکومتی اقسام کے متعلق آپ کو بتاتا ہوں، اور اس موضوع کی ابتدا فطری اور قدرتی طور پر تاریخِ عالم میں سب سے زیادہ قدیم، سادہ اور وسیع طور پر آئین یعنی ایک مکمل شہنشاہیت کے ساتھ ہوتی ہے۔ میں اس وقت ایک بادشاہ یا ایک جابر اور ظالم حکمران کے درمیان فرق واضح نہیں کر رہا بلکہ میں تو اس وقت صرف فردِ واحد کی حکومت کو زیرِ غور لا رہا ہوں خواہ یہ حکومت موروثی بادشاہ یا کسی غاصب پر مشتمل ہو۔ اہلِ بابل کی تاریخ سے لے کر ایرانی شہنشائیت، مقدونیہ اور روم کی سلطنتیں اور پھر خلافت سے لے کر عظیم مغلوں تک اس قسم کی حکومت ہمیشہ سے ہی ایشیا میں موجود رہی ہے۔ یہ سچ ہے کہ چین میں شیہ ہوانگ ٹی (تیسری صدی قبل مسیح) کے عہد کے سوا شہنشاہ کبھی اس قدر طاقتور نہیں رہا جس نے کتابیں جلا دی تھیں اور بعض اوقات اہلِ علم اسے عام طور پر شکست دے سکتے تھے۔ لیکن چین میں کسی بھی قسم کا قانون ہمیشہ ہی موجود نہیں رہا۔ عہدِ حاضر میں اگرچہ شہنشائیت زوال پذیر معلوم ہوتی ہے لیکن اس قسم کا کوئی نظام جرمنی، اٹلی، روس، ترکی اور جاپان میں اب بھی موجود ہے۔ بہرحال یہ تو واضح ہے کہ نظامِ حکومت کی ایک ایسی قسم ہے جو انسان کے نزدیک فطری نوعیت کی حامل ہے۔

نفسیاتی طور پر اس کے فوائد بہت ہی واضح ہیں۔ عمومی طور پر ایک قبیلہ یا گروہ اپنے حکمران کی سرکردگی میں فتح حاصل کرتا ہے اور اس کے حامی اس عظیم الشان فتح میں خود کو بھی شریک سمجھتے ہیں۔ میڈس (Medes) کے خلاف بغاوت میں سائرس (Cyrus) نے ایرانیوں کی قیادت کی، اسکندر نے اہلِ مقدونیہ کو اقتدار اور دولت سے نوازا، نپولین نے انقلابی افواج کو فتح دلائی۔ لینن اور ہٹلر کے اپنی جماعتوں کے ساتھ تعلقات ایک ہی قسم کے تھے۔ جس گروہ یا قبیلے کا یہ فتح مند حکمران سربراہ ہوتا ہے، وہ گروہ یا قبیلہ، آمادگی اور رضامندی سے اس حکمران کی اطاعت کرتا ہے، اور اس کی کامیابیوں کے باعث خود کو بھی برتر اور فائق تصور کرتا ہے، اور اس کے اطاعت گزار افراد خوف اور تعریف کی ملی جلی کیفیت محسوس کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں نہ تو سیاسی تربیت اور نہ ہی

مصالحت کی عادت اور معمول درکار ہوتا ہے، صرف جبلی معاشرتی پیوستگی کی ضرورت ہوتی ہے جو اس چھوٹے سے اطاعت گزار اور وفادار گروہ کے لئے ضروری ہے جس کا ادراک اس حقیقت کی موجودگی میں نہایت آسان ثابت ہوتا ہے کہ تمام کامیابیاں اس بہادر شخص (حکمران) ہی کی مرہونِ منت ہیں۔ جب وہ مر جاتا ہے کہ اس کا بنایا ہوا سارا نظام منتشر ہو جاتا ہے جیسے اسکندر کے ساتھ ہوا، لیکن اگر قسمت ساتھ دے تو ایک قابل اور باصلاحیت جانشین اس وقت تک اس نظام کو جاری رکھ سکتا ہے جب تک اقتدار کی ایک نئی روایت قائم نہیں ہو جاتی۔

مختلف افراد کے درمیان اتحاد، یگانگت، پیوستگی اور وابستگی کے لئے موجود ایک تعلق اور رشتے کو حکم اور اطاعت کے قطع نظر کسی دوسرے رشتے اور تعلق پر مبنی مشکل کو ریاستوں کے تعلقات کے ذریعے واضح اور مفصل طور پر بیان کیا جا سکتا ہے۔ ایسی بے شمار مثالیں اور واقعات موجود ہیں جہاں فتوحات کے ذریعے چھوٹی چھوٹی ریاستیں عظیم سلطنتوں میں تبدیل ہو گئیں لیکن ان میں سے بمشکل ہی رضا کارانہ طور پر ایک وفاق میں تبدیل ہو سکیں۔ فلپ (Philip) کے دورِ حکومت میں یونان اور نشاۃ ثانیہ کے دور میں اٹلی کے حوالے سے مختلف خودمختار ریاستوں کے درمیان کسی نہ کسی حد تک تعاون، زندگی یا موت کا معاملہ تھا لیکن ابھی تک اس کا کچھ فیصلہ نہیں ہو سکا۔ عہد حاضر میں یہی نظریہ اور اصول یورپ پر منطبق ہوتا ہے۔ جو شخص حکم دینے کا عادی ہو، یا پھر ایک آزاد زندگی بسر کرتا ہے، اسے اس امر پر مجبور کرنا آسان نہیں ہے کہ وہ رضا کارانہ طور پر کسی بیرونی طاقت کے آگے جھک جائے۔ یہ صورت حال اس وقت ضرور رونما ہوتی ہے، جب عام طور پر راہزنوں کا ایک گروہ، جہاں ایک چھوٹی سی تعداد کو یہ امید ہوتی ہے کہ عوام الناس کو داؤ پر لگا کر بہت زیادہ فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے، اور انہیں اپنے سربراہ پر اس قدر اعتماد اور بھروسا ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کی تکمیل اس کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ صرف یہی صورت حال ہے جس کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ حکومت ایک ''عمرانی معائدے'' کے ذریعے وجود میں آتی ہے، اور اس معاملے میں معائدہ ''ہوبس'' (Hobbes) کے بجائے ''روسو'' (Rousseau) کا ہے، یعنی یہ ایک ایسا معائدہ ہے جو ان کے اور ان کے سربراہ کے درمیان نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسا معائدہ ہے جس کے ذریعے شہری (یا لٹیرے) ایک دوسرے کو دھوکا دیتے ہیں۔ اس ضمن میں نفسیاتی طور پر اہم نکتہ یہ ہے کہ افراد صرف اس وقت ہی اس معائدے پر رضامند ہوتے ہیں جب غارت گری اور فتوحات کے

بے شمار مواقع میسر ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسا نفسیاتی طریقہ کار ہوتا ہے جو اگر چہ اپنے طور پر واضح شکل میں موجود نہیں ہوتا مگر جس کے ذریعے وہ بادشاہ بھی کامیاب ہو چکے ہیں جو کامیاب جنگ کے ذریعے بھی مکمل اختیارات نہیں حاصل کر سکے۔

مندرجہ بالا بحث و مباحثے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جب ایک شہنشاہ کی مطلق العنان حکومت کے لئے ایک گروہ کے ان ساتھیوں کی طرف سے رضا کارانہ رضامندی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو حکومت حاصل کرنے کے بالکل قریب ہوتے ہیں، تو پھر اس کے عوام کی اکثریت عام طور پر پہلے تو اس کے خوف کے باعث، اور پھر بعد میں رسم و رواج اور روایت کے نتیجے میں اس کی اطاعت اختیار کر لیتی ہے۔

''عمرانی معائدہ'' صرف اس وقت وجود میں آتا ہے جب یہ بذات خود مکمل طور پر تمثیلی صورت میں موجود نہیں ہوتا، اور یہ معائدہ ان فاتحین کے درمیان ہوتا ہے جو اپنی حقیقت اس وقت کھو بیٹھتے ہیں جب یہ اپنی فتوحات کے فوائد سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ جہاں تک عوام کی اکثریت کا تعلق ہے، رضامندی یا آمادگی نہیں، بلکہ یہ صرف خوف ہی ہوتا ہے جس کے باعث رعایا اس بادشاہ کی اطاعت گزار ہوتی ہے جس کا اقتدار ایک ہی قبیلے یا گروہ تک محدود نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ ایک چھوٹے گروہ میں وفاداری کے امکانات، اور ایک بڑے گروہ میں خدشات، اس قدر سادہ اور آسان ہوتے ہیں کہ خود مختار ریاستوں کے علاقوں میں اضافہ رضا کارانہ اتحاد کے باعث نہیں بلکہ فتوحات کے ذریعے ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ شہنشائیت نے تاریخ عالم میں ایک عظیم کردار ادا کیا ہے۔

بہر حال شہنشائیت کے نقصانات بہت زیادہ ہیں۔ اگر یہ موروثی ہے تو پھر اس امر کا کوئی امکان نہیں کہ آئندہ حکمران بھی قابل، ذہین اور سمجھدار ہوں گے، اور پھر اگر جانشینی کے اصول کے متعلق کسی بھی قسم کی غیر یقینیت موجود ہے تو پھر خاندان میں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔ مشرقی ممالک میں عام طور پر ایک نیا حکمران اس وقت اقتدار میں آتا جب وہ اپنے بھائی کو مروا دیتا، اگر یہ بھائی بچ جاتا تو پھر وہ تخت کے حق کا دعوی کر دیتا کہ قتل ہونے سے محفوظ ہونے کا یہ واحد طریقہ ہوتا۔ مثال کے طور پر اگر آپ مغلوں کے دورِ حکومت کے متعلق حالات کا مطالعہ کرتے ہیں تو آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ کسی اور چیز کے باعث نہیں، بلکہ جانشینی کے لئے لڑی جانے والی جنگوں

نے مغلیہ سلطنت کو کمزور کیا۔ ہمارے ملک میں ''گلابوں کی جنگیں'' (War of the Roses) اسی سبق آموز حصے کی علامت ہیں۔

اس کے برعکس، اگر شہنشائیت موروثی نہیں ہے تو پھر بھی خانہ جنگی کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ خانہ جنگی کے اس خطرے کی وضاحت رومی سلطنت کے دور میں کموڈوس (Commodus) کی موت سے لے کر کانسٹینٹائن (Constantine) کے اقتدار سنبھالنے پر مشتمل حالات و واقعات سے بخوبی ہو جاتی ہے۔ اس مسئلے کا ابھی تک صرف ایک واقعی کامیاب حل وضع کیا جا سکا ہے۔ یہ ایک ایسا طریقہ ہے کہ جس کے ذریعے پاپائے اعظم منتخب ہوتا ہے۔ لیکن یہ ایک ترقی کی ایسی آخری اصطلاح ہے جس کا جمہوریت کے ذریعے آغاز ہوا، اور حتیٰ کہ اس معاملے میں عظیم اختلاف یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ طریقہ بھی درست اور صحیح نہیں ہے۔

شہنشائیت کا ایک اور ابھی تک موجود نقصان یہ حقیقت ہے کہ عام طور پر اسے عوام کے مفاد کے ساتھ اس وقت تک کوئی دلچسپی نہیں ہوتی جب تک عوام کے مفادات، بادشاہ کے مفادات کے مطابق نہ ہوں۔ مفادات کی یہ یکسانیت صرف ایک حد تک جاری رہنے کا امکان ہوتا ہے۔ بادشاہ کو صرف اندرونی خلفشار پر قابو پانے ہی کی دلچسپی ہوتی ہے، اور جب اندرونی خلفشار، افراتفری اور بدنظمی کا بہت زیادہ خطرہ ہوتا ہے تو تب ہی اسے عوام کے قانون پسند طبقے کی حمایت حاصل ہوتی ہے اسے صرف اپنے عوام کی دولت سے دلچسپی ہوتی ہے اس لئے وہ ایک نظامِ محصولات نافذ کرتا ہے جس کے ذریعے اسے زیادہ سے زیادہ دولت حاصل ہو۔ غیر ملکی حملے کے دوران اس وقت اس کے اور عوام کے مفادات ایک رہتے ہیں جب تک بادشاہ فتح یاب نہیں ہو جاتا۔ جب تک یہ بادشاہ اپنی سلطنت کی حدود میں اضافہ کرتا رہتا ہے، تو پھر وہ داخلی گروہ جن کا وہ آقا کی بجائے راہنما ہوتا ہے، اس کی ان خدمات اور فتوحات کو اپنے لئے مفید پائیں گے۔ لیکن بادشاہ دو وجوہات کی بنا پر گمراہ اور بھٹک جاتے ہیں اور اپنے مقصد سے دور ہو جاتے ہیں۔ فخر و تکبر اور اس داخلی گروہ پر انحصار جس کی قوت اختیار ختم ہو چکی ہے۔ جہاں تک فخر و غرور کا تعلق ہے، مصریوں کو اپنے اہراموں پر فخر تھا، اور فرانسیسی آخر تک اپنے شہروں ورسیلز (Versailles) اور لووری (Louvre) کے متعلق ہمیشہ ہی شکوہ و شکایت ہی میں مبتلا رہے اور معلمینِ اخلاق ہمیشہ ہی درباروں کی شاہانہ اور پرتعیش نوعیت کے خلاف لوگوں کو ورغلاتے اور پھسلاتے رہے۔

انجیل مقدس کے ذریعے ہمیں بتایا گیا کہ ''شراب خباثت ہے، عورت برائیوں کا مجموعہ ہے، بادشاہ پرلے درجے کا چالاک اور برا انسان ہے۔''

شہنشائیت کے زوال کی دوسری وجہ زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ بادشاہ عوام الناس کے ایک مخصوص طبقے پر انحصار کی عادت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً طبقہ امراء، مذہبی علماء، اعلیٰ درجے کے روایت پسند افراد، یا شاید ایک جغرافیائی گروہ جس طرح کوسیک (Cossack)۔ آہستہ آہستہ معاشی یا تہذیبی تبدیلیوں کے باعث پسندیدہ گروہ کی طاقت وقوت کم ہو جاتی ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ بادشاہوں کی مقبولیت میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ نکولس دوم (روسی شہنشاہ) کے مانند وہ اس قدر بیوقوف ہوتا ہے کہ وہ ان لوگوں کی حمایت بھی کھو بیٹھتا ہے جنھیں مکمل طور پر ان کے ساتھ ہونا چاہئے تھا لیکن یہ استثنائی نوعیت کی حامل ہے۔ چارلس اول اور لوئیس سولھویں کو طبقہ امراء کی حمایت حاصل تھی۔

ایک بادشاہ یا آمر اس وقت اپنا اقتدار برقرار رکھ سکتا ہے جب وہ اپنی داخلی سیاست کے حوالے سے بہت ہی زیرک و ہوشیار ہو اور بیرونی سیاست میں بھی کامیاب ہو۔ اگر اس کی نوعیت کسی حد تک روحانی ہو تو وہ اپنی حکومت کو لامحدود عرصے تک طول دے سکتا ہے۔ لیکن تہذیبی ترقی اور نشوونما کے باعث اس کی الوہی حیثیت کا اختتام ہو جاتا ہے، ہمیشہ ہی جنگ سے نہیں بچا جا سکتا اور سیاسی ذکاوت ودانائی، شہنشاہوں کی دائمی خوبی نہیں بن سکتی۔ اگر اور کوئی بھی بیرونی حکمران اس سلطنت کو فتح نہیں کرتا تو پھر جلد یا بدیر انقلاب برپا ہو جاتا ہے، اور شہنشائیت یا تو زوال پذیر ہو جاتی ہے یا اس کی طاقت کم ہو جاتی ہے۔ ایک مکمل شہنشائیت کے زوال کے بعد فطری طور پر طبقہ امراء کی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ حکومت کئی اقسام کی ہو سکتی ہے، یہ موروثی مطلق العنانیت کی حکومت ہو سکتی ہے، دولت مند افراد حکومت بنا سکتے ہیں، مذہبی ادارے اقتدار میں آ سکتے ہیں، یا پھر ایک سیاسی جماعت بااختیار و بااقتدار ہو سکتی ہے۔ ایک موروثی مطلق العنانیت کا رجحان قدامت پرستی کی طرف ہو سکتا ہے، یہ حکومت فخر وتکبر کی حامل ہو سکتی ہے، اس کے انداز واطوار احمقانہ بلکہ ظالمانہ نوعیت اختیار کر سکتے ہیں۔ دوسرے افراد میں انھی وجوہات کی بنا پر اعلیٰ سطحی روایتی طبقے کے خلاف جدوجہد میں اس کی حالت ہمیشہ بہت ہی خراب ہو جاتی ہے۔

دولت مند طبقے کی حکومت زمانہ وسطیٰ کے تمام آزاد شہروں میں قائم رہی اور وینس میں اس وقت

برقرار رہی جب نپولین نے اس کا چراغ گل نہیں کر دیا۔ مجموعی طور پر اس طرح کی حکومتیں تاریخ عالم میں موجود کسی دیگر حکومتوں کی نسبت زیادہ روشن نظر، فکرانگیز اور زیرک و دانا تھیں۔ خاص طور پر وینس نے صدیوں پر مشتمل بے شمار ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے باوجود بہت ہی دانشمندانہ اور زیرک رویہ اختیار کیا اور کسی بھی ہم عصر ریاست کی نسبت اس کے سفارتی تعلقات نہایت ہی جاندار اور پُرمغز تھے۔ تجارت کے ذریعے حاصل ہونے والی دولت نہایت ہی ہوشیاری سے حاصل کی جاتی ہے جو آمرانہ نہیں ہوتی اور اس کی خوبی اور صلاحیت ان حکومتوں کی طرف سے ہوتی ہے جو کامیاب سوداگروں اور تجار پر مشتمل ہوتی ہے۔ جدید صنعتی مہا سیٹھ کی نوعیت یکسر مختلف ہوتی ہے، اور جزوی طور پر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کا زیادہ تر تعلق اموال کی تکنیکی حکمت سے ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ انسانوں کے ساتھ اس کے تعلقات ترجیحی طور پر اس کے ہم مرتبہ انسانوں، جنہیں مجبور تو نہیں کیا جا سکتا بلکہ انہیں صرف تحریک مہیا کی جا سکتی ہے، کے بجائے ملازمین کی ایک فوج کے ساتھ ہوتے ہیں۔

ایک مذہبی ادارے (کلیسا) یا سیاسی جماعت کی حکومت جسے دینی حکومت بھی کہا جا سکتا ہے، طبقہ امراء کی ایک ایسی حکومت کہی جا سکتی ہے جسے حالیہ برسوں میں ایک نئی اہمیت حاصل ہو چکی ہے۔ اس کی ایک پرانی قسم تھی جو سینٹ پیٹر کی کلیسائی وراثت اور پیراگوئے میں رومن کیتھولک فرقے کے دور میں موجود تھی۔ لیکن اس کی جدید قسم کی صورت کا آغاز جنیوا میں کیلون (Calvin) کے دور حکومت سے ہوتا ہے، اور اس کا مُنسٹر (Munster) میں عیسائی شریعت سے بہت تھوڑا ہی تعلق ہے۔ اس سے بھی زیادہ صوفیوں اور برگزیدہ نیک بندوں کی حکومت تھی جو انگلستان میں تو ختم ہوگئی تھی لیکن نئے انگلستان (New England) میں کافی عرصے تک جاری رہی۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں میں اس قسم کی حکومت کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ یہ ناپید ہو چکی ہے۔ لیکن لینن نے اس کا احیاء کیا، اٹلی اور جرمنی میں اس کا نفاذ کیا گیا اور چین میں بھی اس کے قیام کے لئے سنجیدہ کوشش ہوئی۔

روس اور چین جیسے ممالک میں جہاں آبادی کی اکثریت اَن پڑھ ہے اور سیاسی سمجھ بوجھ اور تجربے سے نابلد ہے، ایک کامیاب انقلابی کو بہت ہی مشکل صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ مغربی ممالک میں مروج جمہوریت کی بنیادوں پر قائم جمہوریت ممکنہ طور پر کامیاب نہ ہوسکی، جب اسے

چین میں رائج کرنے کی کوشش کی گئی لیکن ابتدائی طور پر انتشار اور فساد پھیل گیا۔ اس کے برعکس، روس میں انقلابی جماعتیں صرف علاقائی طبقہ امراء اور متوسط طبقے کے دولت مند افراد کی تحقیر کے سوا کچھ نہیں کر سکیں، ان طبقات میں سے منتخب شدہ طبقہ امراء اپنے مطلوبہ مقاصد میں سے کوئی بھی حاصل نہ کر سکا۔ ''ہم، جس جماعت نے انقلاب برپا کیا ہے، اس وقت تک اقتدار میں رہیں گی جب تک ملک کے حالات جمہوریت کے لئے صحیح نہیں ہو جاتے، اور اسی دوران ہم اپنے اصولوں کے حوالے سے اپنے ملک میں آگاہی اور ادراک پیدا کریں گے۔''

بہر حال، نتیجہ عین اس طرح برآمد نہیں ہوا جس طرح سابق بالشویک طبقے کو امید تھی۔ خانہ جنگی، قحط اور کسانوں کے عدم اطمینان کے خدشے اور دباؤ کے تحت آمریت بتدریج زیادہ شدید ہوتی گئی، جبکہ لینن کی موت کے بعد کمیونسٹ جماعت میں جدوجہد کے باعث یہ آمریت ایک جماعت کے ہاتھوں سے نکل کر فردِ واحد کی حکومت کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اس تمام صورت حال کا پیشگی اندازہ مشکل نہ تھا۔ میں نے 1920 میں لکھا تھا: ''بالشویک نظریے کا تقاضا ہے کہ جلد یا بدیر، ہر ملک کو اس صورت حال میں ہم ہر ملک میں ایک ایسی حکومت کی موجودگی کی امید کر سکتے ہیں جو ان بے رحم افراد کے ہاتھ میں ہو جنہیں فطری طور پر آزادی کے لئے چاہ اور محبت نہ ہو اور وہ اس امر میں جلدی کی اہمیت کو نہ سمجھتے ہوں کہ آمریت سے آزادی کی طرف مراجعت کی جائے ——— یہ امر تقریباً ناگزیر نہیں ہے کہ بالشویک کی حیثیت اختیار کرنے والے افراد کو روس میں تعینات کیا جائے ——— وہ اپنے اقتدار کے اجارہ کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوں گے، اور اس وقت تک اقتدار میں رہنے کا بہانہ ڈھونڈیں گے جب تک کوئی نیا انقلاب انہیں اقتدار سے نکال باہر نہیں کر دیتا؟''

اس قسم کی وجوہات کے باعث، مذہبی حکومت کو جمہوریت کی طرف پیش رفت سمجھنا مشکل ہے حالانکہ دیگر پہلوؤں کے لحاظ سے دینی حکومت متعدد فوائد کی حامل ہے۔

جب مذہبی نظریات کے فوائد کسی نئے عقیدے کو ظاہر کریں تو بعض اوقات وہ بہت ہی مفید اور عظیم ہوتے ہیں اور بعض اوقات بالکل ہی بے کار ثابت ہوتے ہیں۔ پہلے تو یہ کہ انقلاب کے بعد مذہبی حکومت کے پیروکار سماجی تعلق اور وابستگی کے ایک مرکزے کی تشکیل کرتے ہیں، اور وہ اس لئے با آسانی ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں کیونکہ بنیادی اصولوں پر ان کا باہمی اتفاق ہوتا ہے، لہٰذا ان کے لئے ایک ایسی مستحکم حکومت کا قیام ممکن ہو جاتا ہے جس کا بذاتِ خود

ایک اپنا نظریہ اور عقیدہ ہو۔ دوسرے یہ کہ، جیسا کہ پہلے بھی یہ کہا جا چکا ہے کہ ایک اقلیت کی حیثیت سے کسی مذہبی ادارے (کلیسا) یا سیاسی جماعت کی کوئی قدر و قیمت اور اہمیت نہیں ہوتی کہ جس وقت جمہوریت کی ناکامی ناگزیر ہو جائے تو اس پر سیاسی اقتدار کی تشکیل کی جائے۔ تیسرے یہ کہ، اس حکومت کے پیروکار کو تقریباً یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ اس اوسط درجے کی عوام سے کہیں زیادہ باصلاحیت اور سیاسی سمجھ بوجھ کے مالک ہیں۔ جن سے وہ کئی بار علمی و ذہنی طور پر برتر ثابت ہو چکے ہیں۔ بہر حال کچھ نئے عقائد، جن میں وہ عقائد بھی شامل ہیں، جو طاقتور بن چکے ہیں، انہیں وہی لوگ پسند کرتے ہیں جو یا تو بیوقوف ہیں، یا پھر وہ لوگ جو موقع پرست ہیں اور مراتب و مناصب کی تلاش میں رہتے ہیں۔ لہٰذا اس عقیدے کے حامل چند ہی افراد میں صلاحیت و قابلیت پائی جاتی ہے۔

جب اقتدار و اختیار ایک ہی نظریے یا فرقے کے ارکان تک محدود ہو جاتا ہے تو پھر ناگزیر طور پر ایک شدید قسم کی نظریاتی پابندی عمل میں آتی ہے۔ مخلص اور سچے پیروکار اور حامی، درست اور سچے عقیدے کے پھیلاؤ کے مشتاق ہوں گے جبکہ دیگر افراد اس کی سطحی مطابقت اور اتباع پر ہی قناعت کر لیں گے۔ اول الذکر رویے اور طرزِ عمل کے باعث صلاحیت و ذکاوت کے آزادانہ استعمال کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور جب کہ موخر الذکر رویے اور طرزِ عمل کے باعث ریاکاری اور مکاری وجود میں آتی ہے۔ تعلیم اور ادب لازمی طور پر روایتی نوعیت کے ہونے چاہئیں اور ان کی تشکیل ایسے ہونی چاہیئے کہ ان کے باعث تنقید اور پیش قدمی کے بجائے زود اعتقادی اور خوش فہمی پیدا ہو۔ جب قائدین اپنے دینی عقائد کو زیادہ سے زیادہ پسند کریں تو پھر کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو دینی اقدار نہیں اپنائیں گے، اور روایتی اعتقاد پسندی کو زیادہ سے زیادہ واضح طور پر اور مفصل بیان کیا جا سکے گا۔ جو لوگ کسی ایک عقیدے سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں تو وہ اپنی طاقت و قوت کے لحاظ سے اپنی روزمرہ زندگی میں دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت کے اعتبار سے، اپنے عقیدے سے اوسط انداز میں متاثر افراد سے مختلف ہوتے ہیں۔ اگر اس قسم کے افراد ایک غیر مقبول حکومت کی باگ ڈور سنبھال لیں تو پھر نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ آبادی کی اکثریت معمول سے زیادہ بے ہودہ، ناشائستہ اور بے حس ہو جاتی ہے —— اور یہ ایک ایسی صورت حال ہوتی ہے جسے یہ آگاہی تقویت پہنچاتی ہے کہ دراصل نظریات و خیالات، بے دینی پر مبنی اور

خطرناک ہوتے ہیں۔ دینی اور مذہبی حکومت کے حکمران جنونی اور شدت پسند ہو سکتے ہیں، اور جنونی اور شدت پسند کی حیثیت سے وہ زیادہ انتہا پسند ہو جائیں گے، اور انتہا پسندی کے باعث ان کی مخالفت کی جائے گی، اور جب ان کی مخالفت کی جائے گی تو وہ زیادہ انتہا پسند ہو جائیں گے۔ ان میں ہوسِ اقتدار، حتیٰ کہ اپنے لئے بھی معدوم ہو جائے گی اور مذہبی جوش و جذبے کا لبادہ بھی اتر جائے گا اور وہ کسی بھی قسم کی مزاحمت کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ یہ صورت حال، گستاپو (نازی جرمنی کی خفیہ تنظیم) اور چیکا (روس کی خفیہ تنظیم) پر بالکل صادق آتی ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ شہنشائیت اور ایک مخصوص طبقے کی حکومت کے فوائد بھی ہیں اور نقصانات بھی ہیں۔ حکومت کی ان دونوں اقسام کی سب سے بڑی اور اہم خامی یہ ہے کہ جلد یا بدیر یہ حکومتیں عوام کی خواہشات اور ضروریات سے اس قدر زیادہ لاتعلق ہو جاتی ہیں کہ انقلاب رونما ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس جب جمہوریت بخوبی طور پر مستحکم ہو جاتی ہے تو پھر اس قسم کا عدم استحکام پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ خانہ جنگی ایک بہت ہی بے ہودہ اور گمبھیر برائی ہے، اس لئے جو بھی حکومت اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، مقبولیت کے درجے پر فائز نہیں رہ سکتی۔ اگر خانہ جنگی واقع ہو بھی جاتی ہے تو پھر اس کے وقوع پذیر ہونے کا امکان وہاں نہیں ہوتا جہاں اس کے باعث سابقہ حکمرانوں کو فتح حاصل ہوتی۔ اگر دیگر حالات جوں کے توں رہتے ہیں اور حکومت اکثریت کے ہاتھ میں ہوتی ہے تو پھر ایک اقلیت کی نمائندہ حکومت کی نسبت، اس حکومت کے خانہ جنگی میں فتح یاب ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اگر ایسے ہی حالات جاری رہیں، تو یہ صورتِ حال جمہوریت کے قیام کے لئے ایک وجہ اور دلیل ثابت ہوتے ہیں لیکن حالیہ طور پر رونما اور منعقد ہونے والے واقعات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ اصول بے شمار شرائط سے مشروط ہے۔

ایک حکومت عام طور پر اس وقت ''جمہوری'' کہلاتی ہے جب عوام کی ایک قابلِ ذکر اکثریت اور تعداد سیاسی اقتدار میں شریک ہو۔ انتہائی قدیم یونانی جمہوریتوں میں عورتیں اور غلام شامل نہیں ہوتے تھے اور عورت کی رائے دہندگی کے حق سے پہلے بھی امریکی خود کو جمہوری سمجھتے تھے۔ جب ایک مخصوص طبقے کی حکومت میں سیاسی قوت و طاقت بڑھتی جاتی ہے تو حکومت کی یہ قسم جمہوریت کے مفہوم اور تصور سے زیادہ نزدیکِ ہوتی جاتی ہے۔ مزید برآں، ایک مخصوص طبقے کی حکومت کی نمایاں خصوصیات اس وقت زیادہ ابھر کر سامنے آتی ہیں جب اس میں جمہوریت کے

عنصر کی نمایاں خصوصیات اس وقت زیادہ ابھر کر سامنے آتی ہیں جب اس میں جمہوریت کے عنصر کی موجودگی کی شرح کم سے کم ہو جاتی ہے۔

تقریباً تمام تنظیموں اور اداروں کے لئے، لیکن خاص طور پر ریاستوں کے لئے، حکومت کی ''قسم'' کا مسئلہ دو پہلوؤں پر مشتمل ہوتا ہے۔ حکومت کے نقطہ نظر سے مطابق مسئلہ یہ ہے کہ عوام کی خاموش حمایت کیسے حاصل کی جائے، اور عوام کے نقطہ نظر کے لحاظ سے مسئلہ یہ ہے کہ حکومت کو نہ صرف اپنے مفاد کی خاطر بلکہ عوام کے مفاد کی خاطر جواب دہی اور احتساب پر مبنی رویہ اور طرز عمل اپنانا چاہئے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک مسئلہ بھی مکمل طور پر حل ہو جاتا ہے، تو پھر کوئی دوسرا مسئلہ سر نہیں اٹھاتا، لیکن اگر ان میں سے کوئی ایک مسئلہ بھی حل نہیں ہوتا تو پھر انقلاب برپا ہوتا ہے۔ لیکن عمومی طور پر ایک مصالحانہ حل تلاش کر لیا جاتا ہے۔ حکومت کی ظالمانہ قوت کے علاوہ حکومت کے حق میں دیگر اہم عناصر میں روایات، مذہب، غیر ملکی دشمنوں کا خوف اور اکثر افراد کی طرف سے ایک راہنما یا قائد کی پیروی کی فطری خواہش شامل ہیں۔ عوام کے تحفظ کے لئے ابھی تک صرف ایک طریقہ دریافت ہوا ہے جو کسی بھی حد تک موثر ہے، اس طریقے کو جمہوریت کا نام دیا گیا ہے۔

حکومت کی ایک قسم کی حیثیت سے جمہوریت کی بھی کچھ حدود ہیں جو کہ بہت ضروری ہیں، اور کچھ دوسرے افراد کے لئے اصولی طور پر یہ ناگزیر نہیں ہیں۔ ضروری اور لازمی حدود دو بڑے ذرائع کے ذریعے وجود میں آتی ہیں۔ یعنی کچھ فیصلے تیز رفتاری کے متقاضی ہوتے ہیں اور بعض فیصلوں کے لئے ماہرانہ علم و فضل درکار ہوتا ہے۔ جب 1931ء میں برطانیہ نے سونے کا معیار ترک کر دیا تو اس میں دونوں عناصر ملوث اور شامل تھے۔ اس وقت یہ امر قطعی ضروری تھا کہ اس فیصلے پر نہایت تیزی سے اور فوراً ہی عمل کیا جائے، اور اس میں مسئلہ یہ تھا کہ افراد کی اکثریت اس فیصلے کو سمجھ پائے۔ اس لئے جمہوریت اپنے سابقہ تجربے کے ذریعے ہی اپنی رائے اور موقف کا اظہار کر سکتی تھی۔ اگرچہ تکنیکی اعتبار سے کرنسی کی نسبت جنگ کی اہمیت کم ہے، لیکن اس کی ضرورت زیادہ ہے۔ اس ضمن میں پارلیمان یا کانگرس سے مشاورت ممکن تو ہے (حالانکہ اصولی لحاظ سے یہ بھی ڈھونگ کی ایک قسم ہے، کیونکہ درحقیقت، اس معاملے اور مسئلے کے متعلق پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہوگا، لیکن ضروری نہیں کہ اس کا اظہار بھی ہوا ہو) لیکن عوام سے مشاورت ناممکن ہے۔

ان لازمی خصوصیات اور حدود کی بدولت، عوام کے لئے ضروری ہے کہ وہ اکثر اہم معاملات

کے متعلق فیصلوں کا اختیار حکومت کو تفویض کر دیں۔ جمہوریت اس وقت کامیاب ہوتی ہے جب حکومت عوام کی رائے اور موقف کا احترام کرتی ہے۔ لانگ پارلیمان (Long Parliament) نے یہ فیصلہ دیا کہ اسے اس کی اپنی رضامندی کے بغیر تحلیل نہیں کیا جا سکتا، تو پھر آیندہ پارلیمانوں کو اس طرح کا فیصلہ کرنے سے کس نے روکا؟ اس کا جواب نہ تو سادہ ہے اور نہ ہی قطعی ہے۔ پہلے تو یہ کہ انقلابی حالات کی غیر موجودگی میں، تحلیل ہونے والی پارلیمان کے ارکان کو یقین دلایا گیا کہ اگر ان کا تعلق شکست خوردہ جماعت سے بھی ہے تو انہیں قطعی پریشان نہیں کیا جائے گا اور وہ ایک خوشگوار اور پُر لطف زندگی بسر کر سکیں گے۔ دوبارہ منتخب ہونے کی صورت میں اگر وہ پہلے کی مانند حکومت کی خوشنودی حاصل نہیں کر پاتے تو پھر بھی انہیں اپنے مخالفین پر کھلے عام تنقید کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ دوبارہ اقتدار میں آ جاتے۔ اگر اس کے برعکس، عوام انہیں آئینی طریقوں کے ذریعے اقتدار سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو جاتے، تو پھر وہ انقلابی صورت حال پیدا کر دیتے جس کے باعث ان کا مال و متاع اور شاید ان کی زندگیاں بھی خطرے میں مبتلا ہو جاتیں۔ شہنشاہ انگلستان و آئرلینڈ چارلس اول اور اس کے سیاسی مخالف سٹیفورڈ کے زندگی کے حالات ہی بتاتے ہیں کہ جلد بازی اور بے احتیاطی سے کام نہیں لینا چاہئے۔

اگر ایک انقلابی صورت حال پہلے ہی سے موجود ہوتی تو یہ سب کچھ مختلف ہوتا۔ فرض کریں کہ قدامت پرست پارلیمان کو بجا طور پر یہ خدشہ تھا کہ آئندہ انتخابات میں کمیونسٹوں کو اکثریت حاصل ہو جائے گی جو بغیر کسی معاوضے کے مال و اسباب اور جائیدادیں ضبط کر لیتے۔ اس قسم کی صورت حال میں، اقتدار میں موجود جماعت لانگ پارلیمان (Long Parliament) کی پیروی کرتی اور اپنے مستقبل اور مسلسل زندگی کے متعلق فیصلہ دے دیتی۔ پارلیمان کے اس قدم کو جمہوریت کے احترام کے باعث بمشکل روکا جا سکتا، لیکن پارلیمان کو اس قدم سے صرف ایک طریقے کے ذریعے ہی روکا جا سکتا تھا کہ اگر مسلح افواج کی وفاداری مشکوک ہوتی۔

اس تمام بحث سے سبق یہ حاصل ہوتا ہے کہ چونکہ جمہوریت اپنے اقتدار اور قوت و طاقت کو منتخب نمائندوں کو تفویض کرنے پر مجبور ہوتی ہے، اسے اطمینان بھی حاصل نہیں ہوتا اور اسے خدشہ لاحق رہتا ہے کہ انقلابی صورت حال میں بھی اس کے نمائندے اپنی خواہشات و ضروریات پیش کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔ بآسانی قابل تصور حالات میں پارلیمان کی خواہشات کو قوم کی

اکثریت کی خواہشات کے ذریعے مخالفت کی جا سکتی ہے۔ اس قسم کے حالات میں اگر پارلیمان طاقت کی برتری پر انحصار کر سکتی ہے تو پھر یہ پارلیمان بے دھڑک ہو کر اکثریت کی رائے اور موقف کو بھی نظر انداز کر سکتی ہے۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جمہوریت کی نسبت، کوئی بھی اور اچھا اور بہترین نظام حکومت موجود ہے۔ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسے مسائل و معاملات بھی ہوتے ہیں جن کے متعلق افراد لڑتے ہیں، اور جب وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو کسی بھی قسم کی حکومت خانہ جنگی روک نہیں سکتی۔ ایک حکومت کا سب سے اہم مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ مسائل و معاملات کو اس قدر زیادہ شدت اختیار نہ کرنے دے کہ خانہ جنگی شروع ہو جائے، اور صرف اسی بات کو مد نظر رکھتے ہوئے جمہوریت جب یہ مستحکم ہو جاتی ہے، شاید کسی بھی دیگر معلوم اور موجود نظام حکومت کی نسبت قابلِ ترجیح ہوتی ہے۔

ایک نظام حکومت کی حیثیت سے جمہوریت کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ یہ ہمیشہ مصالحت اور سودا باری کا تقاضا کرتی ہے۔ اس نظام حکومت کے تحت ایک شکست خوردہ جماعت کو یہ قطعی نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ کوئی مسلمہ اصول نہیں ہے کہ اسے حوصلہ ہار دینا چاہئے، دوسری طرف اکثریتی جماعت کو بھی کسی معاملے پر شکست خوردہ جماعت پر اس قدر زیادہ دباؤ نہیں ڈالنا چاہئے کہ وہ انقلاب کی طرف نائل ہو جائے۔ یہ صورت حال ایک ایسے معمول کی متقاضی ہے جہاں قانون کا احترام کیا جائے اور یہ یقین کرنے کی عادت اپنا لی جائے کہ اپنے علاوہ دوسرے افراد کی رائے اور موقف بھی کسی مکاری یا عیاری کا ثبوت نہیں ہے۔ اس سے بھی زیادہ ضروری امر یہ ہے کہ ملک میں شدید خوف و ہراس کی کیفیت و فضا نہیں ہونی چاہئے، کیونکہ جب اس قسم کی فضا قائم ہو جاتی ہے تو پھر عوام ایک قائد اور راہنما کی تلاش میں لگ جاتے ہیں، اور جب انہیں ایک راہنما اور قائد میسر آ جاتا ہے تو وہ اس کی اطاعت گزاری کرتے ہیں جس کے نتیجے میں اس راہنما یا قائد کے آمر بننے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ ممکنہ طور پر آمر بن بھی جاتا ہے۔ اگر اس قسم کے حالات ہوں تو پھر اس صورت میں جمہوریت ایسا نظام حکومت ہے جو ایک مستحکم حکومت کے قیام کے لئے اہل ثابت ہو سکتا ہے۔ امریکہ، انگلستان، نوآبادیات، سکنڈے نیویا اور سوئٹزرلینڈ میں یہ نظام حکومت بغیر کسی خطرے کے قائم اور مروج ہے، اور فرانس میں یہ زیادہ سے زیادہ مستحکم صورت اختیار کر رہا ہے۔ نظامِ حکومت کو استحکام بخشنے کے علاوہ جمہوریت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ

اس نظامِ حکومت کے تحت حکمرانوں کی خواہش ہونے یا نہ ہونے کے باوجود ایک مکمل شہنشائیت، مخصوص طبقہ امراء کی حکومت یا آمریت کی نسبت عوام کی فلاح و بہبود پر زیادہ توجہ مرکوز کرنے کا موقع فراہم ہو جاتا ہے۔

آج کے اس غیر معمولی ترقی یافتہ اور جدید دور میں، بلاشبہ اس قسم کے کسی دوسرے علاقے پر موجود کسی دیگر قسم کے نظامِ حکومت کی نسبت جمہوریت کے جملہ نقصانات معلوم نہیں ہوتے بلکہ صرف اس علاقے میں موجود آبادی کی اکثریت کے باعث، جمہوریت بعض نقصانات کی حامل ہے۔ قدیم زمانے میں جب نمائندگی پر مبنی نظام موجود نہیں تھا تو شہری تجارتی مرکز میں جمع ہو جاتے اور متعلقہ معاملے یا مسئلے کے بارے اپنی رائے کا اظہار کرتے۔ جب تک ایک ریاست، ایک شہر تک محدود رہی، تو اس وقت ہر شہری کو اپنی قوت اور ذمہ داری کا حقیقی احساس تھا، اور اس وقت زیادہ سے زیادہ مسائل ایسے تھے کہ وہ اپنے تجربات اور علم کی بنیاد پر انہیں سمجھنے پر قادر تھے لیکن ایک منتخب مقننہ کی غیر موجودگی میں جمہوریت ایک وسیع علاقے تک پھیل نہ سکی۔ جب اٹلی کے دیگر حصوں کے رہنے والوں کو رومی شہریت عطا کی گئی تو یہ نئے شہری عملی طور پر کسی بھی قسم کی سیاسی قوت واقتدار میں حصہ دار نہ بن سکے کیونکہ سیاسی قوت واقتدار میں وہی شہری حصہ لے سکتے تھے جو واقعی روم کے شہری تھے۔ عہد جدید میں نمائندوں کے انتخاب کے ذریعے اس جغرافیائی مشکل پر قابو پا لیا گیا۔ اور ابھی ماضی قریب تک جن نمائندوں کا ایک دفعہ انتخاب ہو جاتا تھا، انہیں قابلِ قدر اختیار و قوت حاصل ہو جاتی تھی کیونکہ دار الحکومت سے دور رہنے والے افراد کو علم نہیں ہوتا تھا کہ دار الحکومت کے قریب کیا ہو رہا ہے، یا انہیں حالات کے متعلق کوئی مناسب اور معقول تفصیل بھی مہیا نہیں ہوتی تھی کہ وہ موثر طور پر اپنی رائے کا اظہار کر سکیں۔ بہر حال، اب ریڈیائی نشریات، تیز رفتار ذرائع نقل و حمل اور اخبارات کی بدولت بڑے بڑے ممالک بہت زیادہ حد تک عہد قدیم کے ریاستی شہروں کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، اب مرکز میں مختلف افراد اور دور افتادہ مقامات پر موجود رائے دہندگان کے درمیان ذاتی ربط اور تعلق ممکن ہو گیا ہے، عوام اپنے قائدین پر دباؤ ڈال سکتے ہیں اور اسی طرح قائدین بھی اپنے لوگوں پر اس حد تک اثر انداز ہو سکتے ہیں جو اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں میں ممکن نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ نمائندوں کی اہمیت کم ہو گئی اور راہنما یا قائد کی اہمیت و وقعت میں اضافہ ہو گیا۔ ایک رائے دہندگان اور حکومت کے درمیان واسطے کی

حیثیت سے پارلیمان کی مزید اہمیت نہ رہی۔ منظم تشہیری مہم کے لئے استعمال ہونے والے مشکوک طرائق جو ماضی میں صرف انتخابات کے ادوار ہی تک محدود تھے، اب ہر دور اور ہر زمانے میں استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ اپنے ہیجان خیز سیاستدانوں، ظالم حکمرانوں، ذاتی محافظوں اور جلاوطن افراد کے ساتھ یونان کی شہری ریاست، اس لئے دوبارہ مستحکم ہوگئی کیونکہ اپنی ریاست کی عزت و شہرت کو منظم طور پر پھیلانے کی مہم کے حوالے سے اس کے پاس پھر متعدد طریقے دستیاب تھے۔ ماسوائے اس وقت جب ایک رائے دہندہ اپنے راہنما اور قائد کے لئے جوش و جذبہ اور ولولہ محسوس کرتا ہے، تو پھر ایک بڑی جمہوریت میں ایک رائے دہندہ کو قوت و اختیار کے بارے اس قدر تھوڑا احساس وادراک ہوتا ہے تو وہ اکثر اپنی رائے کے اظہار کے عمل کو قابلِ اہمیت نہیں سمجھتا۔ اگر وہ اپنی جماعت کی شہرت کے لئے زیادہ شوق و ذوق سے کام نہیں کرتا، تو پھر وہ مختلف الوسیع قوتیں، جو حکومت واقتدار میں ہوں گی اور جن میں وہ خود کو شریک سمجھتا ہے، بظاہر مکمل طور پر نظر انداز ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ایک اصول کی حیثیت سے عملی طور پر وہ صرف یہ کر سکتا ہے کہ وہ ان دونوں افراد میں سے کسی ایک کی حمایت کرے جن کے منصوبے انہیں پسند نہ ہوں، اور ان میں بہت تھوڑا فرق ہو، اور جن کے متعلق اسے یہ علم ہو کہ وہ منتخب ہونے کے بعد اپنے منصوبوں سے بے دھڑک بھٹک سکتے ہیں اور انہیں ترک کر سکتے ہیں۔ بصورت دیگر، اگر ایک ایسا راہنما یا قائد ہے جس کی وہ ذوق وشوق اور سرگرم طریقے سے تعریف کرتا ہے، تو اس میں وہ نفسیات موجود ہے جس کو ہم نے شہنشائیت کے ضمن میں پیشِ نظر رکھا: اور اس طرح ایک بادشاہ، ایک قبیلے یا فرقے یا پھر اس کے فعال حمایتیوں کے درمیان اختلاف ہو جاتا ہے۔ ہر ماہر سیاسی احتجاج کنندہ یا منتظم، ایک فرد کے لئے خود ہی وفاداری پیدا کرنے کے لئے جوش وجذبہ پیدا کرتا ہے۔ اگر یہ فرد، ایک عظیم راہنما ہو، تو پھر نتیجہ فردِ واحد کی حکومت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر یہ فرد عظیم راہنما یا قائد نہ ہو تو پھر جس جماعت کے ذریعے یہ فرد منتخب ہوا ہوتا ہے، وہ جماعت حقیقی اقتدار و قوت حاصل کر لیتی ہے۔

یہ جمہوریت کی اصل روح نہیں ہے۔ جب حکومتی علاقے بہت ہی وسیع ہوں تو پھر جمہوریت کی بقاء کا سوال بہت ہی مشکل معلوم ہوتا ہے جس کے متعلق میں اس باب کے آخر میں ذکر کروں گا۔

بہرحال، ہمارے زیر بحث، سیاست میں حکومت کی اقسام ہیں۔ لیکن جو اقسام، معاشی تنظیموں اور اداروں میں موجود ہوتی ہیں، وہ اس قدر اہم ہیں کہ ان پر علیحدہ طور پر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

اس مرحلے کا آغاز کرنے کے لئے اگر ہم ایک صنعتی ادارے پر بطور مثال غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس میں ایسی ممتاز خصوصیات موجود ہیں جو عہد قدیم میں شہریوں اور غلاموں کے درمیان موجود تھیں۔ شہری وہ ہیں جنہوں نے اس صنعتی ادارے میں سرمایہ کاری کی ہے، جبکہ غلام وہ ہیں جو اس صنعتی ادارے کے ملازمین ہیں۔ میں اس مثال پر زیادہ زور نہیں دینا چاہتا۔ اس حقیقت کے تناظر میں ایک ملازم، ایک غلام سے اس طرح مختلف ہے کہ اگر اس میں اہلیت و صلاحیت ہے تو وہ اپنی ملازمت اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کرسکتا ہے اور اسے یہ بھی حق حاصل ہے کہ بطور ملازم اوقاتِ کار کے بعد وہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق اپنا وقت صرف کرسکتا ہے۔ اس مرحلے پر جو میں مثال پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ حکومت سے تعلق کے ضمن میں ہے۔ ایک غاصبانہ حکومت، مخصوص طبقے کی حکومت اور جمہوری حکومت کے درمیان آزاد افراد اور غلاموں کے حوالے سے جو فرق موجود تھا، وہ ایک جیسا ہی تھا۔ لیکن ایک سرمایہ دارانہ صنعتی ادارے میں قوت و اختیار، سرمایہ کاروں، طبقہ امراء یا جمہوریت پسندوں کے درمیان منقسم ہوسکتا ہے لیکن اس سرمایہ دارانہ صنعتی ادارے کے ملازمین کو، جب تک وہ سرمایہ کار نہ ہوں، اس ادارے میں شرکت کا کوئی حق نہیں حاصل ہوتا اور جس طرح عہد قدیم میں غلاموں کو تصرف کا بہت تھوڑا حق حاصل تھا، اسی طرح ان ملازمین کو بھی یہاں بہت تھوڑا تصرف حاصل ہوتا ہے۔

کاروباری اور تجارتی ادارے، ایک مخصوص طبقے خاص طور پر دولت مند افراد کی مرضی، خواہش، آئین و اقتدار کی مختلف صورتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ فی الوقت، میں اس حقیقت کے متعلق غور نہیں کر رہا کہ ملازمین، انتظامیہ میں شامل نہیں ہوتے بلکہ میں تو اس وقت صرف حصہ داروں (Share holders) کے متعلق غور کر رہا ہوں۔ اس موضوع کے متعلق مجھے بہت کچھ بخوبی اور بہترین انداز میں ایک ایسی کتاب کے ذریعے معلوم ہو چکا ہے اور جس کے متعلق میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں، اس کتاب کا نام ''The Modern Corporation and Private Property'' ہے۔ اپنی کتاب کے باب بعنوان ''The Evolution of Control'' میں

یہ بتایا گیا ہے کہ کیسے ایک مخصوص طبقے نے جس کا ملکیت میں اکثر بہت تھوڑا حصہ ہوتا ہے، کس طرح سرمائے کی ایک بہت بڑی تعداد پر مشتمل حکومت کا اقتدار حاصل کر لیا۔ دیگر ارکان کی قائمقام حیثیت سے متعلق مختلف طریقوں کے ذریعے انتظامیہ، عملی طور پر اپنے جانشینوں کو احکام جاری کر سکتی ہے۔ جب ایک ادارے یا تنظیم کی ملکیت قابلِ ذکر حد تک منقسم ہوتی ہے، تو پھر انتظامیہ ملکیت میں اپنے برائے نام حصے اور شرکت کے باوجود ایک ایسے ادارے کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے جو خود کو مسلسل اور متواتر طور پر قائم و دائم رکھ سکتی ہے۔ اس صورتِ حال کے متعلق موجودہ مصنف جو نظریہ اخذ اور دریافت کرنے میں کامیاب ہوا ہے، وہ ایک ایسا ادارہ یا تنظیم ہے جو کیتھولک کلیسا (مذہب) پر برتری اور غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ پاپائے اعظم، آرچ بشپوں کو منتخب کرتا ہے اور پھر آرچ بشپوں کا ادارہ آئندہ پاپائے اعظم کو منتخب کرتا ہے۔ اس قسم کی حکومت کچھ موجودہ عظیم اور بڑے تجارتی اور کاروباری میں پائی جاتی ہے، مثلاً امریکن ٹیلیفون اینڈ ٹیلیگراف کمپنی اور یونائیٹڈ سٹیٹس سٹیل کارپوریشن جن کے اثاثے یکم جنوری 1930ء کو علی الترتیب چار بلین اور دو بلین ہیں۔ موخرالذکر ادارے میں مجلس منتظمین (Board of Directors) کے پاس مجموعی طور پر حصص کا صرف 1.4 فیصد حصہ ہے لیکن معاشی قوت تمام کی تمام ان کے پاس ہے۔

کسی بھی سیاسی ادارے یا جماعت کی نسبت، ایک کاروباری ادارے کی تنظیم کی پیچیدگی اور جامعیت کافی حد تک زیادہ ہوتی ہے۔ مجلس منتظمین، حصہ داروں، اعلیٰ اختیاراتی عملے اور عام ملازمین کے فرائض اور ذمہ داریاں الگ الگ اور مختلف ہیں۔ حکومت و قوت عام طور پر ایک مخصوص طبقے کے ہاتھ میں ہوتی ہے جن کی اکائیاں حصہ دار نہیں بلکہ حصص ہوتے ہیں، اور منتظمین (ڈائریکٹر) ان کے منتخب نمائندے ہوتے ہیں۔ عملی طور پر، عام طور پر منتظمین کے پاس ان حصہ داروں کی نسبت زیادہ قوت و اختیار ہوتا ہے جن کا تعلق ایک انفرادی مخصوص طبقے کے مقابلے میں سیاسی مخصوص طبقے کی حکومت سے ہوتا ہے۔ اسی طرح، جہاں مزدوروں کی سودا کاری تنظیم بہت اچھی طرح منظم ہوتی ہے، وہاں اپنی ملازمت کی شرائط کے ضمن میں ملازمین کی رائے قابلِ قدر اہمیت رکھتی ہے۔ ایک سرمایہ دارانہ تجارتی اور کاروباری ادارے میں عجیب طرح کی دہری مقصدیت پائی جاتی ہے۔ ایک طرف تو انہیں عوام الناس کو اشیاء یا خدمات مہیا کرنے کے لئے خود کو برقرار اور زندہ رکھنا پڑتا ہے اور دوسری طرف انہیں اپنے حصہ داروں کے لئے منافع بھی مہیا

کرنا پڑتا ہے۔ جہاں تک سیاسی اداروں اور تنظیموں کا تعلق ہے، سیاست دانوں کے متعلق یہ فرض کیا جاتا ہے کہ نہ صرف ان کا مقصد و منشاء عوام الناس کی فلاح و بہبود ہے بلکہ ان کا مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دولت کمائیں، یہ صورت حال ایک سیاسی جماعت کی ظالمانہ حکومت کے تحت بھی اسی طرح واقع ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کاروبار کی نسبت سیاست میں مکاری اور عیاری کا عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن جمہوریت اور سوشلسٹ تنقید کے مشترکہ اثر ورسوخ کے تحت بہت سے صنعتی مہاسیٹھوں نے سیاسی مکاری وعیاری کا فن اور ہنر سیکھ لیا ہے، اور انہوں نے اس امر میں بھی مہارت حاصل کر لی ہے کہ کس طرح یہ ظاہر کرنا ہے کہ ان کے اپنے روشن اور بہترین مستقبل کے لئے عوامی فلاح و بہبود ہی ان کا مقصد ہے۔ سیاست اور معیشت میں اشتراک اور اتفاق پر مبنی جدید رجحان ومیلان کی یہ ایک دوسری مثال ہے۔

اس مرحلے پر ان طریقوں کے متعلق لازمی طور پر کچھ نہ کچھ ذکر کرنا چاہئے کہ جن کے ذریعے ایک مخصوص ادارے میں حکومت کی اقسام میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا امر ہے جس کے متعلق ہمیں تاریخ سے کوئی راہنمائی حاصل نہیں ہوتی۔ ہم نے یہ دیکھا کہ مصر اور بابل میں قطعی شہنشائیت اس وقت تک بھرپور نشوونما پا چکی تھی جب تاریخ عالم میں منعقد ہونے والے واقعات کی باقاعدہ موجودگی کا آغاز ہوتا ہے، اور پھر ماہرین بشریات بھی یہ ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ یہ شہنشائیت ان سرداروں کے اختیار کے باعث وجود میں آئی جو مجلس بزرگان (Council of Elders) کے رکن تھے۔

چین کے علاوہ ایشیا بھر میں، یورپی اثر ورسوخ کے سوا، ایک مکمل شہنشائیت نے ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا کہ اس نے کوئی دوسری قسم کا نظامِ حکومت اپنایا۔ اس کے برعکس، جہاں تک معلوم تاریخ عالم کا تعلق ہے، یورپ میں شہنشائیت زیادہ عرصے تک کبھی بھی مستحکم نہیں رہی۔ ازمنہ وسطیٰ میں بادشاہوں کا اقتدار وقوت ایک تو جاگیردارانہ اشرافیہ اور دوسرے زیادہ اہم تجارتی شہروں کی شہری خودمختاری کے باعث محدود تھی۔ نشاۃ ثانیہ کے دور کے بعد، یورپ بھر میں بادشاہوں کی قوت واقتدار میں اضافہ ہوگیا، لیکن پہلے انگلستان، پھر فرانس اور پھر بقایا مغربی یورپ میں متوسط طبقے کے پیدا ہونے کے باعث یہ اضافہ ختم ہوگیا۔ جب تک 1918 کے آغاز میں بالشویکوں نے آئینی اسمبلی کو برخواست نہیں کیا تھا، ممکن ہے کہ یہ سمجھا جاتا ہو کہ مہذب اور متمدن دنیا میں

پارلیمانی جمہوریت کی موجودگی اور برقراری ناگزیر ہے۔

بہرحال، جمہوریت کی عدم موجودگی پر مبنی ادوار، کوئی نئی بات نہ تھی۔ یہ ادوار بے شمار یونانی شہری ریاستوں میں پائے گئے۔ مزید برآں، جمہوریت کی عدم موجودگی پر مشتمل ادوار روم میں بھی اس وقت بدرجہ اتم موجود رہے جب یہ سلطنت قائم ہوئی، پھر قدیم اٹلی کی تجارتی عوامی جمہوریتوں میں بھی یہ ادوار موجود تھے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی بھی ایسا عمومی اصول دریافت کر لیا جائے کہ جس کے ذریعے جمہوریت کی کسی بھی قسم کی طرف مختلف مراجعتوں کا تعین کیا جا سکے؟

ماضی میں جمہوریت کے خلاف دو عظیم زور آور عناصر، دولت اور جنگ رہے ہیں۔ ان دونوں عناصر کی وضاحت کے لئے ہم میڈیسی (Medici) اور نپولین (Napoleon) کو بطور مثال پیش کر سکتے ہیں۔ وہ افراد جن کی دولت تجارت کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے۔ اصولی طور پر، ان افراد سے کم تیز و تند اور زیادہ مصالحانہ ہوتے ہیں جن کی قوت و طاقت زمین کی ملکیت کی مرہونِ منت ہوتی ہے، اس لئے وہ اپنے لئے طاقت و اقتدار کا راستہ تلاش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں، اور افراد کی نسبت جن کی حیثیت محض موروثی اور روایتی ہوتی ہے، حکومت کرنے کے زیادہ ماہر ہوتے ہیں کہ ان کے خلاف متشدد ناراضگی اور غیض و غضب پیدا نہیں ہوتا۔ تجارت کے ذریعے آمدن اور مفادات مثال کے طور پر وینس (Venic) یا پھر (Hanseatic League) کے شہروں میں غیر ملکی کی بدولت حاصل کئے گئے اور اس طرح داخلی طور پر نامقبول بھی نہیں ہو سکے، مثلاً مصنوعات تیار کرنے والے کاروباری فرد کے ساتھ منسلک وہ شخص جو انتہائی سخت جان اور کم معاوضہ پر مزدور بھرتی کرنے کے ذریعے آمدن و مفاد حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا ایک مخصوص طبقے کی حکومت، اس علاقے کے لئے سب سے زیادہ فطری اور مستحکم قسم کی حکومت ہوتی ہے جہاں تجارتی سرگرمیاں پہلے سے ہی موجود اور جاری ہوتی ہیں۔ اور یہ صورت حال شہنشاہیت کے دور میں بہت آسانی سے جنم لیتی ہے بشرطیکہ ایک خاندان دوسرے سے کہیں زیادہ امیر اور دولت مند ہو۔

ایک نہایت ہی مختلف متشدد نظریے اور رویے کے ذریعے جنگ وجود میں آتی ہے۔ جنگ کے خوف کے باعث افراد اپنے لئے ایک قائد کی تلاش میں ہوتے ہیں اور ایک کامیاب قائد اپنے پیروکاروں میں ایک ایسا جذبہ و شوق پیدا کر دیتا ہے جو جنگ کے خلاف ہوتا ہے۔ چونکہ اس وقت فتح سامنے واضح طور پر نظر آتی ہے، ایک چیز حقیقی اہمیت کی حامل ہوتی ہے کہ ایک

کامیاب قائد اپنے ملک اور عوام کو بآسانی یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ اگر اس پر اعتماد کیا جائے تو وہ اس ملک کو عظیم اور زبردست طاقت بنا سکتا ہے۔ لہٰذا جب تک یہ بحران جاری رہتا ہے، اسے ناگزیر اور لازمی سمجھا جاتا ہے اور جب یہ بحران ختم ہو جاتا ہے تو پھر اس کو ہٹانا بہت مشکل ہو سکتا ہے۔

اگرچہ جمہوریت کے خلاف جدید تحریکیں جنگ پر مبنی رویے اور ذہنیت پر مبنی ہیں، لیکن ان تحریکوں کو نپولین پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ اگر زیادہ واضح اور وسیع تناظر میں کہا جائے تو یہ کہ جرمن اور اٹلی کی جمہوریتوں کو اس لئے زوال نہیں آیا کہ اکثریت جمہوریت سے اُکتا چکی تھی بلکہ یہاں جمہوریتیں اس لئے زوال پذیر ہوئیں کہ مسلح افواج کی ایک بڑی تعداد عددی اکثریت کے ساتھ نہیں تھی۔ یہ صورت حال عجیب محسوس ہو سکتی ہے کہ ایک غیر فوجی (شہری) حکومت سپہ سالار اعظم سے زیادہ طاقتور ہونی چاہئے۔ حالانکہ یہ ایک ایسی صورت حال اور معاملہ ہوتا ہے کہ جب جمہوریت قوم کے معمولات کے باعث مضبوطی سے جڑ پکڑ لیتی ہے۔ ایک سپہ سالار اعظم کو مقرر کرتے ہوئے لنکن لکھتا ہے: ''وہ مجھے یہ بتاتے ہیں کہ تمہارا مقصد آمریت ہے۔ کامیابیاں اور فتوحات حاصل کرنے کے باعث ہی یہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ میں ان کامیابیوں اور فتوحات کے لئے تمہاری طرف دیکھتا ہوں اور آمریت کا خطرہ مول لیتا ہوں۔'' وہ نہایت آسانی سے یہ کام کر سکتا تھا کیونکہ کسی بھی امریکی فوج نے شہری حکومت پر حملے کے لئے سپہ سالار کا حکم نہیں مانا ہوگا۔ ستارہویں صدی میں کرومویل کے فوجی ''لانگ پارلیمنٹ'' (Long Parliament) کو برخواست کرنے کے لئے اس کا حکم ماننے کے لئے تیار تھے۔ انیسویں صدی میں اگر ڈیوک آف ولنگٹن (Duke of Wellington) نے اسی قسم کا کوئی منصوبہ بنایا ہوتا، کوئی بھی فرد اس کا کہنا ماننے کے لئے تیار نہ ہوتا۔

ابتدا میں جمہوریت، سابق حکمرانوں کے خلاف ناراضی اور نفرت کے باعث پھلتی پھولتی ہے، لیکن جب تک اس کی ابتدائی اور نئی شکل موجود رہتی ہے، اسے استحکام حاصل نہیں ہوتا۔ جو افراد خود کو سابقہ شہنشائیت یا ایک مخصوص طبقے کی حکومت کے دشمن کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، وہ شہنشائیت یا ایک مخصوص طبقے کی حکومت بحال کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ نپولین اور ہٹلر اس وقت عوامی حمایت حاصل کر سکتے تھے جب بوربونز (Bourbons) (فرانس پر حکومت کرنے

والا شاہی خاندان) اور ہوہینز ولرن (Hohenzollern) (جرمن شاہی خاندان) عوامی حمایت حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ عوامی حمایت صرف وہاں ہی حاصل ہو سکتی ہے جہاں جمہوریت اس قدر زیادہ دیر تک قائم رہی ہو کہ اس کا استحکام ایک روایتی شکل اختیار کر گیا ہو۔ اپنے اپنے ممالک میں، کرومویل، نپولین اور ہٹلر جمہوریت کے ابتدائی ایام میں سامنے آئے۔ پہلے دو افراد یعنی کرومویل اور نپولین کے معاملے کے پیش نظر، نپولین کا معاملہ بھی حیران کن ثابت نہیں ہونا چاہئے اور نہ ہی ایسی کوئی وجہ موجود ہے کہ جس کے باعث یہ سمجھا جائے کہ یہ شخص اپنے پیش رووں سے زیادہ ثابت قدم اور مستقل تھا۔

بہر حال، اس امر پر شک کی کچھ معقول اور سنجیدہ وجوہات موجود ہیں، کہ کیا مستقبل قریب میں جمہوریت اپنی وہ شہرت، مقبولیت اور ساکھ حاصل کر سکتی ہے جو اسے انیسویں صدی کے آخری نصف حصے میں حاصل تھی۔ ہم مسلسل یہ کہتے رہے ہیں کہ جمہوریت میں استحکام صرف اس صورت میں پیدا ہو سکتا ہے جب یہ لازمی طور پر روایتی شکل اختیار کر لے۔ مشرقی یورپ اور ایشیا میں مناسب حد تک استحکام حاصل کرنے کے لئے کیا اسے یہ موقع حاصل ہونا چاہئے کہ یہ روایتی صورت اختیار کرنے کا عمل شروع کر دے؟

ایک حکومت ہمیشہ ہی اپنے دور میں فوجی طور طریقوں کے باعث بہت زیادہ حد تک متاثر ہوتی رہی ہے۔ ان دنوں میں، جب روم جمہوریت کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا تو رومی افواج میں رومی شہری شامل تھے، اور یہ افواج ان پیشہ وارانہ اور باقاعدہ افواج کا متبادل تھیں جنہوں نے یہ سلطنت قائم کی تھی۔ جاگیر دارانہ طبقہ اشرافیہ کی طاقت وقوت کا انحصار قلعوں کی مضبوطی پر تھا جس کا اختتام توپ خانے کی انتہا کے ساتھ ہی ہو گیا۔ فرانسیسی انقلاب کی بڑی لیکن کم و بیش غیر تربیت یافتہ افواج نے اپنی مخالف چھوٹی چھوٹی تربیت یافتہ افواج کو شکست دینے کے ذریعے اپنے مقصد کے لئے معقول اور مناسب جذبہ و جوش کی اہمیت کو ظاہر کر دیا اور اس طرح یہ بھی بتا دیا کہ جمہوریت کی کامیابی کے لئے فوجی امداد بہت ضروری ہے۔ اس مرحلے پر ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ہوائی جہاز کے ذریعے نسبتاً چند اعلیٰ تربیت یافتہ افراد کی واپسی کی کس قدر ضرورت موجود ہے۔ اس لئے، ہر ملک میں کسی بھی قسم کی حکومت کی صورت میں شدید جنگ کا امکان موجود ہوتا ہے، اور حکومت کی یہ ایسی قسم ہوگی جسے ہوا باز پسند کریں گے، اور وہ جمہوریت

کی کسی شکل کی طرح نہیں ہوگی۔

لیکن اس کے خلاف چند توجیہات اور دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ امریکا، خواہ اس کا رویہ جنگجوآنہ ہے یا نہیں ہے، جنگ عظیم میں صرف وہی فاتح ہوگا اور یہ امر بعید از امکان ہوگا کہ امریکہ جمہوریت ترک کر دے گا۔ فسطائیت کی زیادہ تر طاقت وقوت، جنگ میں اس کی مجوزہ فتح ہے اور اگر اس کی غیر موجودگی ثابت ہو جائے تو پھر جمہوریت دوبارہ مشرق کی طرف پھیلنا شروع ہوسکتی ہے۔ اگر مستقبل کے حوالے سے دیکھا جائے کہ جنگ میں ایک قوم کو اس سے زیادہ قوت حاصل نہیں ہوتی، تعلیم اور حب الوطنی منتشر اور تحلیل ہو جاتی ہے، اور اگرچہ فسطائیت کے مخالفانہ طریقوں کے ذریعے عارضی طور پر جذبہ حب الوطنی کو ابھارا جا سکتا ہے، اور یہ طریقے، جہاں تک مذہبی دائرہ کار کا تعلق ہے، صحیح ثابت ہو چکے ہیں، اور بالآخر ان طریقوں کے باعث ناگزیر طور پر پریشانی، مایوسی اور شکست خوردگی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے مجموعی طور پر، فوجی توجیہات اور دلائل ان ممالک میں جمہوریت کی بقا اور احیاء کی طرف اشارہ کرتے ہیں جہاں یہ ابھی تک موجود ہے، اور جن ممالک میں یہ وقتی طور پر معدوم ہے، اور وہاں اس کی واپسی کا امکان موجود ہے۔ لیکن اس امر کا اعتراف لازمی طور پر کیا جانا چاہئے کہ اس کے برعکس متبادل ہر قیمت پر ناممکنات میں شامل ہے۔

تیرہواں باب

تنظیمیں اور افراد

اس دنیا میں بسنے والے انسان مختلف ممالک اور مختلف معاشروں میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ اس طرح وہ مختلف قسم کے فوائد سے مستفید ہو سکتے ہیں لیکن اپنے چھتوں میں رہنے والی شہد کی مکھیوں کے برعکس ان کی خواہشات کافی حد تک انفرادی نوعیت کی ہوتی ہیں، حالانکہ اس کے باعث معاشرتی اور سماجی زندگی میں مشکل پیش آتی ہے اور حکومت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کیونکہ ایک طرف تو، حکومت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور اس کے بغیر ایک مہذب اور متمدن مالک کی آبادی کی بہت تھوڑی تعداد اپنی بقا کی امید کر سکتی ہے اور وہ قابلِ رحم عسرت اور غربت کی حالت میں ہو سکتی ہے۔ لیکن دوسری طرف حکومت، طاقت وقوت کی غیر مساوی اکائیوں پر مشتمل ہوتی ہے، اور جن کے پاس زیادہ قوت واختیار ہوتا ہے اور عام شہریوں کی نسبت وہ اس قوت کو اپنی خواہشات میں مزید اضافہ کرنے کے لئے استعمال کریں گے۔ اس طرح افراتفری اور ابتری اور ظلم وستم یکساں طور پر تباہ کن ہوتے ہیں اور اگر بنی نوع انسان نے خوشی حاصل کرنی ہے تو پھر کچھ نہ کچھ مصالحت کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔

موجودہ باب میں، میں ان تنظیموں کا مفصل ذکر کرنا چاہتا ہوں جن کا تعلق ایک مخصوص فرد کے ساتھ ہے، اور میں ان افراد کا ذکر نہیں کرنا چاہتا جن کا تعلق ایک مخصوص تنظیم سے ہے۔ بلاشبہ یہ معاملہ ایک جمہوری اور ایک مطلق العنان حکومت میں بہت ہی مختلف ہوتا ہے۔ کیونکہ مطلق العنان حکومت میں، قلیل استثنیات کے ساتھ تمام تنظیمیں حکومت کے ہی تمام شعبے اور محکمے ہوتے ہیں۔ بہر حال جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ ابتدائی جائزے کے دوران اس فرق کو نظر انداز کر دوں۔

تنظیمیں عوامی (سرکاری) ہوں یا نجی، ایک فرد پر دو طرح سے اپنے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایسی تنظیمیں ہوتی ہیں جو بذاتِ خود اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے تشکیل دی جاتی ہیں یا وہ اپنے مفادات ہی کو مدنظر رکھتی ہیں، اور دوسرے ایسی تنظیمیں بھی ہوتی ہیں جو خود کو دوسروں کے قانونی حقوق پامال کرنے سے روکتی ہیں۔ اس ضمن میں فرق اور امتیاز زیادہ واضح نہیں ہے۔ پولیس اس لئے موجود ہوتی ہے کہ وہ ایماندار افراد کے مفادات کو محفوظ رکھے، ان کے مفادات کی حفاظت کرے، اور پھر چوروں، ڈاکوؤں اور نقب زنوں کی روک تھام کرے لیکن چوروں، ڈاکوؤں اور لٹیروں پر ان کے اثرات ان لوگوں سے زیادہ ہوتے ہیں جو قانون کی پابندی اور احترام کرتے ہیں۔ اس وقت میں اس فرق اور امتیاز کو دوبارہ زیرِ غور لاؤں گا، لیکن فی الوقت، آیئے اب ہم مہذب اور متمدن ممالک میں موجود انفرادی افراد کی زندگیوں کے سب سے زیادہ اہم معاملات پر غور کریں جن کے متعلق کچھ تنظیمیں فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہیں۔

سب سے پہلے ہم انسان کی پیدائش کے معاملے پر غور کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک ڈاکٹر یا پھر ایک دایہ کی لازمی طور پر خدمات کی ضروریات محسوس ہوتی ہے، اور حالانکہ، ماضی میں قطعی طور پر غیر تربیت یافتہ خاتون اس مقصد کے لئے مناسب سمجھی جاتی تھی، اور آج بھی رائے عامہ کی طرف سے تسلیم کی جانے والی ایک خاص حد تک مہارت کی حامل خاتون دایہ مناسب سمجھی جاتی ہے۔ ایامِ طفولیت اور بچپن میں بچے کی صحت کسی حد تک ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ مزید برآں، بعض ممالک میں بچے کی صحت کے متعلق ریاست کی ذمہ داری، ایام طفولیت اور جوانی میں موت کی بالکل صحیح عکاس ہوتی ہے۔ اگر والدین، بطورِ والدین اپنے فرائض نبھانے میں بری طرح ناکام ہو جاتے ہیں، تو پھر ایک سرکاری ادارہ اس بچے کو ان سے "لے کر" لے پالک بچوں کے گھر" میں موجود والدین کے حوالے کر سکتا ہے، یا پھر بچے کو کسی ادارے کے ہاتھ میں دے سکتا ہے۔ پانچ یا چھ سال کی عمر میں یہ بچہ ایک تعلیمی ادارے کے زیرِ اہتمام آ جاتا ہے اور پھر اس کے بعد کئی سالوں کے لئے اسے وہ مہارتیں حاصل کرنی پڑتی ہیں، جو اس کی نظر میں ہر شہری کے لئے ضروری ہیں۔ اس مرحلے کے اختتام پر اکثر یہی ہوتا ہے کہ اس بچے کی آئندہ زندگی کے لئے رویے اور ذہنی معمولات مقرر ہو جاتے ہیں۔

دریں اثناء ایک جمہوری ملک میں ایک بچے پر کچھ دوسری قسم کے اثرات بھی مرتب ہوتے

ہیں جو حکومت کی طرف سے جاری نہیں ہوتے۔ اگر والدین مذہبی یا سیاسی ہیں تو وہ بچے کو اپنے مذہبی عقیدے یا سیاسی جماعت کے عقائد سے آگاہ کریں گے۔ جب بچہ تھوڑا بڑا ہوتا ہے تو وہ منظم پُر لطف سرگرمیوں مثلاً سینما یا فٹ بال کے مقابلے پسند کرتا ہے۔ اگر وہ قدرے ذہین ہو تو اخبارات سے متاثر ہو جاتا ہے۔ اگر وہ کسی ایسے سکول میں جاتا ہے جو سرکاری نہیں ہے تو پھر وہ ایک ایسا نقطہ نظر اپناتا ہے جو انگلستان میں کئی پہلوؤں کے لحاظ سے انوکھا اور عجیب سمجھا جاتا ہے۔ عام طور پر وہ اس نظریے کو اپناتا ہے کہ وہ معاشرتی طور پر دوسرے افراد سے برتر اور اعلیٰ ہے۔ اسی دوران وہ ایک ایسا اخلاقی ضابطہ اخلاق اپنا لیتا ہے جو اس کی عمر، طبقے اور قومیت کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ اخلاقی ضابطہ اخلاق اہم تو ہوتا ہے لیکن اس کا اظہار اور وضاحت آسان نہیں ہوتی کیوں کہ اس ضمن میں تین ذہنی تصور ہوتے ہیں جن میں فرق واضح طور پر نہیں بیان کیا جا سکتا۔ پہلے وہ تصورات اور نظریات ہیں جنہیں رسوائی یا بدنامی کی اذیت کی صورت میں واقعی اپنایا جاتا ہے، دوسرے وہ ہیں جنہیں کھلے عام مسترد نہیں کیا جانا چاہیے، اور تیسرے وہ ہیں جو انسانی زندگی کو قطعیت عطا کرتے ہیں اور صرف اللہ کے نیک بندے اور ولی ہی انہیں اپناتے ہیں۔ عوام کی مکمل آبادی پر لاگو ہونے والے اخلاقی ضابطے، اگر مجموعی طور پر تو نہیں بلکہ زیادہ تر مذہبی روایات کا نتیجہ ہوتے ہیں جو مذہبی اداروں کے ذریعے لاگو کئے جاتے ہیں لیکن وہ اپنے زوال کو زیادہ یا مختصر عرصے کے لئے قائم اور برقرار رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ پیشہ وارانہ ضابطہ اخلاق بھی ہوتا ہے، مثلاً وہ امور جنہیں ایک افسر، ایک ڈاکٹر یا ایک بیرسٹر کے ذریعے انجام نہیں دیا جانا چاہیے۔ اس عہدِ جدید میں اس قسم کے ضوابط اخلاق عموماً پیشہ وارانہ تنظیمیں تیار کرتی ہیں۔ یہ بہت ضروری اور لازمی ہوتے ہیں۔ جب مذہب (کلیسا) اور فوج کے درمیان مقابلہ ہوتا ہے تو پھر فوجی ضابطہ اخلاق افسروں میں موجود رہا، اور پھر طبی اور اعترافی خفیہ ضابطہ اخلاق، قانون کی موجودگی میں بھی موجود رہتا ہے۔

جیسے ہی ایک نوجوان مرد یا عورت دولت کمانا شروع کر دیتی ہے تو پھر کئی ایک تنظیمیں اس کی سرگرمیوں پر اثر انداز ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ آجر، عام طور پر ایک تنظیم ہوتی ہے لیکن ممکنہ طور پر اس کے علاوہ ملازمین کی ایک وحدت یا وفاق ہوتا ہے۔ تنظیم سوداکاری اور ریاست، دونوں کام کے اہم پہلوؤں کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں اور انشورنس اور فیکٹری ایکٹ (Factory Act)

جیسے معاملات کو چھوڑ کر ریاست محصولات اور سرکاری احکامات کے ذریعے یہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ یا ایک فرد کی طرف سے انتخاب شدہ پیشہ کے باعث اسے خوشحالی نصیب ہو گی یا وہ غربت کی چکی میں پسنے لگے گا۔ ایک صنعت کی خوشحالی ہر قسم کے حالات مثلاً کرنسی، بین الاقوامی صورت حال یا جاپان کی خواہشات کے باعث بھی متاثر ہو سکتی ہے۔

شادی اور بچوں کے لئے فرائض کے باعث ایک فرد کے دوبارہ قانون کے ساتھ تعلقات قائم ہو جاتے ہیں، اس کے علاوہ اس فرد کا اخلاقی ضابطے کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے جو مذہب کے ذریعے وجود میں آتا ہے۔ اگر اس کی عمر قدرے زیادہ ہو جاتی ہے اور وہ کافی حد تک غریب ہوتا ہے، تو پھر بالآخر وہ ''اولڈ ایج پنشن'' (Old Age Pension) سے مستفید ہو سکتا ہے اور اس کی موت کے ضمن میں قانون اور طبی ادارے نہایت احتیاط سے معاملات کی نگرانی کرتے ہیں تاکہ یہ امر یقینی ہو جائے کہ اس شخص کی موت اس کی اپنی یا دوسروں کی خواہش کے باعث واقع نہیں ہوئی۔

مزید برآں، کچھ ایسے معاملات بھی ہوتے ہیں جن کے متعلق فیصلے ذاتی توجہ کے متقاضی ہوتے ہیں۔ ایک شخص خود کو خوش کرنے کے لئے شادی کر سکتا ہے بشرطیکہ خاتون آمادہ و تیار ہو، جوانی میں ممکنہ طور پر اسے اپنی مرضی کی زندگی بسر کرنے کی آزادی ہوتی ہے، وہ اپنی آمدن کے مطابق اپنے فارغ وقت کو اپنی مرضی کے مطابق صرف کر سکتا ہے۔ اگر اسے مذہب یا سیاست سے دلچسپی ہے تو وہ اپنی پسند کے مطابق مذہبی عقیدے یا سیاسی جماعت کو اختیار کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ جب وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنی زندگی گزار سکتا ہے تو پھر بھی وہ اپنی شادی کے علاوہ دیگر معاملات میں مختلف اداروں اور تنظیموں کا محتاج ہوتا ہے۔ جب تک وہ ایک خاص شخص نہ ہو، کسی مذہب کو تخلیق نہیں کر سکتا یا ایک سیاسی جماعت قائم نہیں کر سکتا، ایک فٹ بال کلب منظم نہیں کر سکتا، یا وہ اپنے ذاتی مشروبات تیار نہیں کر سکتا۔ وہ صرف یہی کر سکتا ہے کہ پہلے سے موجود متبادلات میں سے کوئی متبادل اختیار کر لے لیکن معاشی حالات کے لحاظ سے ان متبادلات کے درمیان مسابقت کے ذریعے یہ تمام متبادلات اس کے لئے پسندیدہ بن جاتے ہیں۔

پھر اس طرح، مہذب معاشروں میں تنظیموں کی خصوصیات کے باعث ان معاشروں میں موجود فرد کی آزادی میں، ایک نسبتاً کم ترقی یافتہ معاشرے میں موجود ایک کسان کی نسبت زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں ایک چینی کسان کی زندگی کا یورپی مزدور کی زندگی سے تقابل

کیجئے۔ یہ سچ ہے کہ ایک بچے کی حیثیت سے اسے سکول نہیں جانا پڑتا لیکن اوائل عمر سے ہی اسے کام کرنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ مشکلات، محنت و مشقت اور طبی سہولتوں کے فقدان کے باعث بچپن میں اس کی موت کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ اگر وہ زندہ رہ جاتا ہے، جب تک اسے ایک فوجی، یا ایک غنڈہ بننے کے لئے تیار نہ کیا جائے، یا پھر اس نے کسی دوسرے بڑے شہر جانے کا خطرہ مول نہ لینا ہو، تو پھر اس کے پاس زندگی گزارنے کا کوئی اور ذریعہ باقی نہیں رہ جاتا۔ اس کے ملک کے رسم و رواج اسے ہر قسم کی آزادی سے محروم کر دیتے ہیں لیکن شادی کی آزادی اسے کم از کم حد تک حاصل ہوتی ہے۔ عملی طور پر فرصت کا وقت اس کے پاس نہیں ہوتا، اور اگر کبھی اسے فرصت کا وقت میسر آ بھی جائے تو اس کے پاس یہ وقت خوشگوار انداز میں گزارنے کا کوئی ذریعہ بھی موجود نہیں ہوتا۔ وہ بمشکل اپنی زندگی کے اخراجات پورے کرتا ہے، اور قحط کے زمانے میں اس کے خاندان کے زیادہ تر افراد کے بھوک سے مر جانے کا امکان ہوتا ہے۔ اور جس قدر مشکل زندگی اس چینی شخص کی ہوتی ہے، اس سے سخت تر زندگی اس کی بیوی اور بیٹیوں کی ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ انگلستان میں ایک بے روزگار مزدور کی زندگی جس قدر پریشان کن ہوتی ہے، اس کی یہ زندگی ایک اوسط چینی کسان کی زندگی کے مقابلے میں جنت محسوس ہوتی ہے۔

تنظیموں کی جو دیگر اقسام سامنے آتی ہیں، ان کا تشکیل کا مقصد یہ ہوتا ہے ایک انسان کو دوسرے انسان کی طرف سے نقصان پہنچانے سے روکا جائے۔ ان میں سے زیادہ اہم پولیس اور وہ قانونی ادارے ہیں جو مجرمانہ سرگرمیوں کو روکتے ہیں۔ یہ ادارے اور تنظیمیں اس قسم کے جرائم کی بیخ کنی کرتے ہیں جو تشدد پر مبنی ہوتے ہیں۔ مثلاً قتل، ڈاکہ زنی اور مجرمانہ حملہ۔ ان کے باعث صرف معاشرے کے ایک قلیل متشدد اور ناراض مخصوص طبقے کی خوشی اور آزادی میں اضافہ ہوتا ہے۔ جس معاشرے یا ملک میں طاقت و قوت اور نگرانی کے لحاظ سے پولیس بے بس ہوتی ہے، وہاں غارت گر بہت جلد خوف و دہشت کی فضا قائم کر لیتے ہیں جس کے باعث قاتلوں اور لٹیروں کے باعث مہذب اور متمدن دنیا کی زیادہ سے زیادہ خوشی، مسرت اور طمانیت ناممکن ہو جاتی ہے۔ مزید برآں بلاشبہ اس صورت حال میں ایک اور خطرہ بھی موجود ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پولیس بذات خود غارت گروں کے جتھوں میں تبدیل ہو جائے یا پھر یہ پولیس کسی حد تک ظلم و ستم پر مبنی نظام قائم کر دے۔ بہرحال، یہ خطرہ کسی نہ کسی طرح تصوراتی ہے لیکن اس سے نمٹنے کے طریقے سب کو

معلوم ہیں۔ایک اور خطرہ بھی موجود ہے کہ پولیس کو ارباب اقتدار، مطلوبہ اصلاحات کی حمایت سے روکنے یا باز رکھنے کے لئے استعمال کریں۔ یہ صورت حال کچھ حد تک واقع ہو سکتی ہے، تقریباً ناگزیر اور لازمی معلوم ہوتی ہے۔ یہ صورت بنیادی مشکل کا ایک حصہ ہے کہ افراتفری اور ابتری کو روکنے والے طریقے اس طرح کے ہوتے ہیں کہ ان کے باعث تبدیلی کی صورت میں بھی موجودہ صورت حال میں تبدیلی مشکل محسوس ہوتی ہے۔اس مشکل کے باوجود، مہذب اور متمدن ممالک کے چند افراد کو یقین ہوتا ہے کہ وہ اس تمام صورت حال پر پولیس کے ذریعے قابو پا سکتے ہیں۔

ابھی تک ہم نے جنگ اور انقلاب یا پھر ان دونوں کے خوف کا تفصیلاً ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ صورت حال ریاست کی اس جبلت کو ظاہر کرتی ہے جس کے تحت خود حفاظت کا جذبہ ریاست کے اندر پیدا ہوتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ عوام پر خوفناک اور ہولناک قابو اور نگرانی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ تقریباً تمام یورپی ممالک میں ایک عالمگیر لازمی فوجی ملازمت کا معمول موجود ہے۔ یورپ میں ہر جگہ جنگ چھڑنے کی صورت میں فوج کی عمر کے ہر فرد کو جنگ کرنے کے لئے بلایا جا سکتا ہے اور ہر بالغ فرد کو حکومت وہ کام تفویض کر سکتی ہے جو اس کی نظر میں فتح کے لئے ضروری ہو سکتا ہے۔ جن افراد کی سرگرمیاں دشمنوں کے لئے مفید اور مددگار ثابت ہوتی ہیں، انہیں سزائے موت کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ زمانہ امن میں تمام حکومتیں متعدد قدم اٹھاتی ہیں اور کئی ایک طریقے اپناتے ہیں، ان میں سے کچھ اقدامات بہت ہی نقصان دہ اور مہلک ہوتے ہیں اور کچھ نسبتاً کم نقصان دہ اور مہلک ہوتے ہیں، تاکہ بوقت ضرورت عوام کی جانب سے جنگ کرنے کے لئے یقینی آمادگی حاصل کی جا سکے اور قومی مقصد کے لئے ان کی وفاداری کو ہمیشہ برقرار اور قائم رکھا جائے۔ انقلاب کی صورت میں اس کے واضح یا رونما ہونے کی شرح کے لحاظ سے حکومتی اقدامات مختلف نوعیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اگر دیگر معمولات زندگی جوں کے توں بھی رہیں تو اس وقت انقلاب کا خطرہ زیادہ ہو جاتا ہے جب ایک حکومت عوام کی فلاح و بہبود اور خوشحالی کی طرف بہت کم توجہ دیتی ہے۔ لیکن جب ایک مطلق العنان حکومت موجود ہوتی ہے، تو حکومت کو نہ صرف اپنی عوام پر جسمانی، بلکہ اخلاقی اور معاشی طور پر بھی تصرف اور اجارہ داری حاصل ہوتی ہے، یہ حکومت اپنی عوام کی خواہشات کی توہین و تذلیل کرنے کے ضمن میں کم متشدد حکومت سے ایک ہاتھ آگے نکل سکتی ہے کیونکہ انقلابی جذبے کو پھیلانے اور منظم کرنے کا عمل بہت کم آسان ہوتا ہے۔ اس

لئے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ جہاں تک ایک ریاست کا شہریوں کے ادارے سے امتیاز کا تعلق ہے، اس کی قوت و اختیار میں جس قدر زیادہ اضافہ ہوتا جائے گا، یہ اپنے عوام سے زیادہ سے زیادہ لاتعلق ہو جائے گی۔

مندرجہ بالا مختصر جائزے کے ذریعے یہ معلوم ہوتا اور یہ اہم نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ حکومتی خود حفاظتی رویے سے قطع نظر تنظیموں کے اثرات ایسے ہوتے ہیں کہ جن کے باعث عوام کی خوشی، مسرت اور خوشحالی و بہبودی میں اضافہ ہوتا ہے۔ تعلیم، صحت، محنت کی پیداوار، غربت و ناداری کے خلاف تحفظ، ایسے معاملات ہیں جن کے متعلق کسی جھگڑا یا فساد کا سوال پیدا نہیں ہونا چاہئے اور ان تمام عناصر کا انحصار اعلیٰ سطحی تنظیمی صلاحیت پر ہے۔ لیکن جب ہم ان طریقوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جن کے ذریعے انقلاب کی روک تھام کی جاسکتی ہے یا جنگ میں شکست سے اجتناب کیا جاسکتا ہے، تو اس وقت معاملہ قدرے مختلف نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ بہر حال یہ طریقے کیسے ہی ضروری اور لازمی دکھائی دیں، ان کے اثرات ناخوشگوار ہوتے ہیں، اور ان کا صرف اس بنیاد پر دفاع کیا جا سکتا ہے کہ انقلاب یا شکست ابھی بھی مزید ناخوشگوار ہوگی۔ شاید اس میں فرق صرف ایک درجے کا ہو۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وبائی امراض سے بچاؤ کے ٹیکے، تعلیم اور سڑکوں کی تعمیر ناخوشگوار عمل ہوسکتا ہے، لیکن چیچک، جہالت اور لامحدود پریشانی اور مصیبت سے کم ناخوشگوار نہیں ہوسکتا۔ بہر حال، مختلف درجوں پر مشتمل فرق اس قدر زیادہ ہوسکتا ہے جو تقریباً نوعیت میں فرق کے برابر ہوسکتا ہے۔ مزید برآں، پُرامن ترقی کے لئے استعمال ہونے والے طریقوں کی ناخوشگواریت کے لئے ضروری نہیں ہو کہ ان کی نوعیت عارضی سے زیادہ ہو۔ جب چیچک ختم ہوسکتی ہے تو پھر وبائی امراض کے لئے استعمال ہونے والے ٹیکوں کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔ تعلیم اور سڑکوں کی تعمیر کے عمل کو بہترین اور شاندار طریقوں کے استعمال کے ذریعے بہت حد تک متفقہ بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن ہر تکنیکی ترقی جنگ کو مزید تکلیف دہ اور تباہ کن بنا دیتی ہے اور جبر و استبداد پر مبنی طریقوں کے ذریعے انقلاب کی روک تھام، انسانیت اور ذہانت و صلاحیت کے لئے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

ایک فرد کے مختلف تنظیموں اور اداروں کے ساتھ تعلقات کو مختلف اقسام کے طور پر بیان کرنے کے لئے ایک اور طریقہ موجود ہے: یہ فرد ایک گاہک ہوسکتا ہے، ایک رضا کار ہوسکتا ہے، اور غیر رضا کار ہوسکتا ہے، یا پھر ایک دشمن ہوسکتا ہے۔

یہ تنظیمیں جن کا یہ فرد گاہک ہے، اسے لازمی طور پر خود کو اپنے آرام و سکون کا نگران سمجھنا چاہئے، لیکن یہ تنظیمیں اس فرد کے احساسِ اقتدار میں زیادہ اضافہ نہیں کرتیں۔ بلاشبہ ان کی خدمات کے ضمن میں اس کی اچھی رائے اور موقف کو غلط فہمی پر محمول کیا جا سکتا ہے، ہر فرد جو گولیاں خریدتا ہے، غیر مفید ثابت ہو سکتی ہیں، اس کا خریدا ہوا مشروب خراب ہو سکتا ہے، گھڑ دوڑ کے موقع پر ہونے والی ملاقات جواریوں کے لئے مالی لحاظ سے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ بہر حال، کسی نہ کسی طرح ایسے مواقعوں پر بھی وہ ان تنظیموں سے کچھ نہ کچھ حاصل کرتا ہے جن کی وہ سرپرستی کرتا ہے، مثلاً امید، لطف، مسرت اور ذاتی کامیابی کا احساس۔ ایک نئی کار خریدنے کی امید ایک شخص کو کچھ سوچنے اور کچھ کہنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ بہر حال، مجموعی طور پر، یہ آزادی کہ وہ کس طرح رقم خرچ کر سکتا ہے، ایک شخص کے لئے خوشی و مسرت کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے، مثال کے طور پر، اپنے فرنیچر کے لئے محبت ایک بہت ہی زبردست اور وسیع جذبہ ہے، جو اس وقت موجود نہیں ہو گا جب ریاست ہمیں فرنیچر سے سجا ہوا گھر مہیا کر دے گی۔

یہ تنظیمیں جن کا ایک فرد رضا کارانہ اور اپنی مرضی سے رکن ہوتا ہے، میں سیاسی جماعتیں، عبادت گاہیں، کلبیں، دوستانہ تنظیمیں، وہ تجارتی اور کاروباری ادارے جن میں اس نے سرمایہ کاری کی ہوتی ہے، وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر تنظیموں کو اسی قسم کی مخالفانہ تنظیموں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مثلاً حریف سیاسی جماعتیں، باغی مذہبی ادارے، مقابلے پر موجود تجارتی و کاروباری ادارے وغیرہ۔ اس مسابقت اور تقابل اور حریفانہ رویے اور طرزِ عمل کے باعث رونما ہونے والے مقابلے ان لوگوں کے لئے مفید ثابت ہوتے ہیں جو ان مقابلوں کو ایک ڈرامہ اور کھیل کے علاوہ اقتدار کی ہوس اور خواہش کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اگر ریاست کمزور نہ ہو تو یہ مقابلے قانون کی حدود میں رکھے جاتے ہیں جو تشدد اور بہت بڑے پیمانے پر دھوکا دہی کرنے والوں کو سزا دیتے ہیں جب تک یہ خفیہ طور پر شریک جرم نہ ہوں۔ جب حکام اور اربابِ اختیار کے مجبور کرنے پر یہ حریفانہ اور مخالفانہ مقابلے خون ریزی کے بغیر منعقد ہوتے ہیں، جو مجموعی طور پر شورہ پشتی کے احساس اور ہوسِ اقتدار کا مفید ذریعہ ثابت ہوتے ہیں، جو بصورتِ دیگر اپنی طمانیت اور تسکین کے لئے زیادہ خوفناک اور ضرر رساں صورتیں اختیار کر لیتے ہیں۔ یہاں ہمیشہ ایک خطرہ موجود رہتا ہے، اگر ریاست قدرے بے پروائی اور لچک سے کام لیتی ہے یا غیر جانبدار نہیں ہوتی ہے، تو پھر سیاسی

اختلافات کے باعث فسادات، قتل اور خانہ جنگی شروع ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر خطرہ دور ہو جاتا ہے تو، تو پھر انفرادی افراد اور بحیثیت مجموعی مختلف ممالک میں یہ عنصر مکمل طور پر موجود ہوتا ہے۔

ایک بہت ہی اہم تنظیم یا ادارہ، جس کا ایک فرد، غیر ارادی یا لازمی طور پر رکن ہوتا ہے، ریاست ہے۔ جہاں تک قومیت کے اصول کی موجودگی اور برقراری کا تعلق ہے، اس کے باعث، بہر حال، یہ نتیجہ ریاست کی رکنیت کی صورت میں برآمد ہوتا ہے، جو اگرچہ ایک شہری کی خواہش اور مرضی کے باعث نہیں بلکہ اس کی خواہش اور مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔

وہ قومی لحاظ سے
روسی تھا یا فرانسیسی
وہ ترکی تھا یا اٹلی کا کوئی باشندہ
لیکن ان تمام امتیازات
سے وہ بالاتر تھا
دوسری غیر اقوام سے
متعلق ہونے کے باوجود
وہ ایک سچا انگریز تھا۔

اکثر افراد، جب انہیں ریاست کو تبدیل کرنے کا موقع میسر آتا ہے، اس وقت تک کوشش نہیں کرتے جب تک ریاست ایک غیر ملکی قومیت کی نمائندگی نہیں کرتی۔ ایک ریاست کو صرف قومیت کے اصول کی کامیابی ہی کے ذریعے مضبوط کیا جا سکتا اور اسے استحکام بخشا جا سکتا ہے۔ جب حب الوطنی اور شہریت دونوں ہی ریاست کے ساتھ وفاداری کی بنیاد ہوں تو پھر ایک فرد کسی رضا کارانہ تنظیم، مثلاً عبادت گاہ (کلیسا) کی نسبت اپنی ریاست کا زیادہ وفادار ہوتا ہے۔

ریاست کے ساتھ وفاداری، دونوں مثبت اور منفی مقاصد اور مفادات کی حامل ہے۔ اس ضمن میں ایک ایسا عنصر بھی موجود ہوتا جو گھر اور گھرانے سے محبت کے ساتھ منسلک ہوتا ہے۔ لیکن گھر اور گھرانے سے محبت، وفاداری کی وہ صورت اختیار نہیں کرتی جو ریاست کے ساتھ وفاداری کی صورت میں موجود ہوتی ہے بشرطیکہ یہ دونوں مقاصد ہوس اقتدار اور غیر ملکی جارحیت کے خدشے کے ذریعے وجود میں نہ آتے ہوں۔ سیاسی جماعتوں کے برعکس، مختلف ممالک کے

درمیان اختلافات بھرپور اور مکمل ہوتے ہیں۔ لنڈن برگ بے بی (Lindenberg Baby) کے اغوا اور قتل پر تمام مہذب دنیا صدمے کا شکار ہوگئی، لیکن وسیع پیمانے پر اس طرح کے اقدامات آئندہ جنگ کا پیش خیمہ ہوتے ہیں جس کے لئے ہم برطانیہ کے رہنے والے اپنی آمدن کا ایک چوتھائی حصہ خرچ کرنے کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔ جس طرح ایک ریاست کے ساتھ وفاداری کا اظہار کیا جاتا ہے، کسی اور تنظیم کے ساتھ اس قسم کی وفاداری کا اظہار نہیں کیا جاتا۔ اور ریاست کی سب سے بڑی سرگرمی وسیع پیمانے پر انسانوں کے قتلِ عام کی تیاری ہے۔ یہ اس تنظیم کے لئے موت کے لحاظ سے وفاداری ہوتی ہے جس کے باعث عوام ایک مطلق العنان حکومت کو برداشت کرتے ہیں، اور ایک غیر ملکی حکومت کے سامنے محکوم بن جانے کی نسبت اپنے گھر، بچوں اور اپنی تمام تہذیب وثقافت کی تباہی کا خطرہ مول لیتے ہیں۔ انفرادی نفسیات اور حکومتی تنظیم، دونوں مل کر ایک ایسا خوفناک اور المیہ منظر تشکیل کرتے ہیں جس کا ہر حالت اور ہر قیمت پر ہمیں اور ہمارے بچوں کو شکار ہونا ہوگا بشرطیکہ ہم کسی بحران، آفت یا صدمے کے علاوہ کسی بھی معاملے کا ادراک کرنے میں ہمیشہ ہی بے بس ہوتے ہیں۔

چودھواں باب

اقتدار کی جنگ

انیسویں صدی میں جہاں ایک زبردست طاقت وقوت کے خطرات کا بخوبی طور پر ادراک واحساس کیا گیا، وہاں ان سے بچنے اور محفوظ رہنے کے لئے ایک پسندیدہ طریقہ اور ترکیب بھی موجود تھی، جسے "اقتدار کی جنگ" کا نام کہا جاتا ہے۔ اجارہ داری سے منسلک نقصانات اور برائیاں، ابھی بھی روایتی طور پر سب کے علم میں ہیں۔ سٹوارٹ (سکاٹ لینڈ کا شاہی گھر)، اور حتیٰ کہ الزبتھ نے اپنے درباریوں کو منافع بخش اجارہ داریاں عنایت کیں، جس پر اعتراض، خانہ جنگی کی وجوہات میں سے ایک وجہ تھی۔ جاگیردارانہ دور میں، جاگیروں کے مالکوں کا عام طور پر یہی اصرار ہوتا تھا کہ ان کے کارخانوں ہی میں اناج کی پسائی ہو۔ 1849 سے قبل یورپی شہنشاہوں نے اکثر تجارتی مسابقت اور جنگ اختیار کرنے پر نیم جاگیردارانہ پابندیاں عائد کی ہوئی تھیں۔ یہ پابندیاں مصنوعات سازوں یا صارفین کے مفاد میں نہیں بلکہ شہنشاہوں اور زمین داروں/ جاگیرداروں کے مفاد میں عائد کی جاتی تھیں۔ اس کے برعکس، انگلستان میں بہت سی ایسی پابندیاں برقرار اور مروج تھیں جو زمین داروں/ جاگیرداروں اور سرمایہ کاروں، دونوں کے لئے غیر مفید اور نقصان دہ تھیں، مثلاً کم از کم اجرت کے قوانین اور مشترکہ زمینوں (اشتمال اراضی) کو ختم کرنے پر پابندی کے قوانین۔ اس لئے "کارن لاء" (Corn Law) کے نافذ ہونے تک، زمین دار/ جاگیردار اور سرمایہ کار دونوں نے مجموعی طور پر عدم مداخلت کی حکمت عملی پر اتفاق کرلیا تھا۔

اس وقت تک تمام یورپ میں رائے عامہ کی صورت میں یہ نظریہ بہت ہی قومی اور زبردست سمجھا جاتا تھا۔ 1825 سے 1848 تک براعظم بھر میں کلب اور ریاست، دونوں انقلاب فرانس کے نظریہ کی مخالفت میں متحد تھے۔ تمام جرمنی اور آسٹریا میں اظہار رائے اور ذرائع ابلاغ واطلاعات

پر پابندی اچانک بہت ہی شدید، سخت اور مضحکہ خیز تھی۔ ''ہینی'' (Heine) نے ان پابندیوں کا مندرجہ ذیل الفاظ کے ذریعے مذاق اور مضحکہ اڑایا:

''اظہار رائے اور ذرائع ابلاغ و اطلاعات پر جرمنی کی طرف سے عائد کی جانے والی پابندیاں.........................احمق اور بے وقوف..........................''۔

فرانس اور اٹلی میں، نپولین کی شان و شوکت اور جاہ و جلال کے علاوہ انقلاب کی تعریف و توصیف، حکومتی ظلم و ستم کے ایک مقصد کے طور پر موجود تھی۔ سپین اور کلیسا کی ریاستوں میں، عام آزاد خیال بلکہ اعتدال پسند طبقوں پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ پاپائے اعظم کی حکومت ابھی تک سرکاری طور پر سحر اور جادو پر یقین رکھتی تھی۔ اٹلی، جرمنی یا آسٹریلیا ہنگری میں قومیت کے اصول کی حمایت کرنے کی اجازت نہ تھی اور ہر جگہ اس کے اثرات کو تجارت کے مفادات کی مخالفت سے منسلک کیا جاتا تھا، اور اس کے ساتھ ساتھ دیہاتی آبادی اور احمق بادشاہوں و ساکت شرافت کی حمایت کے ذریعے جاگیردارانہ حقوق برقرار رکھے جاتے تھے۔ ان حالات میں ایک دوسرے کی حکمت عملیوں میں عدم مداخلت، ان کی صلاحیتوں کا فطری اظہار تھا جو ان کی جائز سرگرمیوں میں رکاوٹ تھا۔

آزاد خیالوں (Liberals) نے اپنی مطلوبہ آزادی، امریکا کی آزادی حاصل کرنے کے لمحات میں حاصل کی، پھر انگلستان میں 1824 سے لے کر 1846، فرانس میں 1871، جرمنی میں 1848 سے لے کر 1918 تک مختلف مراحل، پھر اٹلی میں اسے متحد کرنے کی تحریک کے دوران، اور حتیٰ کہ روس میں انقلاب فروری کے لمحات میں، آزاد خیالوں نے آزادی حاصل کی۔ لیکن نتیجہ آزاد خیالوں کی توقع کے مطابق نہ تھا۔ صنعتی لحاظ سے ان کی حکمت عملی مارکس کی ہولناک و جارحانہ پیش گوئیوں کے مشابہ تھی۔ امریکا، جو کافی عرصے سے آزاد خیال روایتوں کا امین تھا، سب سے پہلا ملک تھا جس نے یقین اور بھروسے کی حالت اپنائی اور اختیار کی، یعنی وہ اجارہ داریاں جن کی اجازت ریاست کی طرف سے نہیں دی گئی تھی، یہ اجارہ داریاں، ابتدائی ادوار کے مانند تھیں لیکن مقابلے اور مسابقت کے فطری عمل کا نتیجہ تھیں۔ امریکیوں کا نظامِ آزاد خیالی، ظلم و ستم پر مبنی اور سخت گیر تھا لیکن کمزور تھا، اور دیگر ممالک نے صنعتی ترقی کا عمل آہستہ آہستہ راک فیلو کی کامیابی اور ترقی کو دیکھتے ہوئے اپنایا۔ اس وقت یہ معلوم ہوا کہ جب تک مسابقت کا

عمل مصنوعی طور پر پیدا یا جاری نہیں رکھا جاتا، اپنے ہی چند حریفوں کی مکمل فتح کے ذریعے اپنے زوال کا باعث بنتا ہے۔

بہر حال، یہ نظریہ تمام قسم کی مسابقتوں پر لاگو اور منطبق نہیں ہوتا۔ اگر وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو یہ سچ ہے کہ ادارے یا تنظیم کے حجم میں اضافے کا مطلب، استعداد اور کارکردگی میں اضافہ ہے۔ اس لئے یہاں اس ضمن میں دو سوال پیدا ہوتے ہیں: پہلا سوال یہ ہے کہ کن اقسام کے حالات میں مسابقت تکنیکی طور پر غیر مفید اور ناکارہ ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ کن اقسام کے حالات میں غیر تکنیکی بنیادوں پر اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے؟

اگر وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو تکنیکی امور اور حالات کے باعث اداروں اور تنظیموں کے زیادہ سے زیادہ حجم میں اضافہ ہوا ہے جو ایک مخصوص معاملے سے نمٹنے کے لئے مناسب ہے۔ ستارہویں صدی میں سڑکیں وہ ادارے تعمیر کرتے تھے جن کے پاس مالی وسائل نہیں ہوتے تھے، اور اب اس زمانے میں سڑکوں کی تعمیر کا کام مقامی کونسلوں کی نگرانی میں ہوتا ہے جنہیں سرکاری طور پر زیادہ سے زیادہ مالی امداد اور راہنمائی مہیا کی جاتی ہے۔ جب ایک بااختیار ادارہ ایک قابلِ ذکر علاقے کو اپنے زیر نگرانی کر لیتا ہے، خاص طور پر اس علاقے میں جہاں بجلی پیدا کرنے کا ایک اہم سرچشمہ اور ماخذ موجود ہوتا ہے تو پھر وہاں بجلی کا بہترین استعمال ہو سکتا ہے، جیسے کہ نیاگرا کا علاقہ۔ آب پاشی کے نظام کے لئے اسوان ڈیم جیسے ایک ذریعے کی ضرورت محسوس ہو سکتی ہے جہاں پر اس وقت تک رقم خرچ نہیں کی جا سکتی جب تک زیر نگرانی علاقہ بہت بڑا نہ ہو۔ وسیع پیمانے پر پیداوار سے منسلک معیشتوں کا انحصار اس منڈی کو زیر نگرانی لانے کے ذریعے ہو سکتا ہے جس میں پیداوار کی بے شمار تعداد کی کھپت ہو سکے۔ علیٰ ہذا القیاس۔

دیگر ایسی جہتیں اور شعبے بھی موجود ہیں جن میں وسیع و عریض علاقوں سے منسلک فوائد ابھی تک بھرپور طور پر استعمال نہیں کئے جا سکے۔ ممکن ہے کہ ابتدائی تعلیم میں سرکاری تعلیمی فلموں کے ذریعے نئی روح پھونکی جا سکے اور بی بی سی (BBC) سے تعلیمی اسباق نشر کئے جا سکیں۔ ابھی بھی یہ بہتر ہوتا کہ اگر ان فلموں اور اسباق کو ایک بین الاقوامی بااختیار ادارے کے ذریعے تیار کروایا جاتا جس کے متعلق ایک خیالی اور خوبصورت جنت کے طور پر سوچا جا سکتا ہے۔ ہوابازی کی صنعت، بین الاقوامی نہ ہونے کے باعث زوال کا شکار ہو گئی۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ اکثر مقاصد کے

حصول کے حوالے سے وسیع سلطنتیں، چھوٹی سلطنتوں سے بہتر ہوتی ہیں کیونکہ ایک چھوٹی سلطنت، جب تک عالمگیر نوعیت کی حامل نہ ہو، اپنے شہریوں کی مناسب حفاظت کا بنیادی فریضہ بہتر طور پر سرانجام نہیں دے سکتی۔

بہر حال چھوٹے علاقوں پر واقع ممالک کے بھی متعدد فوائد ہیں۔ان ممالک میں افسر شاہی (سرخ فیتہ) کم ہوتا ہے، تیز رفتار فیصلہ سازی ممکن ہوتی ہے اور مقامی ضروریات و رسم و رواج سے مطابقت پذیری کا زیادہ سے زیادہ امکان ہوتا ہے۔اس کا بہتر اور واضح حل، ایک مقامی حکومت ہے جو خود مختار تو نہیں ہوتی لیکن اس کے پاس کچھ مقررہ اختیارات ہوتے ہیں، اور اہم معاملوں کے ضمن میں مرکزی با اختیار ادارہ اس کی نگرانی کرتا ہے اور معقول وجوہات کی موجودگی کے باعث اسے مالی امداد اور معاونت بھی مہیا کی جانی چاہیے۔ بہر حال یہ موضوع ایک مفصل بحث کا متقاضی ہے جس کے متعلق میں اس وقت ذکر نہیں کرنا چاہتا۔

مسابقت یا مقابلے کا مسئلہ اور معاملہ زیادہ مشکل ہے۔ معاشی صورت حال کے تناظر میں اس پر بہت زیادہ بحث ہو چکی ہے لیکن اس کی اہمیت کم از کم، مسلح افواج اور ریاست کے اپنے نظریات کی تبلیغ و ترویج کے لحاظ سے بہت ہی زیادہ ہے۔اس کے متعلق آزاد خیال نظریہ تو یہ ہے کہ کاروباری امور اور نظریات کی ترویج و تبلیغ کے حوالے سے آزادانہ مسابقت ہونی چاہیے، لیکن مسلح افواج میں یہ صورت حال موجود نہیں ہونی چاہیے۔ اطالوی فسطائیوں اور جرمن نازیوں نے اس کے بالکل اپنی رائے کا اظہار کیا ہے کہ قومی جنگ کے سوا مسابقت کا عمل غیر مفید ہے جہاں یہ شائستہ ترین انسانی سرگرمی ہے۔ دشمن اور حریف طبقات کی طرف سے اقتدار و اختیار کی جدوجہد کے علاوہ مارکس کے پیروکار اسے بُرا اور بے ہودہ سمجھتے ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، افلاطون، مسابقت اور مقابلے کی صرف ایک قسم کو اچھا سمجھتا ہے، یعنی مسلح افواج کے اراکین کی طرف سے عزت و غیرت کی تقلید جو اس کے کہنے کے مطابق ہم جنسی محبت و پیار کے باعث وجود میں آتی ہے۔

پیداواری شعبے کے لحاظ سے، مختلف چھوٹے چھوٹے تجارتی اور کاروباری اداروں کے درمیان مسابقت اور مقابلہ جو نظامِ صنعت کے ابتدائی زمانے کی خصوصیت کو ظاہر کرتا ہے، نے پیداواری شعبے کی سب سے زیادہ اہم شاخوں کو اس امر کی اجازت بخش دی ہے کہ مختلف رضا کار

اور وقف اداروں کے درمیان مسابقت واقع ہو جائے جو باہمی اشتراک کے ذریعے کم از کم ایک ریاست کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس وقت صرف ایک ہی اہم رضا کار اور وقف ادارہ موجود ہے، یعنی صنعت اسلحہ سازی، جو اس لحاظ سے مثال ہے کہ ایک تجارتی اور کاروباری ادارے کو اشیاء کی فراہمی کے احکامات، دوسرے تجارتی اور کاروباری ادارے کو مصنوعات کی فراہمی کے لئے احکامات کا باعث ہوتے ہیں۔ اگر ایک ملک خود کو مسلح کرتا ہے تو دوسرے ممالک بھی خود کو مسلح کر لیتے ہیں، اور اس طرح مسابقت کے عمومی مقصد کا وجود باقی نہیں رہتا۔ اس عجیب و غریب اور انوکھی صورت حال سے قطع نظر، کاروباری امور اور سرگرمیوں میں مسابقت اور مقابلہ، ابھی بھی بدرجہ اتم موجود ہے، لیکن اب یہ اقوام کے درمیان مسابقت کی شکل میں پایا جاتا ہے جہاں جنگ، کامیابی اور فتح کا حتمی فیصلہ کرتی ہے۔ لہٰذا جدید کاروباری اور تجارتی مسابقت کا اچھا یا بُرا پہلو اسی طرح موجود ہے، جس طرح حریف اقوام کے درمیان موجود ہوتا ہے۔

بہر حال، معاشی مسابقت کا ایسا پہلو بھی موجود ہے جو اس قدر خوفناک اور ہولناک ہے، جیسا کہ یہ ہمیشہ سے ہی خون خوار اور مہلک رہا۔ اس سے میری مراد ملازمتوں کے لئے مسابقت ہے۔ اس کا آغاز سکول میں وظیفوں کے امتحان سے ہوتا ہے اور اکثر افراد کی پیشہ وارانہ زندگیوں میں مسلسل جاری رہتا ہے۔ مسابقت کی اس قسم کو کم تو کیا جا سکتا ہے لیکن اسے مکمل طور پر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر تمام اداکاروں نے یکساں تنخواہ وصول کی ہوتی تو پھر بھی ایک شخص نے "First Sailor" کے بجائے "ہیملٹ" (Hamlet) میں اداکاری کی ہوتی۔ اس ضمن میں دو شرائط پیش نظر رکھنی پڑتی ہیں، پہلی یہ کہ ناکام شخص کو وہ مشکلات اور مصائب سہنے اور برداشت کرنے چاہئیں جو ناگزیر ہوں، دوسری یہ کہ، جہاں تک ممکن ہو، کامیابی ایک جائز استحقاق کا انعام ہونا چاہئے، یہ نہیں ہونا چاہئے کہ چاپلوسی اور فریب کاری کے ذریعے کامیابی ایک جائز استحقاق کے انعام کے طور پر حاصل کی جائے۔ اس دوسری شرط کو اس کے استحقاق کی نسبت سوشلسٹوں کی طرف سے کم پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ بہر حال، میں اس موضوع پر مزید گفتگو نہیں کروں گا کیونکہ اس طرح ہم اصل موضوع سے بہت دور چلے جاتے۔

آج کے اس عہد جدید میں مسابقت کی سب سے اہم صورت مختلف ممالک کے درمیان مسابقت اور چشمک ہے، خاص طور پر وہ ممالک جنہیں عظیم طاقتیں کہا جاتا ہے۔ اقتدار، دولت،

عوام کے اعتقادات پر قابو کے حوالے سے یہ مسابقت ایک ظالم اور مطلق العنان مسابقت اختیار کر چکی ہے، لیکن سب سے بڑھ کر بذات خود زندگی کے لئے یہ مسابقت ایک استبدادی صورت اختیار کر چکی ہے کیونکہ سزائے موت کا نفاذ، فتح و کامرانی کا ایک بڑا اہم ذریعہ ہے۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ اس مسابقت کو ختم کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے یعنی قومی خود مختاری اور مسلح افواج کو ختم کر دیا جائے، اور اس کے بجائے ایک واحد بین الاقوامی حکومت قائم کی جائے، اور صرف اسے ہی مسلح افواج اپنے پاس رکھنے کی اجازت ہو۔ اس طریقے کا ایک متبادل حل یہ بھی ہے کہ مہذب اور متمدن ممالک کی آبادی کا ایک کثیر حصہ موت کی نیند سلا دیا جائے اور باقی آبادی کو بھوک اور ظلم وستم کے ذریعے کم کر دیا جائے۔ موجودہ زمانے میں زیادہ تر اسی متبادل حل کو ترجیح دی جاتی ہے۔

اپنے نظریات وخیالات کی ترویج وتبلیغ کے لحاظ سے مسابقت، جسے آزاد خیال، محض نظریاتی طور پر ہی آزادانہ حیثیت ونوعیت دے دیتے، اس مسابقت کے ساتھ منسلک ہو چکی ہے جو مسلح ممالک کے درمیان موجود ہوتی ہے۔ اگر آپ فسطائیت کا پرچار کرتے ہیں، تو آپ کا سب سے اہم مقصد، جرمنی اور اٹلی کو مضبوط کرنا ہے۔ مزید برآں، اگر آپ کمیونزم کی تبلیغ وترویج کرتے ہیں، تو ممکن ہے کہ آپ کمیونزم کو نافذ نہ کر سکیں، لیکن ممکن ہے کہ آپ روس کو آیندہ جنگ جیتنے میں مدد اور معاونت فراہم کر سکیں، اگر آپ جمہوریت کی اہمیت کے حق میں منظم مہم چلاتے ہیں، تو پھر آپ یہ محسوس کریں گے کہ آپ چیکوسلاویکیہ کے دفاع کے لئے فرانس کے ساتھ فوجی اتحاد پر مبنی حکمت عملی کے لئے راہ ہموار کر رہے ہیں۔ مزید برآں، یہ امر حیران کن نہیں ہے کہ روس، اٹلی اور جرمنی کو یکے بعد دیگرے، اپنے نظریات وافکار کے پرچار اور تبلیغ کے اصول کو ترک کر دینا چاہئے کیونکہ ماضی میں اس اصول کی اپنائیت کے باعث ان ممالک کی حکومتیں اپنے پیش روؤں کو نکال باہر کرنے میں کامیاب ہو گئیں اور اس اصول کے مسلسل نفاذ کے باعث ان کی اپنی حکمت عملی کا تواتر مکمل طور پر ناممکن ہو گیا ہو گا۔ موجودہ زمانے کی دنیا اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں کی دنیا سے اس قدر زیادہ مختلف ہے کہ نظریات کے پرچار اور تبلیغ کے درمیان آزادانہ مسابقت کے لئے آزاد خیال دلائل اور وجوہات کو ان کے فعال رہنے کی صورت میں جدید زمانے کے لحاظ سے دوبارہ محتاط انداز میں بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ دلائل اور وجوہات بہت حد تک فعال اور قابلِ عمل سمجھے جانے کے حقدار ہیں لیکن ان کی فعالیت کچھ حدود وقیود اور پابندیوں

کی مرہونِ منت ہے جن کا ادراک بہت ہی اہم ہے۔

مثال کے طور پر، اس کی اپنی کتاب On Liberty میں بیان کردہ جان سٹوارٹ مل (John Stuart Mill) کا آزاد خیالی پر مبنی نظریے کی نوعیت کہیں کم انتہا پسندانہ تھی جیسا کہ عام طور پر اسے سمجھا جاتا تھا۔ افراد اس لحاظ سے آزاد تھے کہ ان کے افعال اور اعمال کسی کے لئے نقصان دہ ثابت نہ ہوئے لیکن جب دوسرے ان کے لئے نقصان دہ ثابت ہوئے تو اگر ضروری ہوا، اور مناسب معلوم ہوا تو پھر انہیں ریاستی اقدام کے ذریعے ان کے عمل سے باز رکھا گیا۔ مثلاً اگر ایک شخص شعوری طور پر اس امر کا قائل ہوسکتا ہے کہ ممکن تھا کہ ملکہ وکٹوریہ قتل ہو جاتی، لیکن مل (Mill) کے نزدیک اس امر کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی کہ وہ اپنے نظریے و خیالات کا پرچار اور تبلیغ کرے۔ یہ ایک انتہائی نوعیت کا معاملہ اور موقف ہے لیکن درحقیقت کوئی بھی رائے، خیال یا نظریہ جو ترویج و تبلیغ یا مطابقت پذیری کے اہل ہو، یقینی طور پر کسی دوسرے کے لئے مضر/ برعکس اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ آزادی رائے یا تقریر کا حق اس وقت تک غیر فعال ہوتا ہے جب تک اس میں وہ چیزیں بیان کرنے یا کہنے کا حق شامل نہ ہو جو بعض افراد یا طبقوں کے لئے ناخوشگوار نتائج کے حامل ثابت ہوسکتا ہو۔ اس لئے اگر ایک نظریے یا خیال کی ترویج و تبلیغ کے لئے کسی آزادی کا امکان نظر آتا ہو تو پھر اس کو جائز اور صحیح ثابت کرنے کے لئے مل (Mill) کے اصول سے کہیں زیادہ زبردست اور درست اصول کی ضرورت محسوس ہوگی۔

ہم اس سوال اور معاملے پر حکومت، ایک عام شہری، ایک پُر جوش و سرگرم موجد اور یا پھر ایک فلسفی کے نکتہ نظر کے مطابق نظر ڈال سکتے ہیں۔ آیئے سب سے پہلے اس معاملے پر حکومت کے نکتہ نظر کے مطابق روشنی ڈالتے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں حکومت کو دو قسم کے خطرات درپیش ہوتے ہیں:

1- انقلاب

2- جنگ میں شکست

(وہ ملک جہاں پارلیمانی طرزِ حکومت رائج ہوتا ہے، سرکاری طور پر مقرر کردہ حزب اختلاف کو حکومت کا ہی ایک حصہ سمجھا جاتا ہے)۔ ان خطرات کے باعث جبلی طور پر خود حفاظتی جذبہ ابھر آتا ہے اور امکان یہ ہوتا ہے کہ حکومت ان سے محفوظ رہنے کے لئے ہر ممکن اقدام کرے گی۔ اس

نقطہ نظر کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رائے، تبلیغ و پرچار کی کس قدر آزادی کے ذریعے اندرونی و بیرونی خطرات کے خلاف استحکام حاصل ہوگا۔ بلاشبہ اس سوال کے جواب کا انحصار حکومت کے کردار اور خصوصیت کے علاوہ اس دور کے حالات پر ہے۔ اگر حکومت حالیہ طور پر وجود میں آئی ہے اور انقلاب کے ذریعے برسر اقتدار آئی ہے، اور عوام کے پاس اس حکومت سے ناراض ہونے کے لئے معقول اور مناسب وجوہات موجود ہیں تو پھر یقینی طور پر اس آزادی کے باعث مزید انقلاب برپا ہونے کا قوی امکان ہے۔ اس قسم کے حالات فرانس (1793)، روس (1918) اور جرمنی (1933) میں موجود تھے، اور ان تمام ممالک میں آزادی رائے و تبلیغ و پرچار کو حکومت نے تباہ و برباد کر ڈالا تھا۔ لیکن جب حکومت کی نوعیت روایتی ہوتی ہے اور عوام کے معاشی حالات بھی زیادہ مایوس کن نہیں ہوتے، تو پھر آزادی رائے، ایک حفاظتی عنصر کی حیثیت سے کام کرتی ہے اور اس کے باعث حکومت کی نفرت اور عدم اطمینان کم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ حکومت برطانیہ نے کمیونسٹ نظریے کی ترویج و تبلیغ کو روکنے کی بہت اچھی کوشش کی ہے لیکن برطانیہ میں کمیونسٹوں کی ناکامی کی یہ وجہ نہیں ہے اور حکومتی نکتہ نظر کے لحاظ سے بھی یہ عقلمندی ہوتی کہ انہیں اپنے نظریات و خیالات کے پرچار و تبلیغ کی مکمل آزادی دے دی جاتی۔

میں یہ نہیں سمجھتا کہ ایک حکومت کو یہ کہہ کر تبلیغ و پرچار کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے کہ کسی خاص شخص کو قتل کر دیا جائے کیونکہ اس صورت حال میں تجویز کردہ قدم اس وقت بھی اٹھایا جا سکتا ہے کہ اگر صرف چند افراد اس تبلیغ و پرچار کے ذریعے اپنے نظریات تبدیل کر لیں۔ ریاست کی یہ ذمے داری اور فرض ہے کہ وہ اپنے شہریوں کی زندگیوں کی حفاظت کرے بشرطیکہ انہیں قانونی طور پر سزائے موت نہ دی گئی ہو، اور یا پھر کسی کے قتل یا موت کی حمایت میں احتجاجی تحریک برپا نہ ہوئی ہو، تو اس صورت میں اس فرد کی حفاظت بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ اس حوالے سے عوامی جمہوریہ ویمر کا موقف بہت ہی نرم تھا۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ایک مستحکم حکومت، قانونی طور پر سزا کے حکومت کے حقدار کسی طبقے یا افراد کے خلاف احتجاج روکنے میں کامیاب ہو سکتی ہے کیونکہ اس قسم کا احتجاج قانون کے لئے کسی خطرے کا باعث نہیں ہوتا۔

حکومتی نقطہ نظر کے اعتبار سے بھی ان نظریات و خیالات میں مداخلت کرنے کی کوئی مناسب اور معقول وجہ موجود نہیں ہے جو ریاست کی سلامتی کے لئے خطرات پیدا نہیں کرتے۔ اگر

ایک شخص یہ سمجھتا ہے کہ زمین گول نہیں ہے، اور یا پھر ایک مخصوص مذہبی عقیدے پر عمل کرنا چاہئے، تو پھر اسے لوگوں کو اپنے نظریے کا قائل کرنے کے ضمن میں مکمل آزادی حاصل ہونی چاہئے۔ سائنسی علوم، مابعد الطبیعات یا اخلاقی تعلیمات واقدار کی سچائی کے ضمن میں حکومت کو اپنے آپ کو خدائی فوجدار نہیں سمجھنا چاہئے۔ تاریخ عالم میں حکومت ایسا کتنی بار کر چکی ہے اور اس وقت جرمنی، اٹلی اور روس میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ لیکن حکومت کی طرف سے یہ قدم اس کی کمزوری کا اعتراف ہے جو ایک مستحکم حکومت کے شایانِ شان نہیں ہے۔

اگر ایک عام شہری کے نقطہ نظر کے لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے اسے آزادی رائے سے اس وقت تک دلچسپی محسوس نہیں ہوتی جب تک وہ حالات پیدا نہ ہو جائیں جب اسے یہ محسوس ہو کہ حکومت اس کے لئے شدید خطرے کا باعث ہے، یا دوسرے الفاظ میں جب یہ بذاتِ خود حکومت کے لئے خطرہ ثابت ہوتا ہے۔ حکومت کا اپنے عوام سے مذہب یا قوم کے حوالے سے اختلاف ہو سکتا ہے، یہ حکومت طبقہ اشرافیہ کے بجائے شہنشائیت کی نمائندہ ہو سکتی ہے، یا یہ حکومت متوسط طبقے کے بجائے طبقہ اشرافیہ کی حمایت کر سکتی ہے، یا پھر مفلس وقلاش طبقے کی نسبت متوسط طبقے کو اپنی پسند سے نواز سکتی ہے، اور پھر جنگ کے بعد چارلس دوم اور جرمنی کی حکومت کے مانند جذبہ حب الوطنی سے محروم ہو سکتی ہے۔ ان حالات میں ایک عام شہری حکومت کے خلاف احتجاجی تحریک میں دلچسپی لے سکتا ہے اور آزادی رائے کے اس اصول وحق کا اظہار کر سکتا ہے جس اصول کے آزادی رائے کے حامی علم بردار ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تمام صورت حال انقلاب سے پہلے کی ہے، اور اس مرحلے پر یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جہاں اس قسم کے حالات پیدا ہوں، وہاں حکومت کو اپنے خلاف مخالفانہ نظریات وخیالات کے پرچار کو برداشت کرنا چاہئے اور اس ضمن میں درحقیقت حکومت اپنے اقتدار سے دستبردار بھی ہو سکتی ہے۔ اگرچہ ان کا نظریہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حکومت سے محرومی، اقتدار سے محرومی ثابت ہو سکتی ہے، پھر بھی حکومت سے دستبرداری کا نظریہ اور اصول اکثر صحیح اور سچ مانا جاتا ہے، لیکن اگر وہ یہ راہ نہیں اپناتے تو ممکنہ طور پر ان کی زندگیاں ضائع ہو سکتی ہیں۔ لیکن چند حکومتیں اس قدر دانائی کی حامل تھیں کہ وہ اس صورت حال کا ادراک کر سکتی تھیں اور پھر نہ ہی یہ اصول صحیح اور سچا مانا جاتا ہے جب ایک زبردست اور مضبوط ملک، کمزور ملک پر ظلم وستم ڈھاتا ہے۔

یہ ملک کس قدر
تکلیف اور مصیبت کا باعث ہے
کہ جب سے یہ معرضِ وجود میں آیا ہے
اسے سرسبز اور شاداب کرنے
کی سعی اور تگ ودو میں
کئی مردوں اور عورتوں نے
اپنی جان قربان کر دی ہے

انگلستان، یہ حکمتِ عملی، آئرلینڈ کے بارے، آٹھ صدیوں تک جاری رکھنے میں کامیاب رہا، اور پھر آخر میں اسے کیا ہاتھ آیا، محض دولت کا کچھ نقصان لیکن شہرت وساکھ کو ایک قابلِ ذکر نقصان برداشت کرنا پڑا۔ ان آٹھ صدیوں کے دوران برطانوی حکمت عملی کامیاب رہی کیونکہ زمیندار امیر ہو گئے جبکہ کسانوں کو بھوک کا سامنا کرنا پڑا۔

ان حالات میں جہاں اپنے نظریات وخیالات کی تبلیغ وترویج کی آزادی، ایک انفرادی فرد کے لئے دلچسپی کا باعث ہو، وہاں پر یا تو متشدد انقلاب برپا ہوتا ہے، اور یا پھر مزید آزادی کا حق تسلیم کر لیا جاتا ہے، یعنی عوام کے ایک حکومت کا انتخاب کرنے کا حق سندِ قبولیت حاصل کر لیتا ہے۔ یہ حق جمہوریت اور بے اطمینان عوام کی طرف سے آزادی رائے سے مشروط ہے، مختصراً یہ کہ جو حق انقلاب کے ذریعے حاصل ہو سکتا تھا، اسے پُرامن طور پر حاصل کیا جائے۔ یہ ایک بہت ہی اہم حق ہے اور اس کی قبولیت دنیائے امن کے لئے نہایت ضروری ہے لیکن یہ امر اپنے نظریے کی کھلی تبلیغ وترویج سے کہیں ماورا ہے۔

اب ہمیں ایک سرگرم اور جوشیلے مخترع کے نقطۂ نظر پر غور کرنا چاہیے۔ ہم اس کے نقطۂ نظر کو ان حالات کے مترادف کہہ سکتے ہیں جو کانسٹنٹین (Constantine) سے قبل مسیحیت کے تھے، لُوتھر (Luther) کے زمانے میں پروٹسٹنٹ (Protestant) کے تھے، اور جس طرح کے حالات میں آج کمیونسٹ موجود ہیں، یہ لوگ آزادی رائے وتقریر کے کم ہی طرفدار تھے۔ جس طرح وہ خود موت قبول کرنے کے لئے آمادہ وتیار رہتے تھے، بالکل اسی طرح وہ دوسروں کو بھی موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ماضی میں پُرعزم اور بہادر

افراد حکومتوں کے خلاف کھلے عام اظہار رائے کا مظاہرہ کر دیتے تھے۔ بہر حال، جدید زمانے میں موجودہ حکومتیں زیادہ ہوشیار اور چالاک ہیں، اور وہ شاید بنیادی اختراعات کا وقوع ناممکن بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ بصورت دیگر جنگ کے باعث انقلاب بلکہ افراتفری اور ابتری بھی رونما ہو سکتی ہے۔ جو شاید کچھ نئے حالات اور صورت حال پر منتج ہو۔ اس بنیاد پر کچھ کمیونسٹ آئندہ جنگ کی امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔

اصولی لحاظ سے ایک سرگرم اور جوشیلہ مخترع، ہزار سالہ تاریخ پر یقین رکھتا ہے۔ اس کا موقف ہے کہ وہ ہزاروی ضرور آئے گی جب دنیا کے تمام لوگ اس کے نظریے اور عقیدے کو اختیار کر لیں گے۔ اگر چہ وہ موجودہ زمانے میں ایک انقلابی ہے، مستقبل میں وہ ایک قدامت پسند ہو سکتا ہے، اور جب وہ ایک مکمل طور پر ایک نظریہ اور عقیدہ اختیار کر لیتا ہے تو پھر وہ اپنے اس عقیدے اور نظریے میں کسی بھی قیمت پر تبدیلی نہیں کرتا۔ ان نظریات وعقائد کے ساتھ وہ فطری طور پر، ایک مکمل حیثیت اختیار کرے یا اپنے آپ کو بھٹکنے سے محفوظ رکھنے کے لئے وہ تشدد آمیز رویے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، جب وہ حزب اختلاف میں آتا ہے تو وہ ایک دہشت گرد ہوتا ہے، لیکن جب وہ اقتدار میں ہوتا ہے تو ستم ظریف اور ایذا رساں بن جاتا ہے۔ تشدد پر اس کے یقین کے باعث اس کے مخالفین میں بھی یہی جذبہ ویقین پیدا ہو جاتا ہے: جب وہ حکومت میں ہوں گے تو اسے اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنائیں گے اور جب وہ حزب مخالف میں ہوں گے تو وہ اس کے قتل کی منصوبہ بندی کریں گے۔ اس لئے اس کی ہزاروی، ہر شخص کے لئے قطعی طور پر خوشگوار ہوتی ہے، وہ جاسوس ہوں گے، انتظامیہ کے ذریعے گرفتاریاں بھی ہوں گی، اور جنگی قیدیوں کے کیمپ بھی ہوں گے۔ لیکن ٹرٹولین (Tertullian) (لاطینی زبان میں پہلا عیسائی مصنف) کے مانند اسے ان حالات میں کوئی نقصان اور ضرر محسوس نہیں ہوتا۔

یہ سچ ہے کہ ایسے شریف قسم کے لوگ بھی موجود ہیں جو ہزار سالہ تاریخ پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی اس دنیا میں موجود ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کی اچھی فطرت اس کے اندر سے ابھرنی چاہئے، اور اسے کسی بیرونی طاقت کے ذریعے مسلط نہیں کیا جا سکتا۔ اس نظریے اور عقیدے کے لئے "سوسائٹی آف فرینڈز" (Society of Friends) کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ ایسے لوگ بھی اس دنیا میں موجود ہیں جن کا یہ خیال ہے کہ جب وہ خیراتی اور بہبودی رویہ

اپناتے ہیں اور عقلمندی کے ساتھ کوشش کرتے ہیں تو پھر بیرونی اثر ورسوخ اہم ہوسکتا ہے، لیکن اس پر بیرونی اثر ورسوخ اہم نہیں ہوسکتا جب وہ ایک قید خانے یا سزائے موت کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ بعض لوگ سرگرم اور جوشیلے مخترع ہونے کے باوجود اپنے نظریے اور عقیدے کی آزاد تبلیغ وترویج کے قائل ہوسکتے ہیں۔

مزید برآں، ایک دوسرا مخترع بھی ہوسکتا ہے، جو اس وقت موجود رہتا ہے جب ارتقاء ایک رواج کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اس قسم کے حالات میں سورل (Sorel) (فرانسیسی محقق) اپنے دورِ انجمن میں اسی قسم کا ہوسکتا ہے۔ اس قسم کے افراد کا یہ نظریہ اور موقف ہے کہ ایک قابلِ فہم اور قابلِ تشریح مقصد کی خاطر نہیں، کسی بھی ایسے احساس کی خاطر نہیں جسے ترقی سے قبل واضح طور پر بیان کیا جاسکتا ہے، بلکہ کسی ایک مقصد کی خاطر جب حاصل کردہ ہر قدم پیشگی معلوم ہو تو پھر زندگی مستقل طور پر ارتقاء پذیر ہونی چاہئے۔ نہ دیکھنے سے بہتر ہے کہ دیکھ جائے، اور نہ بولنے سے بہتر ہے کہ اپنی رائے اور موقف کا اظہار کیا جائے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جب تک تمام جانور اندھے ہوتے تھے تو ان کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ اپنی اصلاح اور آزادی کے ضمن میں بینائی کے حصول کا مطالعہ کرتے۔ بہرحال ماضی کے تجربات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ حقیقت کہ آئندہ قدم کے باعث یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ ایک جامد وساکت قدامت پرستی ایک غلطی ہوتی۔ اس لئے جیسا کہ یہ دلیل دی گئی ہے کہ تمام قسم کی اختراعات اور ایجادات کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے خواہ ہم ان میں سے کسی کے متعلق نہ بھی جان سکیں، جو کسی بھی قسم کی ارتقاء اور ترقی کا احاطہ کئے ہوئے ہوں گی۔

بلاشبہ اس نقطہ نظر میں سچائی کا عنصر موجود ہے لیکن یہ نقطہ نظر ایسا ہے جو سطحی معرفت کی ترقی میں باآسانی نشوونما پاتا ہے اور خود میں موجود ابہام اور نامعقولیت کے باعث اسے عملی سیاست کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ تاریخ عالم کے لحاظ سے اہمیت کے حامل موجدون کا موقف یہ ہے کہ وہ اپنی بلاخیز جدوجہد کے ذریعے جنت کی سلطنت حاصل کرسکتے ہیں، اور وہ اسے اکثر حاصل کرنے میں کامیاب بھی رہے ہیں لیکن یہ ثابت ہوچکا ہے کہ یہ جنت کی سلطنت نہیں ہے۔

اب میں آزادی رائے اور تقریر کے علاوہ اپنے نظریے کی تبلیغ وترویج کی آزادی کے حوالے سے ایک فلسفی کے نقطہ نظر کی طرف آتا ہوں۔ قدیم زمانے میں موجود قوت برداشت کو بیان کرتے ہوئے گبن لکھتا ہے "رومی دور میں رائج عبادت کرنے کے مختلف طریقوں کو تمام شعبہ ہائے زندگی

کے لوگ سچ سمجھتے تھے، لیکن فلسفی انہیں غلط سمجھتے تھے اور مجسٹریٹوں کی نظروں میں یہ طریقے قطعی مفید اور معقول تھے۔" جو فلاسفر جو اس وقت ہمارے ذہن میں موجود ہے، بہر حال یہ نہیں کہے گا کہ تمام مروجہ عقائد اور نظریات سب ایک ہی جیسے غلط اور نامعقول ہیں، لیکن وہ یہ نہیں کہے گا کہ کوئی بھی نظریہ اور عقیدہ جھوٹ اور نامعقولیت سے پاک ہے، اور کبھی کبھار ایسا ہو بھی جاتا، اس بہترین اور احسن حقیقت کو مختلف انسانی دماغوں کے ذریعے دریافت کیا جا سکتا تھا۔ غیر فلسفیانہ نظریے اور عقائد کی تبلیغ و پرچار کرنے والے لوگوں کی نظر میں، اس کی اپنی رائے اور موقف موجود ہے، جو سچائی پر مبنی ہے، اور اس کا مخالف رویہ اور نظریہ جھوٹ پر مبنی ہے۔ اگر وہ ان دونوں نظریات وعقائد کی آزاد تبلیغ و پرچار پر یقین رکھتا ہے، اس کی وجہ صرف یہ خدشہ اور خوف ہے کہ شاید اس پر بھی پابندی اور ممانعت عائد ہو جائے۔ ایک فلسفیانہ نقطہ نظر کے لحاظ سے یہ معاملہ اس قدر سادہ اور سہل نہیں ہے۔

ایک فلسفی کے لئے اپنے نظریئے اور عقیدے کی تبلیغ اور پرچار کے کیا کیا فوائد اور استعمال ہو سکتے ہیں۔ مٹھائیاں بنانے والے کارخانے اس لئے قائم کئے جاتے ہیں کہ مٹھائیاں تیار کی جائیں اور رائے، نظریات اور عقائد بنانے والے کارخانے اس لئے قائم کئے جاتے ہیں کہ رائیں، نظریات اور عقائد تیار کئے جا سکیں۔ اگر تیار کی ہوئیں رائیں، نظریات اور عقائد دو مٹھائیوں کے مانند ہیں، تو پھر کس طرح معلوم کیا جائے یہ رائیں، نظریات اور عقائد صحیح، درست اور اچھے ہیں؟ اور پھر اگر وسیع پیمانے اور تعداد میں تیار کی جانے والی مصنوعات جو اجارہ داری کے ذریعے ممکن ہوتی ہیں، چھوٹے پیمانے اور تعداد میں تیار ہونے والی حریف اداروں کی مصنوعات سے سستی ہوتی ہیں، تو پھر کسی بھی طرح کا معاملہ ہو، اجارہ داری کے قیام کے لئے یہی وجہ ہوتی ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ مٹھائی تیار کرنے والے حریف کارخانے کے مانند، رائے، نظریہ اور عقیدہ تیار کرنے والا ایک حریف کارخانہ، عام طور پر وہ رائے، عقیدہ اور نظریہ تیار نہیں کرتا، جو اچھا اور معقول ہو سکتا ہے۔ یہ کارخانہ یہ رائیں، نظریات اور عقائد تیار کرتا ہے جن کا مقصد میرے کارخانے میں تیار ہونے والی رائیوں، عقائد اور نظریات کو تباہ کرنا ہوتا ہے، اور اس طرح لوگوں کو زیادہ سے زیادہ مصنوعات فراہم کرنے کے لئے کارخانے میں کام بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ اس لئے حریف کارخانوں کو بند کر دینا چاہئے۔ اب میں کہتا ہوں کہ اس اصول کو ایک فلسفی اپنے نقطہ نظر کی حیثیت سے اختیار نہیں کر سکتا۔ اسے محض یہی سمجھنا چاہئے کہ کوئی بھی مفید اور کارآمد مقصد جو

تبلیغ و پرچار کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، لازمی طور پر ایک یقینی غلط رائے اور موقف کی وجہ نہیں ہوتی ہے جس کو نہایت شدت کے ساتھ اپنایا جاتا ہے، لیکن اس کے برعکس رائے، نظریے اور عقیدے کی تبلیغ و پرچار، منطقی شکوک وشبہات اور مخالفانہ نظریات وعقائد کی اہمیت معلوم کرنے کی صلاحیت پر مبنی مقصد کو صرف اس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے جب رائے، نظریے اور عقیدے کی تبلیغ و پرچار میں مسابقت اور حریفانہ جذبہ موجود ہو۔ وہ عوام الناس کا تقابل ایک جج کے ساتھ کرے گا جو دونوں فریقین کے وکیلوں کے موقف کو سنتا ہے، اور یہ فیصلہ کرے گا کہ رائے، نظریے اور عقیدے کی تبلیغ و پرچار میں مسابقت اسی طرح فضول اور بے معنی ہے جس طرح ایک فوجداری مقدمے کی سماعت کے دوران، صرف استغاثے یا مستغیث کے موقف ہی کو سننے کی اجازت ہوتی ہے۔ جہاں تک نظریے، عقیدے اور رائے کی تبلیغ و پرچار میں مطلوبہ یکسانیت اور مطابقت کا تعلق ہے، وہ یہی کہے گا کہ جہاں تک ممکن ہو، ہر شخص کو تمام فریقین کے تمام سوالات سننے چاہئیں۔ مختلف اخبارات، جو ایک جماعت کے مفادات کی تبلیغ و پرچار کے لئے وقف ہوتے ہیں اور وہ اپنے قارئین کے لئے اپنے مخصوص نظریات کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، ان کے بجائے وہ چاہے گا کہ صرف ایک ہی اخبار موجود ہو جس میں تمام جماعتوں کی نمائندگی موجود ہو۔

بحث ومباحثہ کی آزادی کہ جس کے علمی فوائد نہایت ہی واضح ہیں، ضروری نہیں کہ اس میں بھی حریف ادارے ملوث ہوں۔ بی بی سی پر مختلف نظریات پیش کرنے کی اجازت ہے۔ رائل سوسائٹی (Royal Society) میں مختلف مخالفانہ سائنسی نظریات پیش کئے جا سکتے ہیں۔ علمی اور فاضلانہ ادارے عام طور پر اجتماعی طور پر اپنے اعتقادات ونظریات کی ترویج وتبلیغ کے لئے مسابقت میں ملوث نہیں ہوتے لیکن اپنے ارکان کو یہ موقع دیتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ اپنے خیالات ونظریات کی حمایت میں بڑھ چڑھ کر اظہار رائے کریں، بحث ومباحثہ کریں، ایک دوسرے کو تنقید کا نشانہ بنائیں، اور ایک دوسرے سے مسابقت پر مبنی رویہ اور طرز عمل اپنائیں۔ ایک واحد ادارے اور تنظیم کے اندر اس قسم کی گفتگو اور بات چیت اس امر کا پیشگی اشارہ ہوتی ہے کہ ان کے درمیان بنیادی طور پر رضامندی اور آمادگی موجود ہے۔ کوئی بھی ماہر مصریات ایک فوج کو یہ نہیں کہے گا کہ اس کے اس حریف ماہر مصریات کو ہلاک کر دے جس کے نظریات اور خیالات اسے پسند نہیں ہیں۔ جب ایک ملک میں اس کے انداز حکومت اور اگر ممکن ہو تو آزادانہ رائے دہی

کے بارے مطابقت وموافقت موجود ہو، لیکن جہاں کہیں اس قسم کی مطابقت وموافقت موجود نہ ہو تو پھر قوت کے استعمال سے پہلے تبلیغ و پرچار کی اہمیت مُسلّم ہے، اور جن افراد کے پاس طاقت وقوت موجود ہوتی ہے تو قدرتی طور پر وہ یہ چاہتے ہیں کہ انہیں اپنے نظریے اور عقائد کی تبلیغ و پرچار میں اجارہ داری حاصل ہو۔ اظہار رائے، اپنے عقیدے اور نظریے کی تبلیغ و پرچار اس وقت ممکن ہوتا ہے جب اختلافات اس نوعیت کے نہ ہوں کہ وہ ایک حکومت کے تحت قائم شدہ امن وسکون کو ناممکن بنا دیں۔ سولہویں صدی میں پروٹسٹنٹ (Protestant) اور کیتھولک (Catholic) ایک دوسرے کے ساتھ سیاسی طور پر تعاون نہیں کر سکے تھے، لیکن اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں میں وہ باہمی طور پر تعاون کر سکتے تھے کیونکہ اس عرصے کے دوران مذہبی رواداری ممکن ہو چکی تھی، علمی وفکری آزادی کے لئے ایک مستحکم حکومتی ڈھانچہ بہت ضروری ہے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ عنصر ظلم وستم اور استبداد کے لئے سب سے بڑا اور کارآمد حربہ اور طریقہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اس مشکل کے حل کا زیادہ تر انحصار اندازِ حکومت پر ہے۔

پندرھواں باب

اقتدار اور اخلاقی ضابطہ ہائے اخلاقیات

زمانہ قدیم سے ہی حُسنِ عمل اور اخلاق دو مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ یہ ایک ایسا سماجی اور معاشرتی ادارہ ہے جو قانون کی مثل ہے، اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ انسانی ضمیر کے ذاتی معاملے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اول الذکر پہلو کے اعتبار سے یہ اقتدار و اختیار کے نظام کا ایک حصہ ہے، اور موخر الذکر پہلو کے اعتبار سے عام طور پر اس کی نوعیت انقلابی ہوتی ہے۔ اس کا وہ پہلو جو قانون کے مثل ہے، اسے ''مثبت اخلاق'' اور دوسرے پہلو کو ''ذاتی اخلاق'' کہتے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ اس باب کے ذریعے میں، ان دونوں پہلوؤں کا ایک دوسرے کے ساتھ، نیز، ان دونوں پہلوؤں کا اقتدار و اختیار کے ساتھ تعلق کے بارے ذکر کروں۔

مثبت اخلاق، ذاتی اخلاق سے کہیں قدیم تر ہے اور شاید قانون اور حکومت سے بھی زیادہ پُرانا ہے۔ بنیادی طور پر یہ قبائلی روایات و رسوم پر مشتمل ہے کہ جن میں سے یہ آہستہ آہستہ ارتقاء پذیر ہوتا ہے۔ کون کس کے ساتھ شادی کر سکتا ہے، ان جیسے غیر معمولی واضح طور پر بیان کردہ اصول و قوانین پر غور کیجئے جو تمام ابتدائی اور قدیم وحشی انسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ ہمارے نقطہ نظر کے مطابق، یہ محض اصول و قوانین محسوس ہوتے ہیں لیکن ان کے لئے فرضی اور قیاسی معلوم ہوتے ہیں جو انہیں اس لحاظ سے قبول کر لیتے ہیں کہ ان میں بھی وہی اخلاقی اضطراری اور جبری قوت و طاقت موجود ہے جس طرح ہم اپنے سگے ترین عزیزوں اور محرموں کے ساتھ جنسی تعلق یا ارتکاب کے خلاف قانون کے متعلق سوچتے ہیں۔ بظاہر مثبت اخلاق کے اس حصے کا معاشرتی عدم مساوات کے ساتھ تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ نہ تو یہ غیر معمولی طاقت و قوت بخشتا ہے اور نہ ہی اپنی موجودگی پر توجہ دیتا ہے۔ ان کا مخرج اور ماخذ واضح نہیں ہے، لیکن بلاشبہ

کسی نہ کسی طرح مذہب سے میل کھاتا ہے۔ اس قسم کے اخلاقی اصول ابھی تک مہذب اور شائستہ لوگوں میں موجود ہیں۔ رومی کلیسا کے مطابق ایک معنوی باپ کی اپنے بچے/بچی کے ساتھ شادی نہیں ہوسکتی، یہ ایک ایسی پابندی ہے جو کسی بھی اچھے یا برے معاشرتی مقصد کی تکمیل نہیں کرتی لیکن اس کا مخرج صرف اور صرف دینی اور مذہبی نظریات وتصورات ہی میں پوشیدہ ہے۔ اب ہمیں متوقع طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ قومی اعتبار اور لحاظ سے ہم اس وقت جن پابندیوں اور حدود وقیود کو قبول کئے بیٹھے ہیں، بنیادی طور پر مافوق الفطرت نوعیت کی حامل تھیں۔ قتل، کرائے کے قاتل کی جارحیت پسندی کے باعث قابلِ اعتراض تھا، جو نہ صرف قاتل کی طرف منتقل کی گئی، بلکہ اس کے ملک اور معاشرے کی طرف بھی منتقل کی گئی۔ اس لئے وہ معاشرہ اس معاملے میں دلچسپی لیتا ہے بلکہ معاشرے کا اس معاملے کے ساتھ اس لئے تعلق ہے کہ باقی وہ اس معاملے کے ساتھ ''سزا دینے'' یا ''پاک کردینے کی تقریبات'' کے ذریعے نمٹ سکتے تھے۔ رفتہ رفتہ گناہوں سے پاک کردینے کا عمل دینی اور مذہبی طور پر اہمیت اختیار کرگیا ہے جسے توبہ اور معافی، ہرگز ردعفو کی پہچان حاصل ہوگئی لیکن اس کے بنیادی روایتی کردار کو ابھی تک ''بھیڑ کے خون میں دھویا ہوگا'' کے محاورے کے ذریعے یاد کیا جاتا ہے۔

مثبت اخلاق کا یہ پہلو جس طرح اہم ہے، اس کی نوعیت وہ نہیں ہے جس کو میں اپنے زیرِغور لانا چاہتا ہوں۔ بلکہ میں تو ان تسلیم شدہ اور مستند اخلاقی ضابطوں کے پہلوؤں کو زیرِ بحث لانا چاہتا ہوں جن کے ذریعے وہ اقتدار واختیار کا انتظام واہتمام کرتے ہیں۔ ان کا ایک مقصد یہ بھی ہے جسے ہم زیادہ تر محسوس نہیں کرتے کہ روایتی اخلاقی نظام کے ذریعے موجودہ سماجی اور معاشرتی نظام کو کام کرنے دیا جائے۔ پولیس کی طاقت کے برعکس یہ اپنا مقصد کامیاب ہونے کی صورت میں نہایت آسانی اور موثر طریقے کے ذریعے حاصل کرلیتا ہے لیکن اس کا انحصار اس انقلابی اخلاقیات کے سامنے ہونے پر ہے جو اقتدار واختیار کی ازسرِنو تقسیم کی خواہش کے باعث وجود میں آتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس باب کے ذریعے، سب سے پہلے اخلاقی ضابطوں پر اقتدار واختیار کے اثرات پر غور کروں، اور پھر اس سوال کو موضوع گفتگو بنایا جائے کہ اخلاقیات کے لئے کیا مزید دیگر بنیاد اور ماخذ کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔

اقتدار واختیار پر مبنی اخلاقیات کی سب سے واضح اور بہتر مثال، اطاعت گزاری اور

فرمانبرداری کا معمول ہے۔ بچوں کا فرض اور ذمے داری ہے کہ وہ والدین کی اطاعت اور فرمانبرداری کریں، خاوندوں کے حکم سے بیویاں سرتابی نہ کریں، خادم اپنے آقاؤں کے ہر حکم کو تسلیم کریں، رعایا شہزادوں کے آگے سر تسلیم خم کریں اور مذہبی معاملات میں ایک ناخواندہ اور لاعلم شخص علماء کے کہنے پر چلے، ان کے علاوہ بھی فوج اور مذہبی اداروں میں خاص ذمہ داریاں اور فرائض موجود تھے۔ ان میں سے ہر ذمہ داری اور فرض، متعلقہ اداروں کے اعتبار سے ایک طویل تاریخی نوعیت کا حامل ہے۔

سب سے پہلے ہم فرزندانہ (بیٹے یا بیٹی) اطاعت و فرمانبرداری کے معاملے پر غور کرتے ہیں۔ موجودزمانے میں بھی ایسی وحشی اولاد موجود ہے کہ جب ان کے والدین اس قدر ضعیف ہو جاتے ہیں کہ کام کرنے کے قابل نہیں رہتے تو ان کی اولاد انہیں آدم خوروحشیوں کے ہاتھ فروخت کر دیتی ہے۔ تہذیب کے ارتقاء کے دوران کسی بھی مرحلے پر ایک غیر معمولی دوراندیش شخص کے ساتھ یہ واقعہ پیش آنا چاہئے کہ جب ابھی اس کے بچے ابھی جوان ہی ہوں، ان کے ذہن میں یہ خیال اور تصور پیدا کر دے کہ وہ اسے ضعیف العمری میں بھی زندہ رکھیں، اور شاید یہ وہ شخص ہو جس نے اپنے والدین کے ساتھ حسب معمول وہی سلوک کیا ہو اور انہیں بوڑھے ہونے پر آدم خوروں کے ہاتھ فروخت کر دیا ہو۔ اپنے انقلابی نظریات وخیالات کی حمایت کے لئے ایک جماعت تخلیق کرتے ہوئے مجھے شک ہے کہ اس نے دوراندیشی پر مبنی رویہ اپنایا ہو۔ مجھے شک ہے کہ اس نے کبھی انسانی آزادی کا اظہار اور دعویٰ کیا ہو، جو محض پھلوں کو اپنی خوراک بنانے کے باعث فائدہ اٹھائیں، اور ان ضعیف العمر افراد کی اخلاقی الزام تراشی جنہوں نے اپنے بچوں کی پرورش کے لئے محنت کرتے ہوئے خود کو توڑ پھوڑ لیا ہو۔ شاید کسی وقت ایک کمزور، لاغر لیکن غیر معمولی دانا ضعیف شخص بھی تھا، جس کی نصیحت اس کے گوشت سے زیادہ قیمتی اور اہم ثابت ہوئی تھی۔ بہرحال کسی بھی موقعے پر یہ محسوس کیا جا سکتا تھا کہ ایک شخص کے والدین کو آدم خوروں کے حوالے کرنے کے بجائے انہیں عزت واحترام مہیا کرنی چاہئے۔ ہمارے لئے قدیم تہذیب میں باپوں کے لئے عزت واحترام کچھ مبالغہ آرائی پر معلوم ہوتی ہے لیکن تاریخ میں اس قسم کا کوئی واقعہ موجود نہیں ہے کہ انسانوں کو آدم خوروں کے حوالے کرنے کے نفع بخش کاروبار کو ختم کرنے کے لئے ایک زبردستی مزاحمتی قدم کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ اور پھر ہمیں ان دس احکامات کے متعلق علم ہوتا ہے جن

کے ذریعے یہ بتایا جاتا ہے کہ اگر آپ اپنے باپ اور ماں کی عزت وتکریم کرنے میں ناکام ہو گئے تو تمہیں جوانی ہی میں موت آ جائے گی، رومی پدر کشی کو سب سے بھیانک جرم سمجھتے تھے اور کنفیوشس کے نزدیک اولاد کی طرف سے فرمانبرواری، اخلاقیات کی بنیاد ہے۔ بہر حال یہ تمام کچھ ایک ایسا جبلی اور لاشعوری طریقہ ہے جس کے ذریعے پدرانہ قوت و طاقت کو اس ابتدائی زمانے کے مقابلے میں طول بخشا جا سکتا ہے جب بچے بے بس ہوتے ہیں۔ بلا شک وشبہ، والدین کے اختیار کو جائیداد کی ملکیت کے باعث تقویت بخشی جا سکتی ہے، لیکن اگر فرزندانہ اطاعت موجود نہ ہوتی تو پھر نوجوان بچے اپنے باپوں کو ضعیف اور کمزور ہونے کے بعد اپنے گھرانوں اور خاندانوں پر قابو حاصل کرنے کی اجازت نہ دیتے۔

عورتوں کی طرف سے بھی اطاعت اور فرمانبرداری کے ضمن میں اسی قسم کی صورت وقوع پذیر ہوئی۔ اکثر اوقات تو جانوروں کی برتر قوت، مادہ جانوروں کے لئے مسلسل اور متواتر اطاعت گزاری اور فرمانبرداری کا باعث نہیں ہوتی کیونکہ اپنے مقصد کے حوالے سے نر جانوروں میں مناسب طویل المدت ثابت قدمی اور استقلال نہیں ہوتا۔ انسانوں میں عورتوں کی طرف سے اطاعت گزاری اور فرمانبرداری، وحشی انسانوں کے مقابلے میں بعض تہذیبی سطحوں پر زیادہ قطعیت کے ساتھ موجود ہوتی ہے اور یہ اطاعت گزاری وفرمانبرداری ہمیشہ اخلاقیات کے ذریعے تقویت حاصل کرتی ہے۔ ایک شخص یہ کہتا ہے کہ فلاں نیک اور پرہیز گار شخص (ولی اللہ) اللہ تعالیٰ کی شان وشوکت کا مظہر ہے لیکن ایک عورت، اپنے خاوند کی شان وشوکت کی مظہر ہوتی ہے۔ مرد، عورت کی شان وشوکت کا مظہر نہیں ہے لیکن عورت، مرد کی شان وشوکت کی مظہر ہے۔ مرد، عورت کے لئے تخلیق نہیں کیا گیا بلکہ عورت مرد کے لئے تخلیق کی گئی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ بیویوں کو ہر قیمت پر اپنے خاوندوں کی اطاعت کرنا ہوگی اور عدم وفاداری، ایک خاوند کی نسبت بیوی کے لئے زیادہ بدترین گناہ ہے، اور یہ امر بھی قطعی سچ ہے کہ مسیحیت کے مطابق نظریاتی طور پر، زنا کاری اور حرام کاری دونوں، بیوی اور خاوند کے لئے یکساں گناہ ہے، کیونکہ یہ خدا کے خلاف گناہ ہے۔ مگر یہ نقطہ نظر عملی طور پر کارفرما نہ تھا اور قبل از مسیحیت کے دور میں بھی یہ رائج نہ تھا۔ ایک شادی شدہ خاتون کے لئے حرام کاری اس کے لئے ذلت اور رسوائی کا باعث تھی کیونکہ یہ عمل اس کے خاوند کے خلاف ایک جرم اور جارحانہ اقدام تھا۔ لیکن کنیزیں اور جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتیں ان

کے آقاؤں کی قانونی ملکیت تھیں اور ان سے صحبت کرنے سے ان پر کوئی الزام نہیں آتا تھا۔ حتیٰ کہ انیسویں صدی کے امریکا میں غلاموں کے مالک نیک اور پرہیزگار مسیحی اسی موقف پر قائم تھے حالانکہ ان کی بیویاں ایسا نہیں سمجھتی تھیں۔

مردوں کے لئے اخلاقی ضابطوں اور عورتوں کے لئے اخلاقی ضابطوں کے درمیان فرق، ظاہری طور پر مردوں کی برتری کے باعث تھا۔ بنیادی طور پر یہ برتری صرف جسمانی طاقت کے باعث تھی لیکن اسی کی بنیاد پر یہ برتری آہستہ آہستہ معاشی، سیاسی اور مذہبی برتری تک جا پہنچی۔ اس معاملے میں پولیس پر اخلاقی لحاظ سے برتری، اسی حالیہ دور تک عورتوں کے لئے صحیح طور پر ایک اخلاقی حکم اور فرمان سمجھا جاتا تھا جو مردانہ برتری پر محیط تھا، اور اس لئے اس کی پابندی کچھ ایسی ضروری نہ تھی جیسے کہ یہ دوسری صورت میں ضروری ہوتی۔

ایک قانون ساز کے نقطہ نظر کے مطابق عورتوں کی بے وقعتی اور عدم اہمیت کے ضمن میں ضابطہ ہیمورِبی (Code of Hammorabi) کے ذریعے ایک دلچسپ مثال سامنے آتی ہے۔ اگر ایک شخص ایک شریف آدمی کی بیٹی کو مارتا ہے جب وہ حاملہ ہوتی ہے اور وہ مر جاتی ہے، تو پھر حکم اور فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ جس شخص نے بیٹی کو مارا، اس کی بیٹی کو بھی ہلاک کر دیا جائے۔ اس شریف آدمی اور مارنے والے شخص کے درمیان تعلق کے لحاظ سے یہ اصول نہایت ہی منصفانہ ہے، جس کی بیٹی کو قتل کیا گیا وہ موخر الذکر شخص کی محض ملکیت تھی، اور اسے صرف اپنی زندگی کے حوالے سے کسی پر کوئی دعویٰ نہیں ہو سکتا تھا اور اس شریف آدمی کی بیٹی کو ہلاک کرنے کے ضمن میں، ہلاک کرنے والا شخص، اس عورت (بیٹی) کے خلاف جرم کا مرتکب نہیں، بلکہ شریف آدمی کے خلاف جرم کا مرتکب ہوا تھا۔ بیٹیوں کو کسی بھی قسم کے کوئی حقوق حاصل نہ تھے کیونکہ ان میں کسی بھی قسم کی طاقت و قوت موجود نہ تھی۔

جارج اول تک بادشاہ، مذہبی عزت و تکریم کے حامل اور مستحق تھے۔

اس شہنشاہ کی ذات میں
کوئی خاص روحانی تاثیر ہے
کہ جب بھی غدار یا باغیانہ عناصر
سر اٹھاتے ہیں

بادشاہ ان منصوبوں کو بھانپ لیتا ہے
اور دشمن اپنے مذموم ارادہ میں
مطلوبہ کامیابی حاصل نہیں کر پاتا

عوامی جمہوریتوں میں لفظ ''بغاوت'' ابھی تک گناہگاری کے مفہوم میں لیا جاتا ہے۔ انگلستان میں حکومت ''شاہی'' روایت اور معمول کے ذریعے بہت زیادہ فائدہ حاصل کرتی ہے۔ وکٹوریائی مدبر اور سیاست دانوں، حتیٰ کہ گلیڈ سٹون نے بھی ملکہ کے لئے انجام دیئے جانے والے فرائض کے ضمن میں یہ خیال رکھا کہ وہ کسی وزیر اعظم کی موجودگی کے بغیر نہ رہے۔ بااختیار ادارے یا شخص کے سامنے فرائض اور ذمہ داریاں انجام لانے کے عمل کو ابھی تک ایک خود مختار اور آزاد ملک کے لئے فرائض اور ذمہ داریاں انجام دینے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایک تنزل پذیر جذبہ ہے، لیکن جب اس میں تنزل واقعہ ہوتا ہے، لیکن اس کی تنزل پذیری کے باعث حکومت کم مستحکم ہوتی ہے اور پھر دائیں یا بائیں بازو کی آمریت کا امکان زیادہ ہو جاتا ہے۔

بیگی ہاٹ (Bagehot) کی تصنیف ''انگلستان کا آئین'' (English Constitution) ایک ایسی کتاب ہے جو ابھی تک قابلِ مطالعہ ہے اور اس میں شہنشائیت کے متعلق بحث و مباحثے کا آغاز یوں ہوتا ہے:

''ایک پُر وقار اور پُر شکوہ منصب کے لحاظ سے، ملکہ کا استعمال نا قابلِ پیمائش ہے اور نا قابلِ یقین ہے۔ اس کے بغیر انگلستان کی موجودہ حکومت ناکام ہو جاتی اور گر جاتی۔ اکثر لوگ جب یہ پڑھتے ہیں کہ ملکہ نے ونڈسر کی ڈھلانوں پر چہل قدمی کی، پرنس آف ویلز ڈربی چلا گیا، تو پھر انہوں نے یہ تصور کیا کہ معمولی اشیاء کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی۔ لیکن یہ لوگ غلطی پر ہیں اور اس امر کا ادراک بہت ہی اچھا ہوگا کہ ایک ریٹائر بیوہ اور ایک بیروزگار نوجوان کے اقدامات کس طرح اس قدر اہمیت اختیار کر گئے۔

شہنشائیت کیوں اس قدر طاقت ور حکومت ہے، اس کی بہترین اور معقول ترین وجہ یہ ہے کہ یہ ایک قابلِ فہم اور قابلِ ادراک حکومت ہوتی ہے۔ عوام کی اکثریت اسے قبول کرتی ہے اور اس کا ادراک رکھتی ہے اور

وہ دنیا میں کسی اور نظام کو اس کی نسبت بمشکل ہی سمجھتے اور قبول کرتے ہیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انسانوں پر ان کے تصورات غالب آ جاتے ہیں، لیکن یہ امر اس سے بھی زیادہ سچا اور درست ہے کہ ان پر ان کے تصورات کی کمزوریاں غالب آ جاتی ہیں۔"

یہ نظریہ حقیقت بھی ہے اور اہم بھی ہے۔ شہنشائیت کے باعث معاشرتی میل جول آسان ہو جاتا ہے، پہلے اس طرح کہ محض علامت اور سائے کی نسبت ایک فرد کے لئے وفاداری اس قدر مشکل نہیں ہے، اور دوسرے یہ کہ بادشاہت کے سبب اپنی طویل تاریخ کے تناظر میں، اسے عزت و تکریم حاصل ہے جو کسی بھی نئے ادارے کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ جہاں جہاں بھی موروثی شہنشائیت زوال پذیر ہوئی تو تھوڑے عرصے یا زیادہ عرصے کے بعد فرد واحد کی حکومت کی کسی بھی صورت میں اسے کامیابی نصیب ہوئی۔ اس ضمن میں یونان کی استبدادی حکومت، رومی سلطنت، انگلستان میں کرومویل کی حکومت، فرانس میں نپولین کی حکومت اور حالیہ عہد میں سٹالن اور ہٹلر کی مثال دی جا سکتی ہے۔ اس قسم کے افراد کو یہ احساس ورثے میں ملا تھا جو اس سے پہلے شاہی حکومت سے منسلک تھا۔ اس امر سے آگاہی بہت ہی دلچسپ ہے کہ روسی مقدمات کے دور میں مجرموں کی طرف سے اعترافات کے تناظر میں ایک حکمران کے سامنے وفاداری اور اطاعت گزاری پر مشتمل اخلاقی ضابطوں کی قبولیت بہت زیادہ قدیم اور مکمل شہنشائیت کی روایت کے لحاظ سے مناسب اور معقول ہو گی۔ لیکن ایک نئے آمر کے لئے جب تک وہ کوئی بہت زیادہ غیر معمولی حیثیت نہیں رکھتا، عوام الناس کی طرف سے وہ تقدیس و تکریم حاصل نہیں کر سکتا جو ماضی میں موروثی شہنشاہوں کو حاصل تھی۔

بادشاہت کی صورت میں، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، مذہبی عنصر بہت حد تک اقتدار و اختیار میں دخل دیتا ہے۔ حتیٰ کہ بہر حال یہ اس معاشرتی نظام کے لئے استحکام کا باعث بنتا ہے جس کی بادشاہ علامت ہوتا ہے۔ یہ صورت حال بہت سے مہذب ممالک انگلستان اور جاپان میں واقع ہو چکی ہے۔ انگلستان میں یہ نظریہ کہ بادشاہ کوئی غلطی نہیں کر سکتا، ایک ایسے طریقے کی حیثیت سے استعمال ہوتا رہا ہے جس کے ذریعے اسے اقتدار سے محروم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے ذریعے اس کے وزیروں کو اس قدر زیادہ طاقت و اختیار حاصل ہو گیا جو اس کے بغیر اس سے پہلے ممکن نہ

تھا۔ جہاں کہیں بھی روایتی شہنشائیت موجود ہوتی ہے، تو پھر حکومت کے خلاف بغاوت کا جرم، بادشاہ کے خلاف بھی ہوتا ہے اور روایت پسند اسے گناہ اور بدکاری سمجھتے ہیں۔ اس لئے اگر وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو بادشاہت، حالات جیسے بھی ہوں، انہیں جوں کے توں برقرار رکھنے کے لئے ایک قوت کے طور پر کام کرتی ہے۔ تاریخی لحاظ سے اس کا سب سے مفید کام یہ ہوتا ہے کہ یہ معاشرتی میل جول کے لئے مفید و موثر جذبات و احساسات پیدا کرتی ہے۔ انسان فطری طور پر مل جل کر بہت کم رہنا چاہتے ہیں کہ ابتری اور افراتفری ایک مستقل خطرے کی حیثیت سے موجود رہتی ہے اور اس صورت حال کو پیدا ہونے سے روکنے کے لئے بادشاہت نے بہت کام کیا ہے۔ بہرحال یہ خوبی اور خصوصیت، قدیمی اور دائمی برائیوں اور مطلوبہ تبدیلی کے خلاف بڑھتی ہوئی قوت کے اعتبار سے ایک نقصان دہ عنصر ثابت ہوتا ہے۔ جدید ادوار میں، اس نقصان دہ عنصر کے باعث دنیا کے اکثر خطوں سے شہنشائیت زوال پذیر ہوگئی۔

حکومت کی کسی اور قسم کی نسبت مذہبی علماء کی طاقت، زیادہ واضح طور پر اخلاقی اقدار سے منسلک رہی ہے۔ مسیحی ممالک میں، نیکی اور اچھائی، خدا تعالیٰ کی خواہش کی اطاعت پر مشتمل ہے، اور یہ پادری ہی ہوتے ہیں جنہیں یہ علم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی رضا اور خواہش کیا ہے۔ ہمارے لئے یہ حکم قابلِ ترجیح ہے کہ انسان کی نسبت خدا کے احکامات کی تعمیل ہوگی، جس طرح ہم نے پہلے بھی دیکھا، انقلابی نوعیت اختیار کرنے کے قابل ہے اور یہ حالت دو قسم کی صورت حال میں پائی جاتی ہے، ایک جب ریاست کلیسا کے خلاف ہوتی ہے اور دوسرا جب یہ سمجھا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ براہِ راست ہر انسان سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اول الذکر صورت حال کانسٹنٹین (Constantine) کے دور میں موجود تھی، اور موخر الذکر صورت حال اینابپٹیوں (Anabaptists) اور آزاد خیالوں (Independents) کے درمیان پائی جاتی تھی۔ لیکن ایک غیر انقلابی مدت کے دوران، جہاں ایک مستقل، مستحکم اور روایتی کلیسا موجود ہے، اسے خدا اور انسان کے درمیان رابطے کے لئے مثبت اخلاقی قدر کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ جب تک اس کی قبولیت قائم رہتی ہے، اس کی قوت و طاقت بہت ہی زیادہ ہوتی ہے، اور کلیسا کے خلاف بغاوت کسی بھی اور جرم کی نسبت زیادہ بڑا اور برا جرم سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال کلیسا کی اپنی بھی مشکلات ہوتی ہیں، اس لئے یہ اپنے اختیارات اس قدر کھلے عام استعمال کرتا ہے کہ افراد کو یہ شک گزرتا ہے کہ کیا کلیسا خدا تعالیٰ کے

احکامات کی درست طور پر تشریح کر رہا ہے، اور جب یہ شک بہت ہی عام ہو جاتا ہے تو پھر کلیسا کی شاندار عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے جس طرح اصلاحات کے دور میں ٹیوٹانکی (Teutonic) ممالک میں صورت حال واقع ہوئی۔

جہاں تک کلیسا کا تعلق ہے، اقتدار اور اخلاقی قدر کے درمیان تعلق کسی حد تک زیر بحث اور زیر غور صورت حال سے بہت ہی مختلف ہے۔ مثبت اخلاقیات، والدین، خاوندوں اور بادشاہوں کی اطاعت کی تلقین کرتی ہے کیونکہ یہ سب طاقتور ہوتے ہیں، لیکن کلیسا اپنی اخلاقی طاقت کے ذریعے طاقتور ہوتا ہے۔ بہر حال یہ کلیہ ایک خاص حد تک سچ ثابت ہوتا ہے۔ جہاں کلیسا محفوظ اور مستحکم ہوتا ہے، وہاں کلیسا کے لئے اطاعت کی اخلاقی نوعیت میں اسی طرح اضافہ ہو جاتا ہے جس طرح والدین، خاوندوں اور بادشاہوں کے لئے اخلاقی نوعیت کی اطاعت و فرمانبرداری میں اضافہ ہوا۔ اطاعت گزاری کی اخلاقی نوعیت کی انقلابی استراد، میں اسی طریقے کے ذریعے اضافہ ہو جاتا ہے۔ الحاد پرستی اور تفرقہ بازی، خاص طور پر کلیسا کے لئے قابلِ نفرت ہیں اور اس لئے انقلابی منصوبہ بندی کے لازمی عناصر بھی ہیں۔ بہر حال پادرانہ اور کلیسائی اقتدار و قوت کی مخالفت کے بہت زیادہ پیچیدہ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اخلاقیات اور اخلاقی ضابطے کے باقاعدہ سرپرست اور محافظ ہونے کی حیثیت سے اس کے مخالفین کی طرف سے اخلاقی اعتبار سے اس کے نظریے اور حکومت کے خلاف بغاوت کا امکان موجود ہوتا ہے۔ یہ لوگ، پیوریٹنوں کے مانند بہت زیادہ سختی اور شدت کے ساتھ بغاوت کر سکتے ہیں، یا پھر فرانسیسی انقلاب کے مانند ان میں بہت زیادہ لچک اور بے پروائی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن ان میں سے کسی بھی صورت حال میں بھی ماضی کی نسبت اخلاقیات ایک نجی معاملے کی حیثیت سے سامنے آتی ہے جو ایک عوامی ادارے کے فیصلے سے مشروط ہوتا ہے۔

یہ تو کسی قیمت پر بھی نہیں سمجھنا چاہئے کہ ذاتی اخلاقیات، کم شدت کی حیثیت ہونے کے باوجود، روایتی کلیسائی اخلاقیات سے عموی طور پر کمتر ہوتی ہے۔ اس امر کا کچھ ثبوت میسر ہے کہ جب چھٹی صدی قبل از مسیح میں یونانی جذبہ، انسانی قربانیوں اور ایثار سے زیادہ قابلِ نفرت ہو رہا تھا، تو ڈیلفی (Delhpi) کے ہاتف نے اس کی انسانی اصلاح کو سست کرنے اور قدیم سخت گیر معمولات اور طریقے برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ اسی طرح ہمارے اپنے دور میں جب حکومت اور

رائے کے نزدیک مرحوم بیوی کی بہن کے ساتھ شادی جائز ہے، تو پھر کلیسا کے پاس کسی طور پر قدیم ممانعت کو تبدیل کرنے کی طاقت واختیار نہیں ہے۔

جہاں کلیسا اپنا اقتدار کھو چکا ہو، اخلاقی اقدار چند مخصوص افراد کو چھوڑ کر، حقیقی طور پر ذاتی نوعیت اختیار نہیں کر لیتیں۔ اکثریت کے لئے اخلاقیات کی نمائندگی رائے عامہ کے دونوں طبقات عمومی طور پر پڑوسیوں اور دیگر طاقتور گروہوں، مثلاً اجیروں کے ذریعے ہوتی ہے۔ ایک گناہگار کے نقطہ نظر کے مطابق یہ تبدیلی معمولی بھی ہو سکتی ہے اور شدید نوعیت کی ہو سکتی ہے۔ جہاں ایک فرد کچھ فائدہ حاصل کرتا ہے، اور گناہ گار کی حیثیت سے حاصل نہیں کرتا بلکہ ایک منصف کی حیثیت سے حاصل کرتا ہے: وہ ایک غیر رسمی جمہوری عدالت کا ایک حصہ بن جاتا ہے، اور جہاں کلیسا طاقت ور ہو، اسے حکومتی ادارے کو لازمی طور پر قبول کر لینا چاہئے۔ ایک پروٹسٹنٹ جس کے اخلاقی محسوسات زور آور ہوتے ہیں، پادری کے اخلاقی فرائض کو غصب کر لیتا ہے اور وہ لوگوں کی نیکیوں و برائیوں، خاص طور پر موخر الذکر کے لئے ایک نیم حکومتی رویہ اور طرزِ عمل اپناتا ہے۔

آپ کو کچھ نہیں کرنا ہے
سوائے اس کے
کہ اپنے ہمسایہ کی
حماقتوں، غلطیوں اور کمزوریوں
کی نشاندہی کرنا ہے
اور انہیں منظر عام پر لاتا ہے
یہ شہنشائیت نہیں بلکہ جمہوریت ہے۔

جیسے کہ ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں، یہ اصول کہ اخلاقی ضابطہ اقتدار و اختیار کا اظہار ہوتا ہے، کُلّی طور پر درست اور صحیح نہیں ہے۔ وحشی قبائل کے خاندان سے باہر شادی کرنے کے اصولوں سے لے کر تہذیب کے تمام مرحلوں تک، ہمارے درمیان اخلاقی قوانین کا اقتدار و اختیار کے ساتھ کوئی واضح تعلق نہیں ہے، اس ضمن میں ہم جنس پرستی کی مذمت، ایک مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ مارکسی نقطہ نظر کہ اخلاقی ضابطہ معاشی قوت کا اظہار ہے، اس نظریے اور نقطہ نظر سے کہیں کم مناسب ہے کہ اخلاقی ضابطہ عمومی طور پر اقتدار و اختیار کا اظہار و علامت ہوتا ہے۔ پھر بھی

مارکسی نظریہ بہت سے معاملات میں بہت زیادہ سچ اور صحیح ہے۔ مثال کے طور پر، ازمنہ وسطیٰ میں جب عوام میں سے سب سے زیادہ طاقتور طبقہ زمین داروں کا تھا، جب پادری اور راہب، اپنی آمدن زمین میں سے حاصل کرتے تھے اور جب یہودی ہی سرمایہ کاری کرتے تھے تو پھر کلیسا نے بغیر کسی پس وپیش کے سود خوری یعنی سود کے عوض رقم کی ادھار وصولی کی مذمت کی۔ یہ مقروضوں کی اخلاقی اقدار تھیں۔ جب امیر سوداگروں پر مشتمل طبقہ منظر عام پر آیا تو پھر ماضی میں لاگو کی گئی ممانعت کو برقرار رکھنا ممکن ہوگیا۔ سب سے پہلے اس ممانعت میں کیلون (Calvin) نے لچک پیدا کی گئی جس کے گاہک زیادہ تر شہری اور خوشحال طبقے کے لوگ تھے۔ اس کے بعد دیگر پروٹسٹوں نے بھی اس ممانعت میں لچک پیدا کی اور پھر بعد میں اہل کیتھولک نے اس ممانعت کو ختم کر دیا۔ قرض خواہوں کی اخلاقی اقدار، زمانے کے انداز واطوار کی حیثیت اختیار کر گئے اور قرض کی عدم ادائیگی ایک بھیانک گناہ کی حیثیت اختیار کر گیا۔

''دوستوں کی انجمن'' (Society of Friends) نے زبانی طور پر نہ سہی لیکن عملی طور پر حالیہ زمانے تک دیوالیہ ہونے والوں کو اپنی انجمن میں سے خارج کر دیا۔

دشمنوں کے لئے اخلاقی ضابطہ، ایک ایسا معاملہ ہے، جو مختلف ادوار میں مختلف نوعیت کا حامل رہا ہے، اور اس کی یہ مختلف نوعیت کی سب سے بڑی وجہ اقتدار و طاقت کے استعمال کی مختلف صورتیں ہیں۔ اس موضوع کے ضمن میں آیئے سب سے پہلے انجیل مقدس (تورات) میں مذکور فرمان سنتے ہیں:

> ''جب تمہارا آقا، خداوند تعالیٰ، تمہیں روئے زمین پر لائے گا، جہاں تم قابض ہو جاؤ گے اور کئی قوموں پر غلبہ حاصل کرلو گے، ہٹیوں (Hittites)، گرگاشیٹیوں (Gargashites)، کنعانیوں (Canaanites)، پریزائیوں (Perizzites)، ہیوائیوں (Hivites) اور جیبوسیٹیوں (Jebuisites) پر، کہ یہ سات اقوام تم سے زیادہ عظیم اور طاقتور ہیں۔''
>
> ''اور جب تمہارا آقا، خدا تعالیٰ ان اقوام کو تمہارے قبضے میں دے گا، تو تم ان کو پیس ڈالو گے، انہیں مکمل طور پر تباہ کر ڈالو گے۔ تم ان کے ساتھ کوئی سمجھوتا اور مذاکرات نہیں کرو گے، تم ان پر کسی صورت رحم نہیں کھاؤ گے''۔

"تم ان کے ساتھ ازدواجی رشتے منسلک نہیں کرو گے، تم اپنی بیٹیاں ان کے بیٹوں کو نہیں دو گے اور نہ ہی ان کی بیٹیوں کو تمہارے بیٹے بیاہ کر لے جائیں گے۔"

"کیونکہ یہ خدشہ موجود ہے کہ تمہارے بیٹے میری اطاعت سے منحرف ہو جائیں گے اور وہ دوسرے معبودوں کی بندگی کرنے لگیں گے۔ اگر اسی طرح ہوا تو تمہارے آقا کا غضب بھڑک اٹھے گا اور وہ تمہیں آناً فاناً تباہ و برباد کر دے گا۔"

"اگر تمہارے بیٹے میرے ہی حکم کی تعمیل کریں گے تو میرا وعدہ ہے کہ تمہارے مرد اور عورتیں، بلکہ تمہارے مویشی تک بھی بانجھ نہیں رہیں گے۔"

جہاں تک ان سات اقوام کا تعلق ہے، ہمیں ان کے بارے زیادہ صراحت کے ساتھ آئندہ باب میں بتایا گیا۔

"وہ تمہیں یہ سبق سکھائیں گی کہ انتہائی نفرت کے نتیجے میں تم اپنی وسیع پذیرپیش قدمی صحیح سلامت بچا نہیں پاؤ گے۔"

"لیکن ان شہروں کے جانب جو تم سے بہت بعید ہیں اور جو لوگ تمہاری اقوام میں سے نہیں ہیں، ان کے لئے بہتر اور تمہارے لئے جائز ہوگا کہ تم رحمدلی کا مظاہرہ کرو۔"

"جب تم جنگ کرو تو تم دشمن کے ہر مرد کو تلوار کی تیز دھار سے چیر ڈالو، لیکن عورتوں، بچوں، مویشیوں اور شہر کے دیگر جانداروں کو کچھ نہ کہنا۔ اور دشمن کی ہر ایک شے پر قبضہ کر لینا۔"

یہ یاد رکھو کہ روح، ایمل کائیتوں (Amalekites) میں سرایت کرے گی تو وہ اس قدر کرب اور تکلیف میں مبتلا ہو جائے گی کہ اس کے تمام وجود کی قوت کمزور پڑ جائے گی۔

"تب، اس نے ایمل کائیتوں کے بادشاہ اگیگ (Agag) کو زندہ ہی ساتھ لیا اور اپنی تلوار کی تیز دھار سے تمام لوگوں کو ہلاک کر دیا۔"

"لیکن روح اور لوگوں نے اگیگ کو کچھ نہ کہا اور نہ ہی بھیڑوں، بیلوں،

بوڑھوں اور نوخیز درختوں کے علاوہ ہر مفید چیز کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا، لیکن ہر شے جو بری اور فضول تھی، اسے تباہ کر دیا۔"

تب اس نے آقا کے ان الفاظ پر غور کیا جو آقا نے سیمول کو کہے تھے:

"مجھے اس امر کا سخت پچھتاوا اور افسوس ہے کہ میں نے روح کو ایسا بادشاہ بنا دیا جس نے میری اطاعت سے انحراف کیا اور میرے احکامات کی نافرمانی کی۔"

مندرجہ بالا پیروں کے ذریعے یہ امر واضح طور پر سامنے آتا ہے کہ بنی اسرائیل کا مفاد صرف اس صورت میں قائم و بحال رہ سکتا تھا جب وہ غیر یہودیوں کے ساتھ برسرِ پیکار ہوتے، لیکن دراصل یہ مذہب ہی کا مفاد تھا، یعنی پادری جن کی حیثیت عوام کے معاشی مفاد سے کہیں زیادہ برقرار رہنا تھی۔ آقا کے الفاظ سیمول پر نازل ہوئے لیکن یہ سیمول کے الفاظ تھے جو روح پر نازل ہوئے، اور الفاظ یہ تھے: میرے کانوں میں بھیڑوں کے "میں میں" کرنے سے کیا مراد ہے اور اس کا کیا مطلب جب بیل اپنا سر جھکا لیتے ہیں؟ کیا روح اپنے گناہ کے اعتراف کے ذریعے ہی جواب دے سکتی تھی۔

یہودی، اپنی بت پرستی کے خوف سے جس کے جراثیم بظاہر بھیڑوں اور گائیوں میں پوشیدہ تھے جس کے باعث خاص طور پر مفتوح چیزیں بھی تباہ ہو گئیں۔ لیکن کوئی بھی قدیم قوم یہ ادراک نہ کر سکی اسے ایک مفتوحہ قوم کے ساتھ کون سی قانونی یا اخلاقی حدود اختیار کرنی چاہئیں۔ اس وقت رواج یہ تھا کہ قوم کے کچھ افراد کو قتل کر دیا جائے اور کچھ کو غلاموں کی حیثیت سے فروخت کر دیا جائے۔ کچھ یونانیوں نے اس معمول کے خلاف جذبات و احساسات بیدار کرنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ چونکہ مفتوح قوم کے افراد بے بس تھے، اس لئے وہ رحم کی درخواست کرنے کے بھی قابل نہ تھے۔ نظریاتی طور پر بھی یہ نقطہ نظر مسیحیت کے منظر عام آنے تک ترک نہیں کیا گیا۔

یہ ایک نہایت مشکل تصور ہے کہ دشمنوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے۔ قدیم دور میں بھی ترحم ایک نیکی تصور کی جاتی تھی، لیکن یہ طرز عمل اس وقت اچھا سمجھا جاتا تھا جب اس کے ذریعے کامیابی حاصل ہو، یعنی جب اس جذبہ رحم کے ذریعے یہ دشمن، دوست بن جائیں، بصورت دیگر

جذبہ ترحم کی ایک کمزوری کی حیثیت سے مذمت کی جاتی تھی۔ جب خوف پیدا ہوا تو پھر فیاضی اور عالی ظرفی کی کسی کو توقع نہ تھی۔ رومیوں نے ہینی بال یا اہل سپارٹا کے ساتھ اس قسم کا کوئی سلوک نہیں کیا۔ قرونِ وسطیٰ کے طبقہ امراء کے زمانے میں طبقہ امراء کے ایک فرد نائٹ (Knight) سے یہ توقع ہوتی تھی کہ وہ اپنے ہم منصب گرفتار شدہ فرد کے ساتھ شائستگی اور تہذیب کے ساتھ پیش آئے۔ لیکن طبقہ امراء کے افراد کے درمیان جھگڑا اور اختلاف شدید نوعیت کا نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی البائنیوں کے لئے بہت ہی کمزور اور ادنیٰ رحم دلی کا اظہار کیا جاتا تھا۔ ہمارے دور میں، فن لینڈ، ہنگری، جرمنی اور سپین میں سفید فام خطرناک افراد کے شکار افراد کے خلاف تقریباً یکساں نوعیت کی بے رحمی پر مبنی سلوک اختیار کیا جاتا تھا اور سیاسی مخالفین کے علاوہ کہیں سے بھی بمشکل احتجاجی آواز بلند ہوتی تھی۔ اسی طرح روس میں، بائیں بازو کے زیادہ تر حامی خوف کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ اب جس طرح انجیل مقدس (تورات) کے زمانے میں رواج تھا، عملی طور پر دشمنوں کے ساتھ کسی بھی قسم کا سلوک نہیں کیا جاتا تھا جب وہ خوف کا اظہار کرنے سے ڈرتے تھے۔ درحقیقت مثبت اخلاقیات آج بھی ابھی تک صرف متعلقہ سماجی گروہوں میں عملی طور پر موجود ہے اور اس لئے دراصل یہ حکومت کا ہی ایک محکمہ تصور کی جاتی ہے۔ عالمی حکومت کی طرف سے کوئی بھی چیز فسادی عوام کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کرے گی، سوائے اس کے کہ قطعیت کے ایک حامی کی حیثیت سے اخلاقی فرائض اور ذمہ داریاں، انسانی نسل کے کسی ایک گروہ یا طبقے تک ہی محدود نہیں ہیں۔

اس باب میں، میں نے ابھی تک مثبت اخلاقیات کے متعلق ہی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، اور یہ امر بھی نہایت واضح ہو چکا ہے کہ جو کچھ بیان کیا گیا، وہ کافی نہیں ہے۔ اگر وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو یہ اخلاقیات، اقتدار و اختیار کے ہم رکاب ہو سکتی ہے، یعنی یہ انقلاب کے لئے موقع فراہم نہیں کرتی، یہ لڑائی جھگڑے کی شدت کو کم کرنے کے لئے مفید بھی نہیں ہے اور اس کی موجودگی میں کوئی ایسا پیغمبر بھی جگہ نہیں پا سکتا جو کسی نئے نظریے اور تصور و اعتقاد کے ظہور کا دعویٰ کرتا ہو۔ اس ضمن میں الفاظ کی صورت میں کئی مشکل سوالات ابھرتے ہیں، لیکن ان پر غور و فکر کرنے سے قبل ہمیں ان کچھ چیزوں کے متعلق معلوم کر لینا چاہئے جن کے باعث مثبت اخلاقیات کی صرف مخالفت ہی حاصل کی جا سکتی تھی۔

یہ دنیا، انجیل مقدس کی بھی کچھ نہ کچھ احسان مند ہے، لیکن اگر اس کا اثر و رسوخ زیادہ ہوتا تو

دنیا اس سے کہیں زیادہ اس کی احسان مند ہوتی۔ یہ کچھ حد تک ان کی بھی احسان مند ہے جنہوں نے غلامی اور عورتوں کی محکومیت کو مسترد کر دیا۔ ہمیں توقع ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ان کی بھی احسان مند ہو گی جو جنگ اور معاشی ناانصافی کو بھی بُرا سمجھتے ہیں۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں میں یہ اہلِ رواداری اور تحمل و برداشت کی بھی بہت زیادہ احسان مند تھی، شاید ہمارے زمانے کی نسبت یہ دوبارہ ایک اچھے اور بھلے دور کا سامنا کرے گی۔ قدیم کلیساؤں کے خلاف انقلابات، شہنشاہت کے احیاء اور طبقہ امرا کی حکومت کی موجودہ طاقت، جامدیت سے بچاؤ کے لئے ضروری ہیں۔ اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے، جس کا اعتراف ہمیں لازمی طور پر کرنا چاہیے، بنی نوع انسان کو انقلاب اور انفرادی اخلاقیات کی ضرورت ہے، مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس دنیا کو افراتفری اور ابتری میں دھکیلے بغیر ان چیزوں کے لئے گنجائش پیدا کی جائے۔

اس وقت دو سوال غور طلب ہیں: پہلے تو یہ کہ مثبت اخلاقیات کے اپنے نقطہ نظر کے لحاظ سے سب سے زیادہ دانشمندانہ رویہ اور طرزِ عمل کیا ہے جس کے ذریعے ذاتی طور پر اخلاقیات اختیار کی جا سکے؟ دوسرے یہ کہ ذاتی اخلاقیات کو کس حد تک مثبت اخلاقیات کے لئے عزت و تکریم کا مظاہرہ کرنا چاہیے؟ لیکن ان دونوں پہلوؤں اور امور پر غور کرنے سے پہلے، ذاتی اخلاقیات کے مفہوم کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور بیان کرنا چاہیے۔

ذاتی اخلاقیات پر تاریخی تناظر کے لحاظ سے، یا پھر ایک فلسفی کے نقطہ نظر کے اعتبار سے غور کیا جا سکتا ہے۔ آیئے اب ہم اول الذکر پہلو پر غور کرتے ہیں:

تقریباً ہر فرد جو تاریخِ عالم میں موجود رہا ہے، بعض قسم کے اقدامات اور عملی کارروائیوں سے ہمیشہ بہت زیادہ خوفزدہ اور دہشت زدہ رہا ہے۔ ایک اصول کی حیثیت سے یہ اقدامات اور عملی کارروائیاں نہ صرف ایک فرد کی نفرت و کراہت بلکہ ایک پورے قبیلے یا قوم، یا فرقے یا ایک طبقے کی نفرت و کراہت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ بعض اوقات اس نفرت و کراہت کا ماخذ نامعلوم ہوتا ہے اور بعض اوقات اس کی بنیاد وہ تاریخی شخصیت ہوتی تھی جو ایک مہلک مخترع تھی۔ ہمیں معلوم ہے کہ مسلمان کیوں جانوروں یا انسانوں کی تصویریں نہیں بناتے، اس لئے کہ ان کے نبیؐ نے اس کی اجازت نہیں دی۔ ہمیں معلوم ہے کہ کٹر یہودی خرگوش کیوں نہیں کھاتے، اس لئے حضرت موسیٰ کی تعلیمات بتاتی ہیں کہ خرگوش ناپاک اور حرام ہے۔ جب ان پابندیوں کو قبول و تسلیم کیا جاتا ہے تو

انہیں مثبت اخلاقیات کہا جاتا ہے لیکن ان کے ماخذ کے لحاظ سے کسی بھی قیمت پر جب ان کا ماخذ معلوم ہوتا ہے، تو پھر انہیں منفی اخلاقیات کہا جاتا ہے۔

بہر حال، ہمارے لئے اخلاقیات کا مفہوم رسمی احکامات و ضابطوں سے کہیں بڑھ کر ہے، خواہ اس کی نوعیت مثبت ہو یا منفی ہو۔ جس صورت میں یہ ہمارے لئے مانوس اور آشنا ہوتے ہیں یہ قدیمی حیثیت نہیں رکھتی، لیکن بظاہر اس کے کئی آزادانہ ذرائع ہوتے ہیں__ چینی حکماء، ہندوستانی بدھ، عبرانی پیغمبر اور یونانی فلسفی۔ یہ افراد، تاریخی لحاظ سے جن کی اہمیت میں بڑھاوا بہت ہی مشکل ہے، تمام کے تمام چند صدیوں کے اندر ہی موجود تھے اور ان سب سے بعض ایسی خوبیاں اور خصوصیات موجود تھیں جن کے باعث وہ اپنے پیش روؤں سے ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ لاؤٹسی (Lao-Tse) اور چنگ ٹسی (Chung Tse) کسی دوسرے کی روایت اور حکمت و دانائی کے ذریعے نہیں بلکہ اپنے علم کے ذریعے "تاؤ" (Tao) کا نظریہ پیش کرتے ہیں، مزید یہ کہ یہ ضابطہ اور نظریہ خاص فرائض اور ذمہ داریوں پر مشتمل نہیں ہے، بلکہ ایک طرزِ زندگی ہے، ایک اندازِ فکر ہے، اور ایک احساس ہے جس کے ذریعے کسی بھی اصول یا ضابطے کی ضرورت کے بغیر کہ کسی بھی خاص موقع پر کیا کرنا چاہئے، یہ نظریہ ایک واضح راستہ اختیار کر لے گا۔ قدیم بدھوں کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ عبرانی پیغمبر اپنی بہترین کوششوں کے ذریعے قانون سے ماورا اندازِ فکر اپناتے ہیں، اور ایک نئے اور اچھی قسم کے نظریے اور تصور کی وکالت کرتے ہیں، جسے روایتی طور پر نہیں بلکہ الفاظ کے ذریعے اخذ کیا جاتا ہے۔ سقراط اپنی مافوق الفطرت سوچ کے مطابق عمل کرتا ہے جسے قانونی طور پر تشکیل شدہ با اختیار ادارے پسند نہیں کرتے، اور وہ اپنی اندرونی اور باطنی آواز کے استرداد کے بجائے موت قبول کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ یہ تمام افراد اپنے اپنے دور کے باغیوں میں شمار ہوتے تھے اور ان سب کی عزت کی جانی چاہئے۔ ان میں جو ایک نئی چیز موجود تھی، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ ظاہر ہو جاتا تھی۔ لیکن یہ قطعی اور یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ نئی چیز کیا ہے۔

ایک سمجھدار اور دانا شخص کے بارے کم از کم طور پر جو یا تو تاریخی طور پر وقوع پذیر ہونے والے ایک مذہب کا پیروکار رہتا ہے، یا یہ سمجھتا ہے کہ اس کا یہ مذہب پہلے سے کہیں بہتر ہو چکا ہے، یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک ایسا طرزِ زندگی جو کسی نہ کسی طرح پہلے طرزِ زندگی سے بہتر تھا، سب سے

پہلے اس کی حمایت کسی فرد یا کچھ افراد نے کی تھی جوان دونوں ریاست اور کلیسا کی تعلیمات کے خلاف تھی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک فرد کے لئے یہ ہمیشہ ہی ٹھیک نہیں ہوتا کہ وہ اخلاقی معیارات کے مطابق خود کو ڈھال لے قطع نظر اس کے کہ معیارات حالیہ دور تک موجود تمام انسان کے معیارات کے مخالف اور متضاد ہوں۔ اب ہر شخص کو علم ہے کہ شعبہ سائنس میں تقابلی نظریات موجود ہوتے ہیں اور پیدا ہوتے رہتے ہیں، لیکن شعبہ سائنس میں ایک نئے نظریے کو آزمانے اور اس کا امتحان لینے کے لئے طریقے معلوم ہیں، اور یہ نظریہ عمومی طور پر قبولیت کی سند حاصل کر لیتا ہے، اور یا پھر روایتی بنیادوں کی نسبت دیگر وجوہات کے باعث مسترد کر دیا جاتا ہے۔ اخلاقیات کے ضمن میں کوئی بھی ایسے واضح اور زبردست طریقے نہیں ہیں جن کے ذریعے ایک نئے نظریے یا نظام کو آزمایا جا سکے۔ ایک پیغمبر اپنی تعلیمات کی تبلیغ کے لئے یہ طریقہ اختیار کر سکتا ہے۔ لہٰذا خدا تعالیٰ نے کہا جو اس پیغمبر کے لئے تو کافی ہے لیکن عام لوگوں کو یہ کیسے معلوم ہوگا کہ اس پر نازل ہونے والی یہ وحی بالکل اصلی ہے؟ کسی نہ کسی حد تک تو یہ درست ہے کہ تورات و زبور میں آزمائش کا عام طور پر وہی طریقہ اپنایا جاتا ہے جو عام طور پر سائنس کے لئے اختیار کیا جاتا ہے، مثلاً پیشگی کامیابی کا تصور: ''اگر وہ اپنے دل میں کہیں، ہمیں کیسے معلوم ہوگا کہ کون سا لفظ خدا نے نہیں کہا ہے؟ جب ایک پیغمبر خدا کے نام پر کوئی بات کہتا ہے، اور اسی طرح یہ بات وقوع پذیر نہیں ہوتی، اور نہ ہی یہ سامنے نظر آتی ہے، لیکن پیغمبر نے یہ بات بے دھڑک کہی ہوتی ہے۔'' لیکن جدید زمانے میں اخلاقی نظریہ کی آزمائش کے اس طریقے کو بمشکل مانا جا سکتا ہے۔

اب ہمیں لازمی طور پر اس سوال کا سامنا کرنا چاہئے: ایک اخلاقی نظریے یا نظام کا کیا مفہوم ہے اور اگر اس کی آزمائش کے لئے کوئی طریقہ موجود ہے تو پھر اسے کس طرح آزمایا جا سکتا ہے؟

اگر تاریخی حوالے سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اخلاقیات کا تعلق مذہب سے ہے۔ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی چیز کے صحیح ہونے کے لئے اس کا با اختیار ہونا ہی کافی ہے۔ جو کچھ انجیل یا کلیسا کے مطابق درست یا غلط ہے، وہی کچھ درست یا غلط ہے۔ لیکن کچھ افراد ایسے بھی ہیں جو مختلف ادوار میں روحانیت سے مرصع تھے، انہیں معلوم ہوتا ہے کہ کیا چیز درست ہے اور کیا چیز غلط، کیونکہ خدا نے انہیں براہِ راست اپنے کلام کے ذریعے انہیں بتا دیا تھا۔ روایت پسند اور کٹر افراد کی رائے کے مطابق یہ تمام افراد قدیم ادوار میں موجود تھے، لیکن اگر جدید زمانے میں کوئی شخص اس قسم

کا دعویٰ کرتا ہے تو پھر بہتر یہ ہے کہ کلیسا اسے اپنی حفاظتی تحویل میں لے لے اور چھان پھٹک کر اس کے متعلق فیصلہ کرے۔ بہرحال یہ ایک عمومی صورت حال ہے جب باغی آمر بن جاتا ہے اور اس کے اس طرزِ عمل کے باعث ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ باغیوں کی قانونی اور جائز ذمہ داریاں اور فرائض کیا ہیں۔

کیا ہم اخلاقیات کو غیر دینی اصلاحات میں منتقل کر سکتے ہیں یا کیا ہم اخلاقیات کو غیر دینی نظریات کا جامہ پہنا سکتے ہیں؟ وکٹوریائی آزاد منش مفکرین کو کوئی شک نہیں تھا کہ یہ ممکن تھا۔ مثال کے طور پر مطلق العنان طبقے کے افراد کی اخلاقی سطح بہت بلند تھی اور انہیں یقین تھا کہ ان کی یہ اخلاقی خصوصیات وخوبیاں منطقی طور پر ان میں موجود ہیں۔ بہرحال یہ معاملہ جیسے انہیں نظر آتا تھا، اس سے کہیں مشکل تھا۔

آیئے، اب ہم اس ایک سوال پر غور کریں جسے مطلق العنان طبقے کے افراد اٹھاتے ہیں یعنی کیا قانون کا کوئی ضابطہ خود ساختہ اخلاقیات کا مظہر ہو سکتا ہے، یا پھر اس قانونی ضابطے کو ہمیشہ ہی اس ضابطے کے اچھے یا برے اثرات کے ذریعے اخذ کیا جا سکتا ہے؟

روایتی نقطہ نظر یہ ہے کہ اپنے اثرات کے قطع نظر کچھ سرگرمیاں گناہ آلود ہیں اور کچھ سرگرمیاں نیکیوں میں شمار ہوتی ہیں۔ دوسری قسم کی سرگرمیاں اخلاقی طور پر اچھائی یا بدی سے عاری ہوتی ہیں اور ان کی اچھائی یا برائی کا اندازہ ان کے اثرات اور نتائج سے لگایا جا سکتا ہے۔ کسی مہلک مرض میں مبتلا انسان کی اذیت سے نجات دلانے کے لئے غیر تکلیف دہ عمل سے ہلاک یا فوت شدہ بیوی کی بہن سے شادی جائز ہونی چاہئے، یہ ایک اخلاقی نوعیت کا سوال ہے لیکن کوئی مقررہ اصول یا قانون نہیں ہے۔ اخلاقی سوالات کی دو ''تعریفیں'' یا مفہوم ہیں۔ ان میں سے کون سی تعریف کس خوبی یا صفت پر منطبق ہوتی ہے۔ ایک سوال اس وقت اخلاقی ہوتا ہے (1) جب یہ قدیم غیر یہودیوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوتا ہے (2) اگر یہ ایک ایسا سوال ہے جس میں کنٹربری کے بشپ اعلیٰ کو سرکاری طور پر مہارت حاصل ہے۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ ''اخلاقیات'' کے اس لفظ کا عام استعمال مکمل طور پر نا قابلِ دفاع ہے۔

بہرحال، میرا ذاتی طور پر خیال ہے کہ ایسے بھی رویے اور سرگرمیاں ہیں جنہیں میں پسند نہیں کرتا لیکن جو مجھے زیادہ اخلاقی نوعیت کے معلوم ہوتے ہیں لیکن نہایت واضح طور پر ان کا

انحصار متوقع نتائج پر نہیں ہے۔ مجھے کئی لوگوں نے بتایا ہے کہ جمہوریت کا تحفظ، جو میرے نزدیک بہت ہی اہم ہے، صرف اس صورت میں کیا جا سکتا ہے کہ بچوں کی ایک کثیر تعداد کو مار ڈالا جائے اور اس طرح کے کئی دیگر ہولناک اور بھیانک کام اور سرگرمیاں انجام دی جائیں۔ مجھے ادراک ہو گیا ہے کہ اس مرحلے پر میں اس قسم کے طریقوں کے استعمال سے متفق نہیں ہو سکتا۔ میں خود کو باور کرا دیتا ہوں کہ ان طریقوں کے ذریعے مطلوبہ مقصد حاصل نہیں ہوگا، یا پھر، اگر ان طریقوں سے مطلوبہ مقصد حاصل ہونے والی اچھائیوں سے کہیں زیادہ ہو جائیں گے۔ میں زیادہ پُر یقین نہیں ہوں کہ یہ دلیل کس حد تک صحیح اور سچی ہے۔ میرا خیال ہے کہ دوسروں کے یہ کہنے کے باوجود کہ ان طریقوں کے ذریعے مطلوبہ مقصد حاصل ہو جائے گا اور اس کا اور کوئی طریقہ نہیں ہے، مجھے ان طریقوں کو مسترد کر دینا چاہئے۔ اس کے برعکس، نفسیاتی تخیل کے ذریعے مجھے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ ان طریقوں کے ذریعے کوئی بھی اچھا مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مجموعی طور پر میرا اندازہ ہے کہ اگر فلسفیانہ انداز سے کہا جائے تو ہر قسم کی سرگرمیوں کا تعین ان کے نتائج کے ذریعے ہونا چاہئے، لیکن جیسا کہ یہ عمل مشکل اور غیر یقینی ہے اور اس میں وقت بھی صرف ہوتا ہے تو پھر بہتر یہی ہے کہ نتائج کا انتظار کئے بغیر کچھ اقدامات اور سرگرمیوں کی مذمت اور کچھ کی تعریف کرنا چاہئے۔ اس لئے مجھے پُر زور اور قطعی طور پر یہ کہنا چاہئے کہ مخصوص حالات میں ایک صحیح اور درست قدم یہ ہے کہ اعداد و شمار کے مطابق جو بھی اقدامات اور سرگرمیاں ممکن ہیں، ان کے ذریعے ایک نہایت ہی متوازن صورت حال پیدا ہو جائے گی جہاں نیکیاں اور اچھائیاں، برائیوں اور بدیوں پر غالب آ جائیں گی۔ لیکن ان میں سے ہر قدم اور سرگرمی کی کارکردگی میں اخلاقیات/اخلاقی ضابطے کو بروئے کار لا کر اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

اگر اس نقطہ نظر کو مان لیا جائے، تو پھر اخلاقیات، محض طریقوں، اقدامات اور سرگرمیوں کے بجائے بذات خود مقاصد کی صورت میں ''اچھے'' اور ''برے'' میں تخصیص کرنے تک ہی محدود ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اچھائی اور نیکی خوشی و طمانیت ہے جبکہ برائی اور بدی تکلیف و زحمت ہے؟

زندگی کے مقاصد کے ضمن میں مختلف نقطہ ہائے نظر پر غور کیجئے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ اچھائی اور نیکی، خوشی و طمانیت ہے، دوسرا کہتا ہے کہ نیکی اور اچھائی، آریاؤں کے لئے خوشی و طمانیت ہے اور یہودیوں کے لئے بدی اور زحمت ہے، اور دوسرا کہتا ہے کہ اچھائی اور نیکی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اور

اس کی شان کی ہر دم تعریف کی جائے۔ یہ تین اشخاص کیا کہہ رہے ہیں اور کون سے طریقوں کے ذریعے وہ ایک دوسرے کو قائل کر سکتے ہیں؟ وہ ایک دوسرے کو قائل نہیں کر سکتے لیکن سائنسی علوم کے ماہرین ایک دوسرے کو قائل کر سکتے ہیں کیونکہ وہ حقائق کو مدنظر رکھتے ہیں، اور کوئی بھی حقائق اختلاف اور جھگڑے سے منسلک نہیں ہوتے۔ ان کے اختلاف، حقائق کے متعلق بیانات کے ضمن میں نہیں ہوتے بلکہ ان کی خواہشات کے ضمن میں ہوتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جب میں یہ کہتا ہوں کہ یہ چیز اچھی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ مجھے چاہئے، یہ ایک ایسی مخصوص قسم کی خواہش ہوتی ہے جس کے باعث میں کسی چیز کو ''اچھا'' کہتا ہوں۔ اور یہ خواہش کچھ حد تک ذاتی مفاد سے الگ ہونی چاہئے، اس کا تعلق اس قسم کے الفاظ سے نہیں ہونا چاہئے جو میرے ذاتی حالات کے ضمن میں مجھے مطمئن کر دیتے۔ ایک بادشاہ یہ کہہ سکتا ہے ''شہنشاہیت ایک اچھی چیز ہے اور میں خوش ہوں کیوں کہ میں شہنشاہ ہوں۔'' اس بیان کا پہلا حصہ مشکوک اخلاقیات کو ظاہر کرتا ہے، لیکن ایک شہنشاہ کی حیثیت سے خوشی اور مسرت صرف اس وقت اخلاقی حیثیت اختیار کرتی ہے جب لوگ اسے کہتے ہیں کہ اس سے بہتر تو کوئی بادشاہ ہو ہی نہیں سکتا۔

میں اس سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ باطنی رویے، یقین کی تشریح اپنی کسی خواہش یا دعوے کے ذریعے نہیں کی جا سکتی لیکن بنی نوع انسان کی خواہش کے متعلق خواہش کے اظہار کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔ جب میں کہتا ہوں ''نفرت بُری چیز ہے''، میں کسی بھی قسم کا دعویٰ نہیں کرتا، میں تو صرف ایک خاص قسم کی خواہش کا اظہار کرتا ہوں۔ سننے والا یہ سمجھ سکتا ہے کہ میں اس خواہش کو محسوس کرتا ہوں، لیکن یہی ایک حقیقت ہے جسے وہ سمجھ سکتا ہے اور یہ نفسیات کی حقیقت ہے۔ اخلاقیات کے ضمن میں حقائق موجود نہیں ہوتے۔

عظیم اخلاقی مخترع اور مصلح، وہ افراد نہیں ہیں، جن کا علم دوسروں سے زیادہ تھا، بلکہ یہ وہ افراد تھے جن کی خواہشات زیادہ تھیں یا زیادہ درست طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ افراد ہیں جن کی خواہشات زیادہ سے زیادہ غیر ذاتی ہیں اور اوسط افراد سے ان کی وسعت پذیری زیادہ ہوتی ہے۔ اکثر افراد چاہتے ہیں کہ انہیں خوشی و مسرت حاصل ہو، اور پھر بہت سے لوگ اپنے بچوں کے لئے خوشی و مسرت حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور پھر کچھ افراد اپنی قوم کے لئے خوشی و مسرت حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور پھر کچھ لوگ واقعی اور پُر زور طور پر تمام انسانیت کے لئے خوشی و مسرت کے

خواہش مند ہوتے ہیں۔ جب یہ افراد دیکھتے ہیں کہ دوسرے لوگ اس طرح محسوس نہیں کرتے، اوران کا یہ رویہ اوراحساس عالمگیر خوشی ومسرت کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے، توان کی خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے بھی اسی طرح محسوس کریں، اس خواہش کو ''خوشی اور مسرت اچھی ہے'' کے الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

قدیم زمانے کے گوتم بدھ سے لے کر جدید زمانے کے سٹائکس (Stoics) (فلسفی) جیسے عظیم مصلحوں نے ''نیکی اور اچھائی'' کو ایک ایسی چیز کی حیثیت سے محسوس اور تصور کیا کہ اگر ممکن ہو، تو اس کرہ ارض پر موجود تمام انسان، یکساں طور پر خوشی ومسرت سے لطف اندوز ہوتے۔ وہ خود کو شہزادے، یہودی یا یونانی نہیں سمجھتے، وہ صرف خود کو انسان سمجھتے ہیں۔ ان کی خوش اخلاقی ہمیشہ ہی دو قسم کے ماخذوں پر مشتمل ہوتی ہے، ایک تو یہ کہ انہوں نے اپنی زندگیوں میں بعض مخصوص عناصر کو اہمیت دی، دوسری طرف ان کے دل میں موجود احساس ہمدردی کے باعث انہوں نے دوسروں کے لئے بھی وہی چاہا جو انہوں نے اپنے لئے چاہا___ ہمدردی، اخلاقیات میں ایک عالمگیر قوت کی حیثیت رکھتی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ محض لفظی اصولوں کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک جذبے اور احساس کی حیثیت سے ہمدردی ایک عالمگیر قوت کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمدردی، کچھ نہ کچھ حد تک باطنی اور جبلی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک بچے کے رونے چلانے کے باعث ایک بچہ ناراض اور غم زدہ ہوسکتا ہے لیکن ہمدردی کی حدود وقیود بھی فطری ہوتی ہیں۔ بلی کو چوہے سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی، رومیوں کو ہاتھیوں کے سوا کسی بھی دوسرے جانور سے ہمدردی نہ تھی، نازیوں کو یہودیوں سے ہمدردی نہ تھی، اور سٹالن کے دل میں کولاکوں کے لئے قطعی ہمدردی موجود نہ تھی۔ جب ہمدردی کے ضمن میں کچھ حدود وقیود موجود ہوتی ہیں، تو پھر ''اچھائی'' کے متعلق تصور کا تعین کرنے میں باہمی حدود وقیود موجود ہوتی ہیں۔ پھر ''خوشی ومسرت'' ایک ایسی چیز کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے جس سے صرف فراخ دل انسان ہی لطف اندوز ہوسکتے ہیں، یا پھر نہایت ہی طاقتور افراد اور یا پھر آریائی یا پھر محنت کش۔ یہ تمام اخلاقی ضوابط فطری اور قدرتی ہیں۔

جہاں تک ممکن ہوتا ہے، فطری اور قدرتی اخلاقیات محض زبانی نہیں، بلکہ عملی ہوتی ہیں۔ جن دو انسانوں یا جانوروں میں فطری طور پر دشمنی ہوتی ہے، اور ان میں سے جو مکمل طور پر جیت جاتا ہے، وہ اپنا اخلاقی ضابطہ نافذ کر سکتا ہے۔ اس طرح مختلف فرقوں، نسلوں، گروہوں اور قبیلوں میں

بھی فطری اخلاقیات موجود ہوتی ہے، اور ان میں سے جیتنے والا فرقہ، نسل، گروہ اور قبیلہ اپنی جبری اور استبدادی قوت کے ذریعے اپنا اخلاقی ضابطہ نافذ کرتا ہے۔

اخلاقی اختلافات عام طور پر مقاصد نہیں، بلکہ ذرائع و طریقے ہوتے ہیں۔ غلامی کو اس اعتراض کے ذریعے بُرا سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ فائدہ مند نہیں ہے، عورت کی محکومی پر اس لئے اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ آزاد خواتین کی گفتگو زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔ ستم ظریفی اور ایذا رسانی کو اس لئے بُرا سمجھا جاسکتا ہے (مکمل طور پر مبالغہ آمیزی اور اتفاقیہ) کہ اس کے ذریعے مذہبی کٹرپن، درست اور حقیقی نہیں ہوتی۔ بہر حال ان دلائل کے پیچھے عام طور پر مقاصد کے ضمن میں اختلاف اور تضاد ہوتا ہے۔ بعض اوقات مسیحیت پر نٹشے (Nietsche) (جرمن فلاسفر) کی تنقید کے ضمن میں مقاصد میں اختلاف بہت ہی واضح ہو جاتا ہے۔ مسیحی اخلاقیات میں تمام انسان برابر ہوتے ہیں۔ نٹشے کے نزدیک اکثریت ہیرو کے لئے ایک ذریعے کی حیثیت رکھتی ہے۔ سائنسی اختلافات کے مانند مقاصد کے ضمن میں اختلافات پیدا نہیں ہوسکتے بلکہ افراد کے رویوں میں تبدیلی کے باعث ہی یہ اختلافات رونما ہوتے ہیں۔ مسیحی اپنی طرف سے ہمدردی ظاہر کرنے کے لئے پُرعزم ہوتے ہیں، پھر نٹشے کے حمایتی فخر و افتخار کو ابھار سکتے ہیں۔ معاشی اور فوجی قوت، اپنے نظریات کی تبلیغ و پرچار کر سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ مقابلہ، اقتدار و اختیار کے لئے ایک عام مقابلہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی فرقہ عالمگیر مساوات کا پرچار بھی کرتا ہے تو وہ ایک فرقے پر تسلط اور غلبے کا ایک ذریعہ بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ صورت حال واقع اس وقت رونما ہوئی جب انقلاب فرانس اس مقصد کے لئے برپا ہوا کہ ہتھیاروں کی قوت کے ذریعے جمہوریت پھیلائی جائے۔

اقتدار و اختیار بھی اسی طرح اخلاقی مقابلات اور تقابلات میں مختلف ذرائع و طریقوں پر مشتمل ہے، اسی طرح سیاسیات میں بھی یہ مختلف ذرائع و طرائق پر مشتمل ہے۔ لیکن اخلاقی نظام کے ساتھ جو کہ ماضی میں بہت ہی زیادہ موثر اور بارسوخ تھا، اختیار و اقتدار اس کا نقطہ انتہا نہیں تھا۔ اگرچہ انسان ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں، ایک دوسرے کو نقصان پہنچاتے ہیں، ایک دوسرے کا استحصال کرتے ہیں، ایک دوسرے کو اذیت پہنچاتے ہیں، انہوں نے ابھی تک ان لوگوں کو عزت و احترام کا مرتبہ دیا ہے جنہوں نے ایک مختلف نظریہ زندگی کی تبلیغ و پرچار کیا۔ وہ عظیم مذاہب جن کا مقصد قدیم دور کے قبائلی اور قومی گروہی نظام کو بدلنا تھا، انہوں نے انسانوں کو یہودی، غیر یہودی،

گروہ یا غیر گروہ نہیں سمجھا بلکہ انسان سمجھا۔ ان کے بانی وہ لوگ تھے جن کی ہمدردی عالمگیر تھی اور آمر و مطلق العنان حکمرانوں اور افراد کی نسبت ان میں عقل و دانش زیادہ تھی اور پھر نتیجہ ان سب کی خواہش کے مطابق بر آمد نہیں ہوا تھا۔ اور ایک خود کار نظام کے تحت پولیس کو چاہیئے تھا کہ وہ لوگوں کے ہجوم کو مجرموں پر حملہ کرنے سے روک دیتے، اور پولیس کا یہ فرض بھی ہونا چاہیئے تھا کہ اس شخص پر شدید ناراضی کا اظہار کرتے جو زندہ جل مرنے کی امید لئے ہوئے تھا کیونکہ وہ شخص اپنی غلطی تسلیم کرنے میں تاخیر کے باعث اپنے اس ارادے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ پہلے اسے گرفتار کیا جائے اور پھر اسے جلا دیا جائے۔ بہر حال پھر بھی عالمگیر ہمدردی کے اصول پہلے تو ایک صوبے میں رائج ہوئے اور پھر دوسرے صوبے میں اس نے غلبہ حاصل کر لیا۔ یہ صورت حال عالمِ احساسات کے بالکل مماثل ہے، اور پھر غیر ذاتی تجسّس، عالم فکر و دانش کے مماثل ہے اور یہ دونوں مماثلات، ذہنی ترقی، نشو ونما اور ارتقاء کے ضمن میں لازمی عناصر ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ ایک قبائلی یا ظالمانہ اخلاقیات کا احیاء طویل مدت پر مشتمل ہو سکتا ہے، گوتم بدھ کے زمانے سے لے کر اب تک مکمل انسانی تاریخ متضاد اور مخالف صورت حال کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ بہر حال، جذباتی اقتدار و اختیار کی بھی خواہش و ہوس کی جا سکتی ہے، یہ اقتدار و اختیار ایسا نہیں ہے جسے مفکرانہ استغراق کے لئے اچھا سمجھا جا سکے۔ اس صورت حال کی تصدیق ان افراد کے کرداروں کے ذریعے ہو چکی ہے جنہیں انسان، معرفت اور روحانیت سے بہت زیادہ مزین سمجھتے ہیں۔

اس باب کی ابتدا میں جن روایتی اخلاقی اصولوں پر ہم نے غور کیا اور ان کے متعلق گفتگو کی، مثلاً فرزندانہ محبت و پیار، بیوی کی طرف سے اطاعت و فرمانبرداری، بادشاہوں کے لئے وفاداری وغیرہ، یہ روایتی اخلاقی اصول اب مکمل یا جزوی طور پر معدوم ہو چکے ہیں۔ یہ اخلاقی اصول کامیاب ہو سکتے تھے، جیسے مغربی اقوام کی نشاۃ ثانیہ کے موقع پر یہ صورت حال پیش آئی، مزید برآں اخلاقی رکاوٹ کی غیر موجودگی میں یہ اخلاقی اصول کامیاب ہو سکتے تھے۔ جیسے دورِ اصلاحات کے موقع پر یہ صورت حال پیش آئی۔ یہ اخلاقی اصول کئی طریقوں کے ذریعے ایک نئے ضابطہ اخلاق کے مطابق کام ہو سکتے تھے، اور یہ طریقے ان طریقوں سے زیادہ زبردست تھے جو فرسودہ ہو چکے تھے۔ ماضی کی نسبت مثبت اخلاقیات کے لحاظ سے ریاست کے لئے وفاداری، اہم کردار ادا کرتی ہے اور یہ صورت حال بے شک، ریاستی قوت میں اضافے کا فطری نتیجہ ہے۔

اخلاقیات کے وہ اجزاء جن کا دوسرے گروہوں کے ساتھ تعلق ہے، مثلاً خاندان اور کلیسا، ان کا پہلے کی نسبت بہت کم اثر رہ گیا ہے، لیکن مجھے اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، کہ توازن کی حالت میں اخلاقی اصول یا اخلاقی جذبات کا ایک فرد کے فعل اور عمل پر اٹھارہویں صدی یا ازمنہ وسطیٰ کی نسبت کم اثر موجود ہے۔

آیئے اب ہم اس باب کے اختتام پر ایک مختصر تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ عام طور پر قدیم معاشروں کے اخلاقی ضابطوں کو ان معاشروں میں قبول کیا جاتا ہے جن کی بنیاد مافوق الفطرت نوعیت پر مشتمل ہوتی ہے۔ جزوی طور پر ہمیں انہیں قبول کرنے اور ان پر یقین کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی لیکن کافی حد تک یہ اخلاقی ضابطے متعلقہ معاشرے میں متوازن اقتدار و اختیار کی نمائندگی کرتے ہیں۔ دیوتا، ایک زبردست طاقت کے سامنے اطاعت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں، لیکن زبردست طاقت اس قدر بے رحم نہیں ہونی چاہیئے کہ بغاوت کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ بہرحال، پیغمبروں اور دانش وروں کے اثر کے تحت ایک نئی اخلاقیات جنم لیتی ہے، بعض اوقات یہ نئی اخلاقیات پرانی اخلاقیات کے متوازی مروج ہوتی ہے اور بعض اوقات یہ پرانی اخلاقیات کے متبادل کے طور پر رائج ہو جاتی ہے۔ قطع نظر چند مستثنیات کے، پیغمبروں اور دانش وروں، حکیموں نے اقتدار و اختیار کے بجائے دانائی، انصاف، یا عالمگیر محبت کو اہمیت دی ہے اور بنی نوع انسان کے ایک غالب حصے کو باور کروا دیا ہے کہ یہ عناصر ذاتی کامیابی سے کہیں زیادہ اہم اور ضروری ہیں۔ جو لوگ اس سماجی نظام کے کچھ حصے کے ذریعے نقصان اٹھاتے ہیں جسے پیغمبر یا دانشور بدلنا چاہتے ہیں، تو پھر ان پیغمبروں اور دانشوروں کی حمایت ذاتی وجوہ کی بنا پر کی جاتی ہے، پھر ان پیغمبروں اور نیک افراد کی طرف سے اپنی ذات کی تلاش اور بے غرض اخلاقیات کے امتزاج کے باعث ایک ایسی انقلابی تحریک پیدا ہوتی ہے جس کی مزاحمت ناممکن ہوتی ہے۔

معاشرتی زندگی میں باغی رویے کے مقام کے تعین کے بارے اب ہم کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ بغاوت کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

1- قطعی ذاتی حیثیت میں بغاوت

2- وہ بغاوت جو ایک مختلف قسم کے معاشرے کی خواہش کے ذریعے پیدا ہوتی ہے جس میں یہ باغی خود کو بھی ملوث پاتا ہے۔

موخرالذکر صورت حال میں باغی کی خواہش میں دوسرے بھی شامل ہو سکتے ہیں، اکثر اوقات اس خواہش میں اس ایک قلیل اقلیت کے علاوہ سب لوگ شامل ہوتے ہیں جسے موجودہ نظام سے فائدہ پہنچا ہوتا ہے۔ اس قسم کی باغیانہ روش، ابتری وافراتفری پر مشتمل نہیں ہوتی بلکہ تعمیری اور مثبت نوعیت کی ہوتی ہے، اگرچہ یہ باغیانہ روش کبھی کبھار عارضی طور پر ابتری اور افراتفری پیدا کرتی ہے، لیکن بالآخر، اس کے باعث ایک نیا مستحکم معاشرہ تخلیق ہوتا ہے۔ یہ صورت حال ایک باغی کے بے غرضانہ کردار کو ظاہر کرتی ہے جو اسے افراتفری پیدا کرنے والے باغی سے ممتاز کرتی ہے۔ عوام الناس کے لحاظ سے صرف واقعات ہی کے ذریعے اس امر کا یقین اور فیصلہ ہوتا ہے کہ کیا باغی کے رویے کو جائز قرار دیا جائے گا۔ جب اسے جائز سمجھا جاتا ہے تو پھر سابقہ بااختیار ادارہ اپنے سابقہ موقف سے زیادہ عقلمند اور دانشمند ثابت ہوگی۔ کیونکہ اس صورت میں شدید مزاحمت کا خطرہ نہیں ہوتا۔ ایک فرد اپنی مرضی کے مطابق ایک خاص طرز زندگی اور یا پھر سماجی ہم آہنگی یا تنظیم کے طریقے کو اپنے تخیلات میں لیا سکتا ہے جس کے ذریعے موجودہ طریقے اور نظام کی نسبت ان کی خواہشات کی زیادہ بہتر طور پر تسکین کی جا سکتی ہے۔ اگر اس کا تخیلاتی عمل سچا اور درست ہوتا ہے اور وہ دوسروں کو بھی اپنے اصلاحی منصوبے کا قائل کر سکتا ہے، تو پھر وہ اپنے اس عمل میں حق بجانب ہے۔ باغیانہ صورت حال کے بغیر، انسانیت جامد ہو جاتی ہے اور اس میں سڑاند اور تعفن پیدا ہو جاتا اور ناانصافی کا کوئی علاج نہ ہوتا۔ وہ فرد، جو ایک بااختیار ادارے یا فرد کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے، مخصوص حالات میں اسے ایک قانونی اور جائز ذمہ داری اور فرض حاصل ہو جاتا ہے بشرطیکہ اس کی نافرمانی کے مقاصد ذاتی کے بجائے سماجی ہوں۔ لیکن یہ معاملہ ایسا ہے کہ اس کی مخصوص نوعیت کے پیش نظر اس کے لئے اصول وقوانین وضع نہیں کئے جا سکتے۔

سولھواں باب

فلسفہء اقتدار (اقتدار کے فلسفیانہ اصول)

اس باب کے حوالے[1] سے میرا مقصد یہ ہے کہ ان بعض مخصوص فلسفوں اور نظریات پر غور کیا جائے جو زیادہ تر ہوس اقتدار یا اقتدار کی محبت کے باعث پیدا ہوتے ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ اقتدار و اختیار ہی اصلی مقصد ہے لیکن اقتدار و اختیار کا تصور مابعد الطبیعاتی اور اس کے اخلاقی فیصلے یا رویے کے ضمن میں ایک فلسفی کا شعوری یا لاشعوری مقصد ہوتا ہے۔

جب مختلف قسم کی انسانی خواہشات مشاہدے کی بھٹی میں سے گزرتی ہیں تو پھر انسانی اعتقاد و یقین جنم لیتا ہے۔ بعض اوقات ایک عنصر کا ایک جزو بہت ہی ہلکا ہوتا ہے، اور بعض دوسرے عنصر کا ایک جزو بہت ہی ہلکا ہوتا ہے۔ تجربے اور مشاہدے کے ذریعے حاصل ہونے والے ثبوت کے ذریعے جو نظریہ یا اعتقاد قائم کیا جاتا ہے، وہ بہت معمولی اور بے وقعت اور ہلکا ہوتا ہے اور جب ہمارا اعتقاد اس سے کہیں ماورا ہوتا ہے تو پھر ان کے وجود میں آنے کے ضمن میں خواہش ایک کردار ادا کرتی ہے۔ اس کے برعکس کچھ اعتقادات ایسے بھی ہوتے ہیں جو طویل عرصے تک مروج رہنے کے باوجود اپنے نامعقول اور جھوٹے ہونے کا خود ثبوت ہوتے ہیں، حالانکہ یہ اعتقادات مزید کسی ادوار تک مروج رہ سکتے ہیں بشرطیکہ ان کی حمایت یا مخالفت میں کوئی ثبوت موجود نہ ہو۔

زندگی کی نسبت فلسفے زیادہ مربوط اور مضبوط ہوتے ہیں۔ زندگی میں ہماری بہت سی خواہشات ہو سکتی ہیں لیکن عام طور پر فلسفہ ان چند غالب خواہشات کے باعث جنم لیتا ہے جن کے باعث یہ فلسفہ زیادہ مربوط اور مضبوط ہو جاتا ہے۔

> ''دنیا اور زندگی بہت ہی مختلف چیزیں ہیں۔ میں خود کو جرمن پروفیسر کے حوالے کردوں گا جو یہ جانتا ہے کہ کس طرح زندگی کو منظم کیا جا سکتا

ہے اور اس میں سے کس طرح ایک قابلِ فہم اور معقول نظام، اخذ اور وضع کیا جا سکتا ہے۔"

فلسفیوں کے اکثر نظریات و تصورات ان کی مختلف خواہشات کے ذریعے جنم لیتے ہیں، ایک طرف تو یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس دنیا کے متعلق علم اور معلومات حاصل کی جائیں، اور کسی نہ کسی طرح ہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ خواہش یہ ثبوت فراہم کرتی ہے کہ دنیا اس قابل ہے کہ اس کے متعلق علم اور معلومات حاصل کی جائیں۔ خوشی و مسرت کا حصول بھی ایک خواہش میں شامل ہوتا ہے، اور پھر نیکی کا حصول بھی مطلوب ہوتا ہے اور ان دونوں خواہشات کا امتزاج کہ انسان میں اپنے تحفظ اور بچاؤ کی خواہش پائی جاتی ہے۔ ایک خواہش یہ بھی ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ لو لگائی جائے یا دوسرے انسان کے ساتھ تعلق قائم کیا جائے۔ اس کے علاوہ خوبصورتی، حسن، لطف انگیزی کے حصول کو بھی خواہشات کا نام دیا جا سکتا ہے، اور پھر آخر میں بلکہ سب سے بڑھ کر اقتدار و اختیار کے حصول کی خواہش بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔

عظیم مذاہب کا مقصد و منشا، اچھائی، بھلائی اور نیکی کا پرچار ہوتا ہے لیکن عام طور پر ان عظیم مذاہب کا مقصد اس سے کہیں زیادہ ماورا اور بلند ہوتا ہے۔ مسیحیت اور بدھ مت زندگی کے لئے بچاؤ اور تحفظ کا پرچار کرتے ہیں، اور اگر معرفت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو خدا یا اس کائنات کے ساتھ تعلق، ان مذاہب کا مقصد ہے۔ تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر قائم فلسفے سچ کی تلاش میں ہوتے ہیں جبکہ ڈیسکارٹس (Descartes) سے لے کر کینٹ (Kant) تک نظریاتی فلسفے، یقینیت کے حصول کو اپنا مقصد گردانتے ہیں۔ اگر عملی طور پر دیکھا جائے کینٹ (Kant) (کینٹ بھی شامل ہے) تک تمام فلسفوں کا تعلق زیادہ تر ان خواہشات سے ہوتا ہے جو انسانی فطرت کے ادراک (انسان کے عمل کا نتیجہ) حصے سے منسلک ہوتی ہیں۔ بینتھم (Bentham) اور مانچسٹر کے اندازِ فکر سے تعلق رکھنے والے فلسفی خوشی و مسرت کے حصول کو مطلوبہ مقصد سمجھتے ہیں اور دولت اس کے حصول کے ضمن میں مرکزی اور اہم ذرائع ہیں۔ جدید دور میں مروج طاقت و اقتدار کے فلسفے بڑی حد تک "مانچسٹر اندازِ فکر" کے ردِ عمل کے طور پر وجود میں آئے ہیں، اور پھر اس نقطۂ نظر کے خلاف احتجاج کے طور پر پیدا ہوتے ہیں کہ زندگی کا مقصد، خوشیوں کے تسلسل کا حصول ہے اور یہ ایک ایسا مقصد ہے جس کی دو وجوہات کی بناء پر مذمت کی گئی ہے۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ مقصد بہت ہی

زیادہ اجزا پر مشتمل ہے اور دوسرے یہ کہ یہ نامناسب اور نامعقول حد تک فعال ہے۔

چونکہ انسانی زندگی قوت ارادہ اور بے ساختہ سرزد ہونے والے افعال کے مستقل باہمی تعلق پر مشتمل ہے، جو فلسفی اس ہوس اقتدار کی بنیاد پر اپنا رویہ متعین کرتا ہے، وہ اس کردار یا عمل کو کم کرنے یا اس کی مذمت کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کی اپنی خواہش کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ میں اس وقت محض ان افراد کے متعلق نہیں سوچ رہا جو جبر و استبداد کی طاقت و حکومت کو شان و جلال بخشتے ہیں، جیسے جمہوریہ (Republic) میں میکاولی اور تھراسی میکس بلکہ میں ان افراد کے بارے سوچ رہا ہوں جو ایسے نظریات گھڑتے ہیں جن کے ذریعے مابعدالطبیعات یا اخلاقیات کے لبادے کے نیچے ان کی ہوس اقتدار چھپ جاتی ہے۔ اس قسم کے فلسفیوں میں سے سب سے پہلے اور مشہور فلسفی کا نام فشٹ (Fichte) ہے۔

فشٹ (Fichte) کے فلسفے کی بنیاد اَنا ہے جو تمام کائنات پر محیط ہے۔ اَنا، خود پرستی اور شعور خود قدری، اس کائنات میں اس لئے موجود ہے کہ یہ اپنی موجودگی کو تسلیم کر لیتی ہے۔ اگر حقیقتاً یہ اَنا اور خود پرستی کہیں موجود نہیں ہے لیکن ایک نہ ایک دن اسے تھوڑا سا دھچکا لگتا ہے جس کے باعث یہ عدم وجود میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ پھر باطنی دینیات کے برعکس استخراجی طریقے اختیار کرتی ہے لیکن جب کہ باطنی دینیات کے حامی اس استخراجی عمل کو خدا کے ساتھ منسوب کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہمدردانہ سوچ رکھتے ہیں، تو پھر فشٹ، خدا اور اَنا کے درمیان فرق کو غیر ضروری سمجھتا ہے۔ جب اَنا اور خود پرستی مافوق الفطرت صورت اختیار کر لیتی ہے تو پھر یہ فرض کرتی ہے کہ جرمن اچھے اور فرانسیسی بُرے ہیں، اور اس لئے جرمنوں کا یہ فرض اور ذمہ داری ہے کہ وہ نپولین سے جنگ کریں۔ بلاشبہ دونوں جرمن اور فرانسیسی صرف فشٹ کے فلسفے ہی کا ایک جزو ہیں لیکن جرمن، ایک اعلیٰ قسم کا جزو ہیں، یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک حتمی حقیقت کے بہت زیادہ نزدیک ہیں، جو فشٹ کی بیان کردہ اَنا اور خود پرستی ہے۔ اسکندر اور آگسٹس یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ دیوتا ہیں اور دوسروں کو ان کی اطاعت کرنی چاہیے، حکومت کے بس میں نہ ہونے کے باعث وہ اپنی ملازمت، خود پر الحاد پرستی کے الزام کے سبب کھو بیٹھا کیونکہ وہ اپنی روحانی حیثیت کا بخوبی طور پر دعویٰ اور اعلان نہ کر سکا تھا۔

یہ امر نہایت واضح ہے کہ فشٹ (Fichte) جیسا ایک فلسفی سماجی اور معاشرتی فرائض اور

ذمہ داریوں کو کسی بھی قسم کا کوئی مقام نہیں دیتا کیونکہ بیرونی دنیا، محض میرے خواب کا نتیجہ ہے۔ فلسفے کے ساتھ موافق قابل تصور اخلاقیات ''ذاتی ارتقاء'' ہے۔ بہرحال غیر منطقی طور پر ایک شخص اپنے گھرانے اور قوم کو دوسرے افراد کی نسبت زیادہ بے تکلفانہ طور پر اپنی اَنا اور خود پرستی کا حصہ سمجھ سکتا ہے، اور اس طرح ان کی زیادہ قدر کرتا ہے۔ لہٰذا نسل پرستی اور قوم پرستی اپنی خودی پر مبنی فلسفے کا نفسیاتی فطری نتیجہ ہے۔ اور اس سے بھی اہم یہ ہے کہ اقتدار و اختیار کے لئے محبت و چاہت کے باعث ایک نظریے کو ہی تحریک ملتی ہے اور اقتدار و اختیار، صرف دوسروں کی مدد کے ذریعے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اس تمام چیز کو 'مثالیت' کہتے ہیں اور اسے اس فلسفے سے اخلاقی طور پر زیادہ بہتر سمجھا جاتا ہے جو بیرونی دنیا کی حقیقت کو تسلیم و قبول کرتی ہے۔

فلسفے کے لحاظ سے کسی حدود و قیود اور رکاوٹ کے بغیر میری خواہش ''سچائی'' کے تصور و تخیل پر مشتمل ہے۔ ایک معقول فہم و دانائی کے تناظر میں میرے اعتقادات کی سچائی، اکثر اوقات کسی ایسی چیز پر منحصر نہیں ہوتی جسے میں انجام دے سکتا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ اگر مجھے یقین ہوتا تو میں اپنا ناشتہ کل کھاؤں گا، اگر میرا یقین و اعتقاد سچا اور درست ہے، تو پھر جزوی طور پر یہ میرے مستقبل میں موجود قوتِ ارادی کے باعث ہی ہے۔ لیکن اگر میں یہ سمجھوں کہ سیزر کو Ides of March پر قتل کیا گیا تھا، تو پھر میرے اس یقین و اعتماد کے سچ اور درست ہونے کا انحصار میری قوتِ خواہش سے باہر ہے۔ ہوسِ اقتدار اور اقتدار کے لئے محبت و چاہت کے ذریعے جنم لینے والے فلسفے اس صورت حال کو اپنے لئے تلخ اور ناخوشگوار پاتے ہیں اور اس لئے حقائق معقول انداز اور عمومی فہم و دانائی کی حیثیت کو اعتقادات کے جھوٹ یا سچ ہونے کے ذریعوں کے طور پر مختلف طریقوں کے ذریعے کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جرمن فلسفی ہیگل کے پیروکار اور حامی یہ سمجھتے ہیں کہ سچ، حقائق کے موافقت میں مضمر نہیں ہے بلکہ سچ ہمارے اعتقادات و عقائد کے مجموعی نظام کی فطری مطابقت و موافقت میں مضمر ہے۔ ایک اچھے ناول میں مذکور واقعات کے مانند اگر آپ کے تمام عقائد اور اعتقادات ایک دوسرے سے منطبق ہو جائیں تو پھر درحقیقت ایک ناول نگار اور ایک مورخ کے سچ کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ اس نظریے کے باعث تخلیقیت، انفرادی ذوق کا اظہار ہر قسم کی رکاوٹوں سے آزاد ہو جاتا ہے جو اس کو فرضی ''حقیقی'' دنیا کے شکنجے سے آزاد کر دیتا ہے۔

عملی نقطہ نظر اپنی کسی نہ کسی صورت میں طاقت واقتدار کا فلسفہ ہوتا ہے۔ عملی نقطہ نظر کے لحاظ سے ایک عقیدہ اس وقت ''درست اور سچ'' ہوتا ہے جب اس کے نتائج خوشگوار ہوتے ہیں۔ اب ایک انسان اپنے عقیدے کے نتائج کو خوشگوار یا ناخوشگوار بنا سکتا ہے۔ ایک آمر کے اعلیٰ ترین استحقاق کے لحاظ سے اعتقاد اور یقین کے نتائج بدعقیدگی سے زیادہ خوشگوار ہوتے ہیں۔ اس لئے عملی فلسفہ ان ارباب اختیار کو ایک فلسفیانہ طاقت وقوت مہیا کرتا ہے جو ایک ناقابلِ تصور فلسفہ انہیں مہیا نہیں کر سکتا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اکثر عملی لوگ اپنے فلسفے کے ان نتائج کو قبول کرتے ہیں، میرے کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ نتائج ہیں اور سچائی کے بارے میں ایک عام نقطہ نظر پر عملی قسم کے لوگوں کا حملہ اقتدار واختیار سے پسندیدگی کا نتیجہ ہوتا ہے، حالانکہ شاید انسانوں پر اقتدار واختیار کی نسبت اس قسم کا اقتدار واختیار زیادہ بے روح و بے جان نوعیت کا ہوتا ہے۔

برگ سن (Bergson) کا ''تخلیقی ارتقاء'' کا نظریہ، اقتدار و اختیار کا فلسفہ ہے جسے برنارڈ شا (Bernard Shah) کے ڈرامے Back of Methuselah کے آخری منظر میں نہایت ہی شاندار طور پر پیش کیا گیا ہے۔ برگ سن (Bergson) کا موقف یہ ہے کہ ذہانت و فراست کی ناجائز طور پر مایوس کن اور محض استغراقی ہونے کے بنا پر مذمت کرنی چاہیئے، اور ہم اس عمل کو فوجی گھڑ سوار دستوں کی پیش قدمی (حملے کے لئے) کے مانند شدید اور جارحانہ اقدام کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ جانوروں نے اس لئے آنکھیں حاصل کیں کیونکہ انہوں نے محسوس کیا کہ دیکھنا ان کے لئے خوش گوار ثابت ہوتا، اور ان کی عقل وذہانت دیکھنے کے عمل کے بارے سوچ بھی نہیں سکتی تھی، کیونکہ وہ نابینا تھے، ان کا وجدان ہی یہ معجزہ انجام دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کے نقطہ نظر کے مطابق ہر قسم کی ارتقاء، خواہش کے باعث ہے اور اگر خواہش میں مناسب جذبہ موجود ہو تو پھر لامحدود طور پر ان خواہشات کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ حیاتیاتی سائنسدانوں کی طرف سے زندگی کی ساخت اور اس کے طریقہ کار کو سمجھنے اور ڈھونڈنے کی کوشش ناکام ہوتی ہے کیونکہ زندگی میکانکی عمل نہیں ہے اور اس کی ارتقاء ہمیشہ ہی اس طور پر ہوتی ہے کہ ذہانت شروع ہی سے اسے دیکھنے سے قاصر رہی ہے، اور صرف عملی تجربے کے ذریعے زندگی کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ افراد کو جذباتی اور غیر منطقی ہونا چاہیئے، خوش قسمتی یہ ہے کہ برگ سن کے رویے کی تسکین کی خاطر عام طور پر لوگ اسی طرح ہوتے ہیں۔

کچھ فلسفی اپنی ہوسِ اقتدار کو اپنے فلسفے پر حاوی نہیں ہونے دیتے بلکہ انہیں اخلاقیات کے تناظر میں آزادانہ عالم مہیا کرتے ہیں۔ ان فلسفیوں میں سے سب سے اہم نٹشے ہے جو مسیحیت کی غلامانہ اخلاقیات کو مسترد کر دیتا ہے اور اس کی بجائے ایک ایسی اخلاقیات مہیا کرتا ہے جو بہادر حکمرانوں کے لئے مناسب ثابت ہوتی ہے۔ بے شک و شبہ، یہ اصول و نظریہ قطعی نیا ہے۔ اس اصول و نظریے کا کچھ شائبہ ہرکولیس میں پایا جاتا ہے، کچھ شائبہ افلاطون میں پایا جاتا ہے، اور زیادہ شائبہ نشاۃ ثانیہ میں پایا جاتا ہے۔ لیکن نٹشے کے نزدیک یہ شعوری طور پر ایسا متعین ہوتا ہے جو انجیل مقدس کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اس کے نقطہ نظر کے مطابق ایک گروہ کی اپنے ہیرو کی عظمت کے علاوہ اپنے طور پر کوئی اہمیت نہیں ہے، اور وہ اپنی ذاتی اہمیت میں اضافہ کرنے کے لئے انہیں نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ عملی طور پر، طبقہ امراء کی حکومت کے افراد ہمیشہ وہ طریقہ اختیار کرتے ہیں جو کس حد تک اخلاقیات کے لحاظ سے جائز ثابت ہو سکتا ہے لیکن مسیحی فلسفے کے مطابق خدائی نظر میں تمام انسان برابر ہیں۔ جمہوریت اپنی حمایت کے لئے مسیحیت کے لئے پسندیدہ ثابت ہو سکتی ہے لیکن طبقہ امراء کی حکومت کے لئے نٹشے کا اخلاقی نظریہ ہی بہترین ہے۔ یعنی ''اگر خدا/ دیوتا ہوتے تو میں پھر کس طرح برداشت کرتا کہ میں خدا نہیں، اس لئے خدا/ دیوتا بھی نہیں ہیں۔ اس لئے نٹشے کے زاراتھرسٹا (Zarathrusta) کا کہنا ہے'' زمینی ظالم و جابر حکمرانوں کے لئے خدا کو تخت سے اتار دینا چاہیے۔''

اقتدار و اختیار کے لئے پسندیدگی، متوازن اور عمومی انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے۔ لیکن اقتدار و اختیار کے فلسفے ایک مخصوص واضح اندازِ فکر کے تناظر میں سمجھ و عقل سے عاری ہیں۔ مادے اور انسانوں پر مشتمل دونوں بیرونی کائناتوں کی موجودگی، ایک ایسی صنف ہے جو فخر و افتخار کی ایک مخصوص قسم کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں لیکن صرف ایک پاگل شخص ہی ان کو ماننے سے انکار کر سکتا ہے۔ جو لوگ ہوسِ اقتدار کے باعث دنیا کے متعلق ایک غیر تعمیری اور تخریبی رویہ اپنا لیتے ہیں، وہ دنیا کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں۔ ایک شخص سوچے گا کہ وہ بنک آف انگلینڈ کا گورنر ہے، دوسرا سوچے گا کہ وہ بادشاہ ہے اور حتیٰ کہ ایک اور شخص یہ سوچے گا کہ وہ (نعوذ باللہ) خدا ہے۔ اگر ایک تعلیم یافتہ فرد نے غیر واضح اور ناقابلِ فہم زبان میں اعلیٰ سطحی دلفریبی اور دھوکے بازی پر مبنی رویے کا اظہار کیا ہوتا تو وہ فلسفے کا پروفیسر بن جاتا، اور اگر ایک شخص جذباتی انداز میں

فصیح و بلیغ انداز میں اعلیٰ سطحی دلفریبی اور دھوکے بازی پر مبنی رویے کا اظہار کرتا تو وہ آمر بن جاتا۔ مستند پاگل اور جنونی اس لیئے بند کر دیئے جاتے ہیں کیونکہ جب ان کے مخصوص رویے پر اعتراض کیا جاتا ہے تو وہ تشدد کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ اور پھر غیر مستند پاگل اور جنونی افراد کو طاقت ور افواج کی کمان سونپ دی جاتی ہے اور وہ اپنی رسائی میں شامل تمام سمجھدار اور عقلمند انسانوں کو موت اور آفت میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ ہمارے ادب، فلسفے اور سیاست میں بھی پاگل پن اور جنونی پن کی کامیابی ہمارے دور کا ایک نہایت ہی عجیب و غریب اور انوکھا معمول ہے، اور پاگل و جنونی پن کی کامیاب صورت و قسم ہوسِ اقتدار کے باعث ہی تقریباً قطعی طور پر جنم لیتی ہے۔

اس صورت حال سے آگاہ ہونے اور ادراک حاصل کرنے کے لئے ہمیں اقتدار و اختیار کے فلسفوں اور معاشرتی زندگی کے درمیان تعلق پر لازماً غور کرنا ہوگا جو توقع کے برعکس کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ سب سے پہلے ہم عندیت (ذات اور خودی) پر غور کرتے ہیں۔ جب فشٹ (Fichte) یہ کہتا ہے کہ ہر چیز کی ابتدا انا اور خود پرستی سے ہوتی ہے تو پھر قاری یہ نہیں کہتا کہ "ہر چیز کی ابتدا، جوہان گوٹلیب فشٹ (Johan Gottlieb Fichte) سے ہوتی ہے، کیسا مہمل نظریہ ہے! میں اس کے متعلق چند دن پہلے تک کیوں نہیں جانتا تھا، اور اس کی پیدائش سے پہلے کارنامہ کیسا تھا؟ کیا وہ واقعی یہ تصور کرتا ہے کہ اس نے انہیں ایجاد کیا۔ یہ کیسی مضحکہ خیز دلفریبی ہے۔" میں دہراتا ہوں کہ یہ وہی چیز ہے جسے قاری نہیں کہتا، وہ اپنے آپ کو فشٹ (Fichte) کے متبادل کے طور پر پیش کرتا ہے اور اپنی اس دلیل کو غیر معقول تصور نہیں کرتا ہے۔ وہ سوچتا ہے "بہر حال مجھے ماضی کے ادوار کے بارے کیا معلوم ہے؟ صرف یہی کہ مجھے چند مخصوص تجربات حاصل ہوئے جن کی میں اپنے پیدائش سے پہلے کے دور سے تعلق رکھنے کی بنا پر ان کی تشریح اور وضاحت کرتا ہوں۔ اور میں ان مقامات کے متعلق کیا جانتا ہوں جنہیں میں نے کبھی دیکھا بھی نہیں؟ میں نے انہیں نقشوں پر ہی دیکھا ہے، ان کے متعلق پڑھا ہے یا کسی نے مجھے ان کے متعلق بتایا ہے۔ اگر میں خود کو (نعوذ باللہ) خدا کی جگہ رکھتا اور یہ کہتا کہ یہ دنیا تو میری تخلیق ہے، کسی بھی طرح یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ میں غلطی پر ہوں۔" فشٹ (Fichte) اور جان سمتھ اس دلیل کے مطالعے کے بعد یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جان سمتھ صرف ایک ہے قطع نظر اس کے کہ اس کے متعلق فشٹ (Fichte) کیا کہتا ہے۔

اسی طریقے کے ذریعے عندیت (ذات اور خودی) کے لئے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ ایک

مخصوص قسم کی معاشرتی زندگی کی بنیاد بن سکے۔ پاگلوں کا ایک گروہ، جن میں سے ہر ایک خود کو خدا سمجھتا ہے، ایک دوسرے کے ساتھ نہایت مہذبانہ سلوک کرنے کے طور طریقے سیکھ سکتا ہے۔ لیکن یہ شائستگی اور تہذیب اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک ہر خدا یہ سمجھتا ہے کہ اس کی زبردست حاکمیت وقوت کو کسی بھی قسم کے دیگر روحانی وجود سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اگر مسٹر اے (A) خود کو خدا سمجھتا ہے تو وہ دیگر خداؤں کے افعال اس وقت برداشت کرے گا جب تک اس کے مقاصد ان افعال واعمال کے باعث متاثر نہیں ہوں گے لیکن اگر مسٹر بی (B) ان کے مقاصد میں رکاوٹ ڈالتا ہے اور یہ ثابت کر دیتا ہے کہ وہ واحد زبردست قوت نہیں ہے، مسٹر اے (A) کا غیض وغضب بھڑک اٹھے گا اور وہ سمجھے گا کہ مسٹر بی (B) شیطان ہے یا اس کا ایک چیلا ہے۔ بلاشبہ مسٹر بی (B) کا بھی مسٹر اے (A) کے بارے یہی نقطہ نظر ہوگا۔ ہر ایک شخص ایک جماعت بنا لے گا اور پھر ایک دینی، تلخ، ظالمانہ اور پاگلانہ جنگ ہوگی۔ فرض کریں مسٹر اے (A) ہٹلر ہے اور مسٹر بی (B) سٹالن ہے اور تمہارے سامنے ایک جدید دنیا کا منظر نامہ ہے۔ ہٹلر کہتا ہے "میں وطان (Wotan) ہوں۔" سٹالن کہتا ہے "میں وسیع وعریض ساز وسامان کا مالک ہوں۔" اور چونکہ ہر ایک کے دعوے کے پیچھے افواج، طیاروں، زہریلی گیسوں اور معصوم پُر جوش اور سرگرم کارکنوں پر مشتمل وسیع ذرائع اور وسائل کی صورت میں زبردست طاقت موجود ہے، اس لئے دونوں افراد کے پاگل پن کو کوئی محسوس نہیں کرتا۔

اور پھر نٹشے (Nietzsche) کی بہادرانہ نوعیت پر غور کیجئے جس کی خاطر پھوہڑ، بھدے اور نامعقول لوگ قربان کر دیئے جاتے ہیں۔ بلاشک وشبہ، ان کے کارناموں کے معترف قاری کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ وہ بذات خود ہیرو ہے جب وہ بدمعاش جو ناجائز سازشوں کے ذریعے اس سے آگے بڑھ گیا ہے، وہ بھی ان پھوہڑ، بھدے اور نامعقول افراد میں سے ایک ہے۔ پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ نٹشے کا فلسفہ شاندار ہے۔ لیکن اگر فلاں شخص اسے اپناتا ہے اور اس کی تعریف بھی کرتا ہے، تو پھر یہ فیصلہ کس طرح ہوگا کہ کون ہیرو ہے؟ ظاہر ہے کہ ایک شخص جنگ کے ذریعے ہی ہیرو بن سکتا ہے۔ اور جب ان میں سے ایک نے فتح حاصل کر لی، تو پھر اقتدار پر قابض ہو جانے کے ذریعے اسے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ "ہیرو" کے لقب کا حقدار ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اسے ایک سخت گیر خفیہ پولیس قائم کرنا ہوگی، وہ قتل ہو جانے کے خوف میں مبتلا رہے گا، ہر شخص

دہشت زدہ ہوگا اور قوم کو ڈرپوک اور گھٹیا بنانے کے ذریعے ہی اس کے "ہیروازم" کا خاتمہ ہوگا۔

اسی قسم کی مشکلات عملی نظریے کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں کہ ایک عقیدہ اس وقت سچ اور درست ہوتا ہے جب اس کے نتائج خوش گوار اور مسرت انگیز ہوں۔ کس کے لئے خوش گوار اور مسرت انگیز ثابت ہوں؟ سٹالن پر اعتماد و یقین اس کے لئے باعث مسرت ہے لیکن ٹراٹسکی (Trotsky) کے لئے مسرت انگیز اور خوش گوار نہیں ہے۔ نازیوں کے لئے ہٹلر پر بھروسا اور یقین مسرت انگیز اور خوشگوار ہے لیکن ان لوگوں کے لئے ناخوشگوار اور تلخ ہے جنھیں اس نے جنگی کیمپوں میں قید رکھا۔ اس سوال کے جواب کا فیصلہ صرف جبر و استبداد کی حکومت کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔ کون خوش گوار نتائج سے لطف اندوز ہوگا جو یہ ثابت کرتا ہے کہ ایک عقیدہ سچ ہے؟

اقتدار و اختیار کے فلسفے، اس وقت اپنا استرداد کرتے ہیں جب ان کے معاشرتی نتائج کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اگر اس عقیدے پر کوئی بھی یقین نہیں کرتا کہ میں خدا ہوں، تو پھر میں اپنا یہ دعویٰ ترک کر دوں گا، اگر دوسرے بھی اس پر یقین کر لیتے ہیں اور اس دعوے میں شامل ہو جاتے ہیں تو پھر ایک جنگ ہوتی ہے جس میں ممکنہ طور پر میں تباہ ہو جاتا ہوں۔ ہیرو کے عقیدے کے باعث ایک بزدل قوم وجود میں آتی ہے۔ اگر عملی اقدامات اور کارروائیوں پر بہت زیادہ یقین کر لیا جائے تو پھر جبر و استبداد کی حکومت قائم ہو جاتی ہے جو نہایت ہی تلخ اور ناخوشگوار ہوتی ہے، اس لئے اس کے اپنے معیار کے مطابق عملی قدم اور کارروائی پر یقین تلخ اور ناخوشگوار ہوتا ہے۔ اگر معاشرتی زندگی کا مقصد معاشرتی خواہشات کی تکمیل ہو تو پھر اس کی بنیاد ایک ایسے فلسفے پر ہونی چاہئے جو ہوسِ اقتدار یا اقتدار کے لئے پسندیدگی میں سے اخذ شدہ نہ ہو۔

سترہواں باب

آدابِ اقتدار (اقتدار کے اسلوب و آداب)

گذشتہ صفحات میں ہم زیادہ تر ان برائیوں کے متعلق غور و فکر کرتے رہے جو اقتدار و اختیار سے منسلک تھیں، اور یہ کہ ان کے باعث ایک سادہ نتیجے کا جنم ایک فطری عمل ہے، اور ایک فرد کے لئے زندگی گزارنے کا بہتر طریقہ پیش کیا جا سکتا ہے، اور پھر کسی اچھے یا بُرے مقصد کے لئے دوسروں پر اثر انداز ہونے کے ضمن میں کیے جانے والی کوششوں سے مکمل لاتعلقی کا اظہار ہے۔ لاؤتسی (LaoTse) سے اب تک، یہ نقطہ نظر صاحبانِ خطابت اور صاحبانِ علم و دانش دونوں کا پسندیدہ نظریہ رہا ہے۔ اس نظریے کو بے شمار صوفیوں، عابدوں، زاہدوں، جوگیوں نے اپنایا ہے۔ جن کے نزدیک ذاتی تقدیس قابلِ قدر تھی، انہوں نے بھی اس نظریے کو اپنا جزوِ ایمان بنایا ہے۔ ان سب لوگوں نے اس نظریے کو کسی عملی قدم یا فعل کے بجائے ذہنی کیفیت اور حالت متصور کیا ہے۔ اگرچہ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ان میں سے کچھ افراد انسانیت کے لئے بہت ہی زیادہ مفید اور رحم دل تھے، لیکن میں ان افراد کے ساتھ متفق نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ اس لئے اس نظریے کے پاسدار اور حامی تھے کہ ان کے بقول انہوں نے اقتدار و اختیار سے لاتعلقی اختیار کر لی تھی، اور اس لاتعلقی کی کئی اقسام تھیں۔ اگر انہوں نے اقتدار کو مکمل طور پر ترک کیا ہوتا تو وہ اپنے نظریات کا اظہار نہ کرتے اور دنیا کے لئے مفید اور رحم دل ثابت نہ ہوتے۔ انہوں نے اس اقتدار و اختیار سے لاتعلقی اختیار کی جو مجبوراً اور زبردستی مسلط کیا جاتا ہے، اور انہوں نے اس اقتدار و اختیار سے لاتعلقی اختیار نہیں کی جس کے باعث وہ مختلف قسم کی تحریکات یا دیگر حالات و واقعات کے باعث متوجہ ہو جاتے ہیں۔

اگر وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو اقتدار کے لئے خواہش و امنگ، انسانی یا غیر انسانی

بیرونی دنیا پر اپنے اثرات ثبت کرنے کی توقع کا اظہار ہے۔ یہ خواہش، انسانی فطرت کا ایک لازمی حصہ ہے اور مستعد، ہوشیار اور زیرک افراد میں یہ خواہش بدرجہ اتم اہم اور کثیر حصے کے طور پر موجود ہوتی ہے۔ ہر خواہش، اگر اس کی فوری طور پر تکمیل نہ ہو سکے، ایک ایسی خواہش کو جنم دیتی ہے جس کے ذریعے اس کی تکمیل کے لئے صلاحیت پیدا ہو سکے، اور اس لئے یہ بھی اقتدار کی خواہش کی ایک قسم ہے۔ یہ اصول بہترین کے علاوہ بدترین خواہشات کے لئے بھی قطعی سچ اور درست ہے۔ اگر آپ اپنے ہمسائے کو پسند کرتے ہیں اور اس سے پیار کرتے ہیں، تو آپ اسے خوش کرنے کے لئے قوت و صلاحیت حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں گے۔ لہٰذا اقتدار کے لئے پسندیدگی کی تمام اقسام کی مذمت اور ان کا استرداد، اپنے ہمسائے کے لئے محبت و پسندیدگی کی مذمت اور استرداد ہے۔

بہر حال، ایک ذریعے کے طور پر اقتدار کی خواہش اور بذاتِ خود ایک مقصد کے طور پر خواہشِ اقتدار میں بہت زیادہ فرق ہے۔ ایک شخص جو ایک ذریعے کے طور پر اقتدار حاصل کرنا چاہتا ہے، اس کی پہلے کچھ اور خواہش موجود ہوتی ہے، اور پھر اس میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ اس خواہش کے حصول کے قابل ہوتا۔ ایک شخص جو ایک مقصد کے طور پر حصولِ اقتدار کی خواہش اپناتا ہے، اس کا ہدف یہ ہوگا کہ کسی نہ کسی طرح اس کے حصول کا امکان پیدا ہو جائے۔ مثال کے طور پر، سیاست کے میدان میں ایک شخص کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ بعض طرائق کارگر ثابت ہوں، اور اس طرح وہ عوامی معاملات میں حصہ لینے کی خواہش پیدا کر لیتا ہے، جبکہ ایک دوسرا شخص جو صرف ذاتی کامیابی کا خواہش مند ہوتا ہے، اس قسم کی منصوبہ بندی پر عمل کرتا ہے جو اس کی کامیابی پر منتج ہو۔

یسوع مسیح کو بھٹکانے اور گمراہ کرنے کے لئے جو تیسری پیشکش کی گئی، وہ اس فرق کو واضح کر دیتی ہے۔ یسوع مسیح کو اس تمام کرۂ ارض کی بادشاہی کی پیشکش کی گئی بشرطیکہ وہ شیطان کے آگے جھک جائیں اور اس کی عبادت کریں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہیں چند مخصوص مقاصد کے حصول کے لئے اقتدار و اختیار کی پیشکش کی گئی لیکن یہ مقاصد یسوع مسیح کے پیش نظر نہ تھے۔ یہ ایک ایسی پیشکش تھی جس کے ذریعے آج کی جدید دنیا کا ہر شخص پھسل سکتا تھا۔ بعض اوقات یہ پیشکش براہ راست ہوتی ہے اور بعض اوقات یہ پیشکش بالواسطہ ہوتی ہے۔ اگر وہ

سوشلسٹ ہے لیکن وہ ایک قدامت پرست اخبار میں منصب قبول کر سکتا ہے، یہ نسبتاً براہ راست شکل ہے۔ وہ پُرامن ذرائع کے ذریعے سوشلزم کے مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے اور کمیونسٹ اس لئے نہیں بنتا کہ اس طرح وہ اپنا مطلوبہ مقصد حاصل کرے گا بلکہ کمیونسٹ اس لئے بن جاتا ہے کہ کچھ نہ کچھ تو حاصل ہو ہی جائے گا۔ اپنی مطلوبہ خواہشات کے حصول کے لئے کامیاب کوششیں کریں جو اس کے مقاصد پر مبنی نہیں ہیں۔ لیکن اگر اس کی خواہشات ذاتی کامیابی سے علیحدہ ہوتی ہیں تو پھر اس کی یہ خواہشات زبردست اور قطعی ہوتی ہیں اور کامیابی کے حصول کے لئے اگر وہ اپنے مقاصد تبدیل کرتا ہے تو اس کا یہ عمل اس مرتد کے مترادف ہے جسے ''شیطان کی عبادت'' کہا جا سکتا ہے۔

اگر خواہش اقتدار کی نوعیت رحم دلی اور نیکی پر استوار ہونا مقصود ہو تو پھر اس کا تعلق لازمی طور پر اقتدار و اختیار کے علاوہ کسی اور مقصد سے ہونا چاہیے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ اقتدار کے حصول کی خاطر اقتدار کی خواہش و پسندیدگی نہیں ہونی چاہیے، اس مقصد کے حصول کے لئے یقینی طور پر ایک فعال کردار کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، بلکہ میرے کہنے سے مراد یہ ہے کہ اور مقصد کے لئے خواہش اس قدر شدید اور زبردست ہونی چاہیے کہ اقتدار و اختیار بھی اس خواہش کی اس وقت تک تسکین نہیں کر سکتا جب اس کا بھی یہی مقصد نہ ہو۔

محض یہ کافی نہیں ہے کہ اقتدار و اختیار کے حصول کے علاوہ بھی کوئی اور مقصد ہونا چاہیے، یہ ضروری ہے کہ اگر یہ مقصد حاصل ہو جائے تو اس کے ذریعے دوسروں کے مقاصد کی تکمیل میں مدد و معاونت حاصل ہو سکے۔ اگر آپ کوئی نظریہ یا چیز دریافت کرنا چاہتے ہیں، یا ایک معیاری تخلیق کرنا چاہتے ہیں، یا پھر انسانی محنت کو کم کرنے والی مشین ایجاد کرنا چاہتے ہیں، اگر آپ کامیاب ہو جاتے ہیں تو آپ کی یہ کامیابی آپ کے علاوہ دوسروں کی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر خواہشِ اقتدار نیک اور رحم دل ہوتا ہے تو یہ دوسری شرط ہے جو اسے لازمی طور پر پوری کرنا پڑے گی۔ زیادہ صاف اور واضح انداز میں اگر بیان کیا جائے تو اس خواہش اقتدار کا تعلق لازمی طور پر کسی ایسے مقصد سے ہونا چاہیے جو ان لوگوں کی خواہشات کے ساتھ منطبق ہو جو اس مقصد کے حاصل ہونے کی صورت میں متاثر ہوں گے۔

اس ضمن میں تیسری شرط بھی موجود ہے جس کی تشکیل و تکمیل قدرے زیادہ مشکل ہے۔

اپنے مقصد کے حصول کے لئے اختیار کئے گئے ذرائع لازمی طور پر ایسے نہیں ہونے چاہئیں جن کے بطور خاص بُرے اثرات مرتب ہوں جن کے باعث مطلوبہ مقاصد کی شاندار اور عظیم نوعیت میں اضافہ ہو جائے۔ کسی شخص کے ساتھ پیش آنے والے حالات و واقعات کے باعث اس کے کردار اور مقاصد میں مسلسل تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔ تشدد اور ناانصافی کے ذریعے تشدد اور ناانصافی ہی جنم لیتی ہے۔ تشدد اور ناانصافی، جن کے ہاتھوں انجام پاتی ہے اور جو لوگ اُن کا شکار ہوتے ہیں، تشدد اور ناانصافی ان دونوں افراد کو متاثر کرتی ہے۔ اگر شکست مکمل نہ ہو تو اس کے باعث طیش و غیض و غضب اور نفرت پیدا ہوتی ہے، اور اگر شکست قطعی نہ ہو تو اس کے باعث بے حسی اور بے فعالی پیدا ہوتی ہے۔ قوت و طاقت کے بل پر فتح کے باعث بے رحمی اور محکوموں کے لئے تحقیر داہانت جنم لیتی ہے؛ بہر حال سرفرازیت جنگ کا بنیادی مقصد ہو سکتا ہے۔ یہ تمام احوال و مباحث جبکہ ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا طاقت کے ذریعے کبھی کوئی نیک مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا، لیکن ان سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ طاقت ایک بہت ہی خطرناک چیز ہے اور جب یہ بہت ہی زیادہ مقدار میں موجود ہو، تو پھر کوشش کے ختم ہونے سے پہلے ہی حقیقی نیک مقصد نظروں سے اوجھل ہو سکتا ہے۔

بہر حال، مہذب معاشروں کا قیام کچھ نہ کچھ طاقت و قوت کی موجودگی کے بغیر ناممکن ہے۔ کیونکہ ان معاشروں میں مجرم پیشہ افراد بھی ہوتے ہیں، سماج دشمن عناصر بھی ہوتے ہیں۔ اگر ان پر کڑی نظر نہ رکھی جائے تو وہ پھر جلد ہی معاشروں میں ابتری اور ظلم و ستم کا بازار گرم کر دیں گے۔ جہاں قوت و طاقت موجود نہ ہو، وہاں یہ فرض فوجداری قانون میں درج ایک آئینی ادارے کے ذریعے انجام پائے گا۔ بہر حال، اس مرحلے پر دو مشکلات موجود ہیں: پہلی مشکل یہ کہ قوت و طاقت کے سب سے اہم استعمالات مختلف ریاستوں کے درمیان ہوتے ہیں جہاں ایک مشترکہ حکومت موجود نہیں ہوتی اور نہ ہی وہاں ایک موثر تسلیم شدہ قانونی یا عدالتی ادارہ موجود ہوتا ہے، دوسری مشکل یہ ہے کہ حکومت کے ہاتھ میں یہ طاقت و قوت مرتکز ہونے کے بعد، حکومت معاشرے کے باقی افراد کو بھی کچھ حد تک اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنا سکتی ہے۔ ان دونوں مشکلات کے بارے میں اگلے باب میں مفصل ذکر کروں گا۔ اس باب میں، میں حکومت کے لحاظ سے نہیں بلکہ انفرادی اخلاقیات کے لحاظ سے طاقت و قوت کے بارے آپ کو معلومات مہیا کر رہا ہوں۔

نفسانی خواہشات کے ماتحت، اقتدار کی خواہش ایک ایسے زبردست مقصد کی حیثیت رکھتی ہے جو افراد کے افعال واعمال پر ان کی توقع سے بھی زیادہ اثرات مرتب کرتی ہے۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ آداب واخلاقیات جو بہترین نتائج پیدا کریں گے، وہ خواہش اقتدار کے لئے منطقی نوعیت سے بھی زیادہ مہلک اور ہولناک ہوں گے۔ کیونکہ افراد اقتدار کے حصول کی خاطر اپنے ہی بنائے ہوئے ضابطوں کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوں گے، اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان کے اقدامات اور کارروائیاں اس وقت کچھ حد تک درست تسلیم کئے جائیں گے اگر ان کے مقابلے بھی سخت گیر اور شدید ہوں گے۔ بہر حال ایک شخص جو ایک اخلاقی نظریہ پیش کر رہا ہے، بہت مشکل سے ہی مندرجہ بالا تصریحات سے متاثر ہو سکتا ہے، کیونکہ اگر وہ متاثر ہو جاتا ہے تو پھر وہ نیک مقاصد کے لئے شعوری طور پر جھوٹ بولنے پر مجبور ہوگا۔ ایک سچا انسان نیتے کی نیست روحانی مقام حاصل کرنے کی خواہش، مبلغوں اور مصلحوں کے لئے معصیت کا باعث ہوگا، اور محض زبانی طور پر اس نظریے کی حمایت میں کیا کہا جا سکتا ہے، عملی طور پر یہ کم نقصان دہ نہیں ہے۔ ہمیں یہ اعتراف کر لینا چاہئے کہ خواہش اقتدار کے لئے افراد چھوٹے اور بڑے اقدامات اٹھاتے ہیں، اور وہ اسی طرح کرتے رہیں گے لیکن ہم اس ضمن میں یہ نہیں کہنا چاہیں گے کہ خواہش اقتدار ان صورتوں اور حالات میں مطلوبہ مقاصد میں شامل نہیں جہاں ہم سمجھتے ہیں کہ یہ خواہش اقتدار فائدہ مند یا کم از کم بے ضرر ثابت ہوتی چاہئے۔

ایک شخص اقتدار کی خواہش کی جو مختلف اقسام اپنے لئے اپناتا ہے، ان کا انحصار اس کے مزاج، قوت برداشت، اسے حاصل ہونے والے مواقعوں اور اس کی مہارت پر ہوتا ہے۔ مزید برآں، اس کا مزاج اور قوت برداشت کافی حد تک اس کے حالات کے باعث تشکیل پاتی ہے۔ ایک شخص کی خواہش اقتدار کو مختلف مخصوص چیزوں کے حصول کی خواہش میں بدلنے کے لئے لامحالہ طور پر موافق حالات، مواقع اور مناسب مہارت درکار ہوتی ہے۔ اس طریقے کے ذریعے اس کے پیدائشی/فطری رجحان ومیلان کے متعلق پتا چلتا ہے جس کی اصلاح بھی کی جا سکتی ہے اور یہ اصلاح، اصلاح نسل کے لئے ہوتی ہے لیکن شاید آبادی کی ایک قلیل تعداد ہی کو مندرجہ بالا ذرائع کے ذریعے کچھ مفید سرگرمیوں کا انتخاب کرنے کی طرف متوجہ نہیں کیا جا سکتا۔

جب ہم ان حالات سے ابتدا کرتے ہیں جو مزاج اور قوت برداشت پر اثر انداز ہوتے

ہیں، تو پھر ظالمات ہوس کے ماخذ عام طور پر ایک بدقسمت بچے یا پھر کسی واقعے، خانہ جنگی میں پائے جاتے ہیں، جہاں مصائب اور اموات کثرت سے رونما ہوتی ہیں، تو پھر بلوغت اور اوائلِ جوانی میں قوت و توانائی کے اظہار و اخراج کے قانونی ذریعے کی عدم موجودگی کے اثرات یکساں ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ چند افراد ہی ظالم ہوتے ہیں بشرطیکہ انہوں نے بچپن میں انتہائی معقول تعلیم حاصل کی ہوتی، انہوں نے تشدد کی فضا میں زندگی بسر نہ کی ہوتی اور ایک پیشہ تلاش کرنے کے ضمن میں غیر ضروری تکلیف نہ اٹھائی ہوتی۔ اس قسم کے حالات کی موجودگی میں، اگر یہ خواہش ایک مفید یا کم از کم بے ضرر اظہار کا ذریعہ ڈھونڈ لیتی تو اکثر افراد اقتدار کی خواہش کو ترجیح دیتے۔

موقع کے میسر ہونے کے دو مثبت اور منفی پہلو ہیں۔ اس امر کا ادراک بہت اہم ہے کہ ایک قزاق، ایک ڈاکو، یا پھر ایک آمر کے لئے پیشہ وارانہ مواقع میسر نہیں ہوں گے، اور اس کے ساتھ ساتھ ایک کم تباہ کن پیشے کے لئے مواقع میسر ہونے چاہئیں۔ جرائم روکنے اور ایک معقول معاشی نظام کے قیام کے لئے ایک مستحکم حکومت درکار ہے، ان دونوں کے ذریعے بدمعاش گروہوں کی قانونی اقسام کو روکنے کا امکان پیدا ہوتا ہے اور جہاں تک ممکن ہو سکے، زیادہ سے زیادہ نوجوانوں کے لئے پُرکشش پیشوں کا اہتمام و انصرام ہو سکتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک ایسے معاشرے میں بہت آسان ہے جو غریب ہونے کے بجائے امیر ہو رہا ہے۔ دولت کی فراوانی کے ذریعے نہ تو معاشرے کی اخلاقی سطح بلند ہوتی ہے اور نہ ہی دولت کی قلت کے ذریعے اس کی اخلاقی سطح میں کمی واقع ہوتی ہے۔ دریائے رینو (Rhino) سے لے کر بحرالکاہل تک، عمومی نقطہ نظر کی سخت گیری اور شدت عہد حاضر میں بہت زیادہ ہے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ اکثر لوگ اپنے والدین سے زیادہ غریب ہیں۔

خواہش اقتدار کی کونسی قسم اپنائی جائے، اس ضمن میں مہارت کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اگر وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو جدید جنگ کی مختلف اقسام کے قطع نظر تباہی پھیلانے کے لئے بہت کم مہارت درکار ہوتی ہے جبکہ تعمیری اور مثبت کام کے لئے ہمیشہ زیادہ مہارت اور اس کی زیادہ اقسام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اکثر لوگ جنہوں نے ایک مشکل قسم کی مہارت حاصل کر لی ہوتی ہے، اس کے استعمال میں خوشی و لطف محسوس کرتے ہیں اور اس کام کو اپنے لئے بہت آسان سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دیگر حالات جوں کے توں رہنے کے باعث مہارت کی یہ مشکل

صورت خواہش اقتدار کے لئے زیادہ تسکین کا باعث ہوتی ہے۔ وہ شخص جس نے جہاز میں سے بم پھینکنے کا طریقہ سیکھا ہے، وہ اپنے اس عمل کو زمانہ امن میں اکتاہٹ کا باعث سمجھے گا لیکن وہ شخص جس نے زرد بخار سے مقابلہ کرنے کا طریقہ سیکھ لیا ہے، زمانہ جنگ میں ایک فوجی سرجن کے ساتھ کام کرنے کو ترجیح دے گا۔ جدید جنگ کے لئے اعلیٰ مہارت درکار ہوتی ہے اور یہ جنگ مختلف قسم کے ماہرین کے لئے پسندیدہ اور پرکشش ثابت ہوتی ہے۔ زمانہ امن اور زمانہ جنگ، دونوں ادوار میں زیادہ سے زیادہ سائنسی مہارت درکار ہوتی ہے تو پھر کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے کہ جس کے ذریعے ایک روشن نظر، اور جنگ کے بجائے امن کے حامی کو یہ یقین ہو سکے کہ آیندہ جنگ میں اس کی دریافتیں اور ایجادیں تباہی میں اضافے کا باعث نہیں ہوں گی۔ صاف بات تو یہ ہے کہ بہر حال ان مہارتوں کے درمیان واضح فرق موجود ہے۔ جن میں سے کچھ مہارتیں زمانہ امن میں وافر درکار ہوتی ہیں اور کچھ مہارتوں کے لئے زمانہ جنگ میں کثیر تعداد میں ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اگر اس قسم کا فرق بہر حال موجود ہے تو پھر ایک شخص کی خواہش اقتدار، اسے امن کی طرف راغب کر دے گی بشرطیکہ اس کی مہارت اول الذکر نوعیت کی ہو، اس کے برعکس، اگر اس کی مہارت موخر الذکر نوعیت کی ہو تو اس کی خواہش اقتدار اسے جنگ کی طرف مائل کر دے گی۔ اس قسم کے حالات میں، بہت حد تک فنی مہارت یہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ ایک فرد کو کس قسم کی خواہش اقتدار اختیار کرنا چاہئے۔

مکمل طور پر یہ سچ نہیں ہے کہ تحریک و ترغیب اور قوت کا استعمال ایک ہی چیز نہیں ہے۔ تحریک و ترغیب کی بہت سی اقسام، حتیٰ کہ ان میں سے اکثر اقسام ہر شخص کی پسندیدہ ہیں، بواقعی اور درحقیقت، قوت و طاقت کی ایک قسم ہے۔ غور کیجئے کہ ہم اپنے بچوں کے ساتھ کس قسم کا رویہ اپناتے ہیں۔ ہم انہیں یہ نہیں کہتے "کچھ لوگ کہتے ہیں کہ زمین گول ہے اور کچھ لوگوں کے مطابق زمین ہموار ہے، بڑے ہونے پر تم خود اگر چاہو ثبوتوں کا جائزہ لے کر اپنی ذاتی رائے قائم کر سکتے ہو۔ اس کے بجائے ہم یہ کہتے ہیں "زمین گول ہے۔" وقت کے ساتھ ساتھ جب ہمارے بچے اس قدر بڑے اور ذمہ دار ہو جاتے ہیں کہ اپنے طور پر ثبوت کا جائزہ لے سکیں، ہمارے مشورے اور نصیحت نے ان کا ذہن بند کر دیا ہوتا ہے اور زمین ہموار ہونے کے ہمنواؤں کی کوئی بھی دلیل کارگر ثابت نہیں ہوتی۔ یہی اصول ان اخلاقی تصورات پر بھی منطبق ہوتا ہے جسے ہم واقعی اہم سمجھتے ہیں،

مثلاً "اپنی ناک او پر نہ کھینچو" یا "چاقو کے ذریعے سزر نہ اٹھاؤ۔" مجھے معلوم ہے کہ چاقو کے ذریعے مٹر کھانے کی معقول اور مناسب وجوہات موجود ہیں لیکن ابتدائی تحریک و ترغیب کے اثر پذیر اثرات کے باعث جو میں ان وجوہات کو معقول و مناسب نہیں سمجھ سکتا اور نہ ہی انہیں پسندیدگی کی نظر سے دیکھ سکتا ہوں۔

قوت و اختیار کی اخلاقیات، اقتدار و اختیار کو قانونی اور غیر قانونی طور پر ممتاز حیثیت دینے پر مشتمل نہیں ہو سکتی۔ جس طرح ہم ابھی دیکھ چکے ہیں، ہم سب اس امر پر متفق ہیں کہ بعض اوقات ایک تحریک و ترغیب، قوت کے استعمال کے لئے لازمی ہوتی ہے۔ تقریباً ہر ایک شخص نہایت آسانی کے ساتھ متصور حالات میں جسمانی تشدد حتیٰ کہ ہلاکت کو بھی صحیح سمجھتا۔ فرض کریں کہ آپ نے ریل گاڑی میں گولیاں چلانے کے ضمن میں گائی فاکس (Guy Foukes) (وہ سازشی شخص جس نے 1605 میں پارلیمان کو اڑا دینے کی کوشش کی) کا سامنا کیا اور یہ بھی فرض کریں کہ آپ اس کو محض گولی مار کر ہلاک کرنے کے ذریعے بحران اور تباہی کو ٹالنے میں کامیاب ہو سکے تو پھر اکثر روشن نظر اور امن کے حامی یہ تسلیم کر لیتے کہ تمہارا اسے گولی مار کر ہلاک کر دینے کا عمل بالکل حق بجانب ہوتا۔ فرضی عمومی اصولوں کے ذریعے اٹھنے والے سوال کو حل کرنے کی کوشش بے سود ہوتی ہے جس کے تحت ایک قسم کی سرگرمیوں کی تعریف کی جاتی ہے اور دوسری قسم کی سرگرمیوں کو مورد الزام ٹھہرا لیا جاتا ہے۔ مزید برآں ہمیں طاقت کے استعمال کے ذریعے اس کے اثرات کا جائزہ لینا چاہئے اور اس لئے ہمیں پہلے یہ فیصلہ کر لینا چاہئے کہ ہم کس قسم کے اثرات چاہتے ہیں۔

میرے خیال کے مطابق، اچھائی یا برائی کا تعین بنیادی طور پر معاشروں کے ذریعے نہیں بلکہ افراد کے ذریعے ہوتا ہے۔ کچھ فلسفے جو اجتماعی حکومت کی حمایت کرنے کے لئے استعمال ہو سکتے تھے، خاص طور پر ہیگل (Hegel) کا فلسفہ، معاشرے میں ایسی اخلاقی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں کہ جن کے باعث ریاست کے اکثر شہریوں کے گھٹیا پن کے باوجود ریاست قابل تعریف ہو سکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس قسم کے فلسفے ارباب اقتدار کی طرف سے اپنے حق کو جائز ثابت کرنے کی چالیں ہیں، اور پھر ہمارے یہاں مروج سیاست کی اقسام کے قطع نظر، ایک غیر جمہوری اخلاقیات کے لئے کوئی بھی جائز دلیل موجود نہیں ہو سکتی۔ غیر جمہوری اخلاقیات سے میری مراد یہ ہے کہ جو افراد کی ایک خاص تعداد کو الگ کر کے کہے "یہ افراد وہ ہیں جو بہترین اشیاء سے لطف اندوز ہو سکتے

ہیں، اور باقی قسم کے افراد ان کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں، مجھے ہر حال اور ہر قیمت پر اس قسم کے آداب و اخلاقیات کو مسترد کر دینا چاہیے لیکن جیسا کہ ہم گذشتہ باب میں دیکھ چکے ہیں، اپنی اہمیت کے انکار کے باعث یہ نقصان وہ حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اس امر کا قطعی امکان نہیں ہے کہ عملی طور پر، انتہائی طاقتور انسان اس قسم کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکے گا جس طرح کی زندگی طبقہ امرا کی حکومت کے نظریے کے پاسدار، اپنے لئے پسند کرتے ہیں۔

خواہشات کے کچھ غلام ایسے ہیں جن سے منطقی طور پر سب لوگ مستفید ہو سکتے ہیں، جبکہ دوسرے غلام اپنی نوعیت کے اعتبار سے معاشرے کے ایک محدود طبقے کے لئے پسندیدہ ہو سکتے ہیں۔ قدرے منطقی تعاون اور ہم آہنگی کے ذریعے، یہ تمام علوم بہت اچھے ہو سکتے ہیں لیکن ان سب کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں سے زیادہ دولت مند ہونے کی خوشی سے لطف اندوز ہو سکیں۔ یہ سب ایک حد تک اپنی مرضی اختیار کر سکتے ہیں لیکن ان سب کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ایک دوسرے پر حکم چلانے لگیں۔ شاید ایک ایسا دور بھی ہو، جہاں آبادی کا ہر فرد بہت زیادہ ذہین ہو لیکن ان سب کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ خود کو عطا کی گئی خاص ذہانت کے ثمرات سمیٹ سکیں۔ علیٰ ہذا القیاس۔

ان اچھی چیزوں کے حوالے سے معاشرتی تعاون ممکن ہے جو عالمگیر حیثیت اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، مثلاً خوشحالی کے لئے مناسب ساز و سامان، تندرستی، ذہانت اور ہر قسم کی خوشی جو ایک دوسرے کے لئے برتری کا باعث ثابت نہیں ہوتی۔ لیکن خوشی کی وہ اقسام جو مقابلے میں فتح حاصل کرتی ہیں، عالمگیر حیثیت اختیار نہیں کر سکتیں۔ اول قسم کی خوشی، دوستانہ احساسات کے ذریعے ارتقاء پذیر ہوتی ہے جبکہ دوسری قسم (اور اس کی متعلقہ ناخوشی) کی خوشی، غیر دوستانہ احساسات کے ذریعے ارتقاء پذیر ہوتی ہے۔ غیر دوستانہ احساسات مجموعی طور پر خوشی کے منطقی حصول میں رکاوٹ بن سکتے ہیں، اس قسم کی صورت حال اس عہد میں قوموں کے معاشی حالات کے ضمن میں پیدا ہوتی ہے۔ اگر ایک قوم میں دوستانہ احساسات بدرجہ اتم غالب حیثیت سے موجود ہیں تو پھر اس قوم کے مختلف افراد یا گروہوں کے درمیان لڑائی جھگڑا قطعاً موجود نہیں ہوگا۔ اس وقت قوموں کے درمیان موجود مختلف تنازعات اور جھگڑوں کی موجودگی کی وجہ قوم کے مختلف افراد اور گروہوں کے درمیان غیر دوستانہ احساسات کی موجودگی ہے جو شدید سے شدید تر ہوتی جاتی

ہے۔ انگلستان اور سکاٹ لینڈ ایک دوسرے سے صدیوں تک لڑتے رہے، اور پھر بالآخر وراثت کی اتفاقی موجودگی کے باعث ان دونوں ممالک میں ایک ہی بادشاہ کی حکومت قائم ہوگئی، اور یہ لڑائیاں ختم ہوگئیں۔ اس نتیجے سے ہر کوئی بہت زیادہ خوش تھا، حتیٰ کہ ڈاکٹر جانسن بھی خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا جس نے اپنی زندہ دلی کے باعث فتوحات پر مشتمل جنگیں بند ہونے سے زیادہ خوشی محسوس کی۔

اب ہم آدابِ اقتدار کے ضمن میں ایک خاص نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔

اربابِ اختیار و اقتدار کا بالآخر یہی مقصد ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف قوم کے مختلف گروہوں بلکہ دنیا میں موجود تمام افراد کے درمیان معاشرتی تعاون کو فروغ دیں۔ اس مقصد کے حصول کے ضمن میں اس وقت سب سے بڑی رکاوٹ غیر دوستانہ احساسات اور ایک دوسرے کے خلاف برتری کی خواہش کی موجودگی ہے۔ اس قسم کے احساسات یا تو براہ راست مذہب و اخلاقیات کے ذریعے یا بالواسطہ طور پر بڑی بڑی قومی صنعتوں کے درمیان دولت کے حصول کے لئے مسابقت اور ممالک کے درمیان اقتدار کے حصول کے لئے موجود سیاسی اور معاشی حالات دور کرنے کے ذریعے معدوم کئے جا سکتے ہیں۔ اس مرحلے پر دونوں طریقوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، یہ دونوں طرائق ایک دوسرے کا متبادل نہیں ہیں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔

جنگ عظیم اور اس کے نتیجے میں قائم ہونے والی آمریت کے باعث فوجی اور حکومتی طاقت اور اقتدار کے علاوہ اقتدار کی تمام اقسام کے متعلق اکثر لوگ غلط اندازے لگانے لگے ہیں۔ یہ ایک نہایت ہی تنگ نظر اور غیر تاریخی نقطہ نظر ہے۔ اگر مجھے ان چار افراد کے انتخاب کے لئے کہا جائے جن کی طاقت دوسروں سے زیادہ تھی، تو پھر مجھے گوتم بدھ اور یسوع مسیح، فیثا غورث اور گلیلیو کا ذکر کرنا چاہئے۔ ان چاروں میں سے کسی کو بھی ریاستی حمایت حاصل نہیں تھی اور انہوں نے اپنی تبلیغ کے ذریعے حکومت کی حمایت حاصل ہونے تک عظیم کامیابی حاصل کر لی تھی۔ ان میں سے کسی کو بھی اپنی زندگی میں زیادہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی، اور نہ ان میں سے کسی نے انسانی زندگی پر وہ اثرات مرتب کئے جو اس صورت میں مرتب ہو سکتے تھے جب اختیار و اقتدار کا حصول ان کا بنیادی مقصد ہوتا۔ ان چاروں میں سے کسی نے بھی وہ قوت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جو دوسروں کو غلام بنا لیتا ہے، بلکہ انہوں نے وہ قوت حاصل کرنے کی سعی کی جس کے ذریعے دوسرے آزاد ہو

جاتے ہیں۔ پہلے دو افراد نے یہ دکھا دیا کہ ان خواہشات پر کیسے قابو پایا جا سکتا ہے جو جھگڑے اور فساد کا باعث بنتی ہیں، پھر محکومی اور غلامی کو کیسے شکست دی جا سکتی ہے، پھر دوسرے دو افراد نے یہ بتا دیا کہ فطری قوتوں کو کیسے اپنے بس میں کیا جا سکتا ہے۔ محض تشدد ہی کے ذریعے افراد پر حکومت قائم نہیں کی جا سکتی ہے بلکہ ان افراد کی حکمت و دانائی کے ذریعے افراد پر حکومت کی جا سکتی ہے جو انسانوں کی طرف سے خوشی، ظاہری و باطنی، سکون و امن، اور ایک ایسی دنیا جہاں ہمیں اپنی مرضی کے برعکس رہنا ہے، پر مبنی مشترکہ خواہشات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

اٹھارھواں باب

تربیتِ اقتدار

(حصولِ اقتدار کے لئے مطلوبہ تربیت)

ایک دفعہ کنفیوشس، کوہِ تھائی کے پاس سے گزر رہا تھا تو اسے ایک عورت نظر آئی جو ایک قبر کے پاس بیٹھی بُری طرح رو رہی تھی۔ پھر یہ حکیم آگے بڑھا اور جلد ہی اس عورت کے پاس پہنچ گیا۔ پھر اس نے زولاؤ کو اس عورت کا احوال پوچھنے کے لئے بھیجا۔ اس نے عورت سے پوچھا "تم یہاں بیٹھی بین کر رہی ہو؟" اس عورت نے جواب دیا "میں وہ بدنصیب ہوں جس پر مصیبتوں پر مصیبتیں نازل ہوئیں۔ ایک دفعہ میرے خاوند کے باپ کو چیتے نے یہاں ہلاک کر دیا، میرا خاوند بھی اسی طرح ہلاک ہوا اور اب میرا بیٹا بھی اسی طرح موت کے منہ میں چلا گیا ہے۔" حکیم کنفیوشس نے پوچھا "تم یہاں سے چلی کیوں نہیں جاتی؟" عورت نے جواب دیا "اس لئے کہ یہاں کوئی استبدادی اور جابر حکومت نہیں ہے!" اس پر حکیم کنفیوشس کہنے لگا "میرے بچو! یاد رکھو، ایک استبدادی اور جابر حکومت، چیتوں سے زیادہ مہلک اور خطرناک ہوتی ہے۔"

اس باب کا موضوع یہ ہے کہ یہ کیسے یقین دلایا جائے کہ حکومت، چیتوں سے کہیں کم استبدادی اور جابر ہوگی۔

جس طرح مندرجہ بالا کہاوت سے ظاہر ہے کہ حکومت و اقتدار کو زیادہ سے زیادہ کم خطرناک بنانے، اس کی تربیت کرنے کا مسئلہ بہت ہی پرانا ہے۔ تاؤ کے پیروکاروں کے نزدیک یہ مسئلہ ناقابلِ حل تھا اور انہوں نے انارکی پر مبنی نظام کی حمایت کی۔ کنفیوشس کے پیروکار یہ سمجھتے تھے کہ جملہ اخلاقی اور حکومتی تربیت کے ذریعے اہلِ اقتدار کو ذی فہم افراد میں تبدیل کر دینا چاہئے

جو اعتدال پسند اور رحم دل ہوں۔ اسی عرصے کے دوران، یونان میں جمہوریت، مطلق العنانیت اور جبر و استبدادیت، اقتدار کے حصول کے لئے باہمی طور پر برسرِ پیکار تھیں۔ جمہوریت کا مقصد یہ تھا کہ وہ اقتدار کے غلط استعمال پر کڑی نظر رکھے لیکن اپنے اس مقصد میں اسے مسلسل ناکامی ہو رہی تھی کیونکہ وہ ایک عارضی مقبولیت کی ہیجان خیزیت میں مبتلا ہو گئی تھی۔ کنفیوشس کے مانند، افلاطون بھی ایک ایسی حکومت کا خواہش مند تھا جو ذی فہم اور دانا ہو۔ اس نقطہ نظر کو بیگم اور سڈنی ویب صاحب، دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں ایک مخصوص طبقے کی وہ حکومت بہت ہی بہتر ہے جہاں اقتدار و اختیار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو پیشہ ور قائد ہوتے ہیں۔ افلاطون اور ولپ کے درمیانی ادوار میں، مختلف اوقات میں فوجی، مطلق العنانی، دینی، موروثی، شہنشاہی، امراء، جمہوریت ادر عابدوں وزاروں کی حکومت سب کو آزمایا گیا—اور پھر کرومویل کے تجربے کی ناکامی کے بعد، ان میں سے آخری طرزِ حکومت کو ہمارے عہد میں لینن اور ہٹلر نے دوبارہ اپنایا۔

وہ شخص جو تاریخ انسانی اور انسانی فطرت کا مطالعہ کرتا ہے، تو اسے یہ بخوبی ثبوت میسر ہو جاتا ہے کہ جمہوریت اگرچہ مکمل حل نہیں ہے، لیکن حل کا ایک لازمی حصہ ضرور ہے۔ ہم سیاسی حالات میں محدود ہو کر مکمل حل نہیں تلاش کر سکتے، اس ضمن میں، ہمیں معاشی، تبلیغی، نفسیاتی اور تعلیمی حالات کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا۔ لٰہذا ہم اپنے اس موضوع کو چار حصوں میں تقسیم کر رہے ہیں:

پہلا حصہ۔ سیاسی حالات

دوسرا حصہ: معاشی حالات

تیسرا حصہ: تبلیغی اور ترویجی حالات

چوتھا حصہ: نفسیاتی اور تعلیمی حالات

پہلا حصہ

جمہوریت کی خصوصیات منفی نوعیت کی ہیں: جمہوریت ایک بہتر و اچھی حکومت کی ضامن نہیں ہے لیکن اس کے ذریعے بعض برائیوں کی روک تھام ہو جاتی ہے۔ جب تک عورتوں نے سیاسی معاملات اور سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع نہیں کیا تھا، شادی شدہ عورتوں کو اپنی جائیداد حتیٰ

کہ اپنی آمدن پر کوئی دسترس حاصل نہیں تھی۔ اگر ایک شرابی خاوند اپنی بیوی (جو ایک ملازمہ کی حیثیت سے لوگوں کے گھروں میں کام کرتی ہے) کو اپنے بچوں پر اپنی آمدنی خرچ کرنے سے روک دیتا ہے تو پھر اس کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہے۔ مخصوص افراد کی حکومت کی پارلیمان نے اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی ابتدا میں اپنے قانونی اختیار کے ذریعے شہری اور دیہاتی محنت کشوں کا استحصال کر کے امیر لوگوں کو اپنی دولت میں اضافہ کرنے کی اجازت دے دی۔ صرف جمہوریت ہی کے حصول پر قانون بنایا گیا کہ مزدوروں کی سوداکاری تنظیمیں قائم کی جاسکتی ہیں۔ لیکن جمہوریت کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مغربی امریکا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ ایک نیم غلامانہ زرد آبادی میں محدود ہو گئے تھے جن پر سفید فام امراء کی قلیل تعداد حکومت کرتی تھی۔ غلامی اور بیگاری کے نقصانات سب کو معلوم ہیں اور جہاں ایک اقلیت، ایک سیاسی حکومت کی محفوظ اجارہ داری میں پناہ لے لیتی ہے تو پھر اکثریت کا جلد یا بدیر غلامی یا بیگاری میں گرفتار ہونے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ تاریخی شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے ہوتا آیا ہے، اقلیتیں اکثریتوں کے حقوق کا تحفظ نہیں کرسکتیں۔

ماضی میں بھی یہ نظریہ درست سمجھا جاتا تھا اور آج بھی اسے سچ مانا جاتا ہے کہ ایک مخصوص طبقے کی حکومت اس وقت قابلِ تعریف ہوسکتی ہے جب یہ ''اچھے اور قابل'' افراد پر مشتمل ہو۔ رومی سلطنت کی حکومت کانسٹینٹائن (Constantine) تک ''بُری'' حکومت تھی اور پھر ''اچھی'' حکومت میں تبدیل ہوگئی۔ بادشاہوں کی کتاب میں ان لوگوں کا بھی ذکر ہے جنہوں نے خدا کے نام پر اچھے کام کیے، اور ان کا بھی ذکر ہے جنہوں نے برے کام کیے۔ انگلستان کی تاریخ میں بچوں کو یہ پڑھایا جاتا تھا کہ وہاں ''اچھے'' بادشاہ بھی ہوتے تھے اور ''بُرے'' بادشاہ بھی ہوتے تھے۔ یہودیوں کا طبقہ امراء ''بُرا'' ہے جبکہ نازیوں کا طبقہ امراء ''اچھا'' ہے۔ زاروں کی مخصوص حکومت کے عہدیدار ''بُرے'' تھے جبکہ کمیونسٹ جماعت کے عہدیدار ''اچھے'' ہیں۔

یہ رویہ اور نظریہ، روشن نظر اور صاحبانِ علم وفراست کے لئے بالکل بے وقعت ہے۔ ایک بچہ اس وقت ''نیک اور اچھا'' ہوتا ہے جب وہ والدین کا حکم مانتا ہے، اور جب وہ والدین کی نافرمانی کرتا ہے تو اسے ''شریر اور شرارتی'' کہا جاتا ہے۔ جب وہ بڑا ہو کر ایک سیاسی راہنما بن جاتا ہے تو پھر اس کے ذہن میں اس کے بچپن میں اس کے ساتھ اختیار کیے جانے والا سلوک ابھر

آتا ہے جس کے تحت ''اچھے'' لوگ وہ ہوتے ہیں جو اس کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں اور وہ لوگ ''بُرے'' ہوتے ہیں جو اس کے احکام کو خاطر میں نہیں لاتے۔ نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے ہماری اپنی سیاسی جماعت ''اچھے'' لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے اور مخالف جماعت ''بُرے'' لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ''اچھی'' حکومت وہ حکومت ہوتی ہے جس میں ہمارے اپنے لوگ شامل ہوتے ہیں اور ''بُری'' حکومت وہ ہوتی ہے جس میں ''مخالف'' لوگ شامل ہوتے ہیں۔

اگر اس طرح کا نقطہ نظر نہایت سنجیدگی کے ساتھ اپنایا جائے تو معاشرتی زندگی بہت ہی مشکل اور تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔ صرف طاقت وقوت کے ذریعے ہی یہ فیصلہ ہو سکتا ہے کہ کونسی جماعت یا حکومت ''اچھی'' ہے اور کون سی جماعت اور حکومت ''بُری'' ہے اور یہ فیصلہ بغاوت اور سرکشی کے ذریعے الٹا بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی بھی جماعت اقتدار حاصل کر لیتی ہے تو یہ دوسری جماعت کے مفادات کا خیال نہیں رکھے گی بشرطیکہ اسے بغاوت کا خطرہ نہ ہو۔ اگر معاشرتی زندگی، استبدادی زندگی سے بہتر کرنا مقصود ہو تو پھر اس کی طرف سے ایک خاص حد تک غیر جانبداری کی ضرورت محسوس ہوگی۔ لیکن، چونکہ بہت سے معاملات میں اجتماعی قدم ضروری ہوتا ہے تو اس قسم کے معاملات میں غیر جانبداری کی عملی صورت، اکثریتی حکومت ہوتی ہے۔

بہر حال، جمہوریت اگرچہ ضروری ہے لیکن کسی طرح بھی تربیت اقتدار کے لئے واحد سیاسی شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔ جمہوریت میں اکثریت کے لئے یہ ممکن ہے کہ اقلیت کے ساتھ ایک ظالمانہ لیکن قطعی طور پر غیر ضروری رویہ روا رکھے۔ 1885 اور 1922 کے عرصے کے دوران حکومت انگلستان (قطع نظر عورتوں کی عدم شمولیت) جمہوری تھی لیکن یہ حکومت آئرلینڈ کا ظلم وستم نہ روک سکی۔ اس نظام کے تحت نہ صرف قومی، بلکہ مذہبی یا سیاسی اقلیت کو بھی ستم رانی کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ جہاں تک اقلیتوں کے تحفظ کا تعلق ہے اور جس حد تک یہ ایک باقاعدہ حکومت کے مطابق ہے، تربیت اقتدار کے ضمن میں یہ ایک لازمی حصہ ہے۔

اس ضمن میں مطلوبہ شرط یہ ہے کہ ان معاملات کو پیش نظر رکھا جائے جن کے بارے معاشرے کو مجموعی طور پر لازمی قدم اٹھانا چاہئے اور جن کے بارے موافقت اور مطابقت غیر ضروری ہے۔ ایک اجتماعی فیصلے کی اہم اور ناگزیر نوعیت کے بارے سب سے زیادہ واضح اور اہم سوالات وہ ہیں جو لازمی طور پر جغرافیائی حیثیت کے حامل ہیں۔ سڑکیں، ریلوے لائنیں،

نکاسی آب، گیس کے مراکز، وغیرہ وغیرہ، ایک ہی راستے پر ہونے چاہئیں۔ مختلف بیماریوں یا طاعون کے خلاف صفائی کی تدابیر جغرافیائی ہیں۔ مسیحی سائنسدانوں کے لئے یہ ممکن نہیں ہوگا کہ وہ یہ اعلان کریں کہ وہ بیماری کے خلاف احتیاطی تدابیر اس لئے اختیار نہیں کریں گے کیونکہ ان بیماریوں سے دوسروں کے متاثر ہونے کا خطرہ ہے۔ قطع نظر خانہ جنگی کے، جنگ ایک جغرافیائی عمل ہے اور اس وقت بھی یہ صورت حال جلد رونما ہو سکتی ہے جب ایک علاقے پر دوسری حکومت قبضہ کر لے، اور دوسرے علاقے پر تیسری حکومت قبضہ کر لے۔

جب ایک علاقے میں ایک اقلیت موجود ہو، مثلاً 1922 سے قبل آئرلینڈ، تو پھر منتقلی کے ذریعے بہت زیادہ مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن جب اقلیت متعلقہ تمام علاقے میں پھیلی ہوئی ہو، یہ طریقہ بہت زیادہ حد تک ناقابلِ عمل ثابت ہوتا ہے۔ جس علاقے میں مسیحی اور مسلمان اکٹھے رہتے ہوں، حقیقت یہ ہے کہ ان کے شادی کے قوانین مختلف ہوتے ہیں لیکن مذہب کے قطع نظر، انہیں ایک واحد حکومت کی فرمانبرداری کرنا پڑے گی۔ آہستہ آہستہ یہ معلوم ہوا کہ ایک ریاست کے لئے دینی یکسانیت ضروری نہیں ہے اور یہ کہ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک ایک واحد حکومت کے تحت زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ لیکن دور اصلاحات کے بعد پہلے 130 سالوں کے دوران یہ صورت حال موجود نہیں تھی۔

وہ آزادی قوانین کے مطابق ہو، اس کی موجودگی کی نوعیت کے متعلق سوال، ایک ایسا سوال ہے جو فرضی طور پر طے نہیں کیا جا سکتا۔ صرف ایک چیز جسے فرضی طور پر کہا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے جہاں ایک اجتماعی فیصلے کے لئے کوئی بھی تکنیکی وجہ موجود نہیں ہوتی، اگر آزادی میں مداخلت کی ضرورت محسوس ہو تو پھر عوام الناس کے متعلق قواعد وضوابط کے لئے مضبوط وجہ موجود ہونی چاہئے۔ جب الزبتھ کے دور حکومت میں رومن کیتھولک افراد نے اسے (الزبتھ) کو تخت سے محروم کر دینا چاہا، یہ امر حیران کن ہے کہ حکومت نے ان کے موقف کی حمایت نہیں کی۔ اسی طرح Low Countries میں جہاں پروٹسٹنٹوں نے سپین کے خلاف بغاوت کی ہوئی تھی، توقع یہ تھی کہ سپینی ان کو ہلاک کر دیتے۔ آج کے دور میں دینی رویے، ماضی کے برعکس سیاسی اہمیت سے محروم ہیں۔ حتیٰ کہ اگر سیاسی اختلافات زیادہ گہرے نہ ہوں تو وہ ایذا رسانی کا باعث ثابت نہیں ہوتے۔ قدامت پسند، روشن خیال اور لیبر (مزدور) جماعت سے تعلق رکھنے والے افراد، یہ سب

پُرامن طریقے سے باہم زندگی بسر کر سکتے ہیں کیونکہ وہ آئین کو بزورِ قوت تبدیل کرنے کے خواہاں نہیں ہیں، لیکن فسطائیوں اور کیمونسٹوں کا باہمی ادغام زیادہ مشکل ہے۔ اگر کسی علاقے میں جمہوریت رائج ہو، ایک اقلیت کی جانب سے بزورِ قوت اقتدار حاصل کرنے کی خواہش اور ایسا کرنے کی تحریک کو اس بنیاد پر معقول طور پر روکا جا سکتا ہے کہ قانون کی پابند اکثریت کو، اگر یہ اس قابل ہے تو ایک پُرسکون زندگی بسر کرنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن ہر قسم کی تحریک کے ضمن میں اس قسم کی برداشت اور تحمل کا عالم ہونا چاہیئے کہ قانون کے خلاف کسی بھی تحریک میں شامل نہ ہوا جائے، اور قانون کو اسی طرح برداشت اور تحمل کا مظاہرہ کرنا چاہیئے جو تکنیکی استعداد کارکردگی اور امن وامان کی بحالی و برقراری کے مطابق ہو۔ میں اس موضوع پر نفسیاتی حالات کے عنوان کے تحت دوبارہ گفتگو کروں گا۔

تربیت اقتدار کے نقطہ نظر کے تناظر میں، حکومتی اکائی کے بہترین اور معقول ترین حجم کے بارے بہت مشکل سوالات جنم لیتے ہیں۔ ایک نہایت ہی عظیم جدید ملک میں، جہاں جمہوریت بھی موجود ہو، ایک عام شہری کو سیاسی اقتدار کے متعلق بہت ہی کم سمجھ بوجھ اور ادراک حاصل ہوتا ہے، وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ انتخاب کے موقع پر کون سے معاملات اٹھائے جائیں گے، اور یہ معاملات و مسائل عام طور پر وہ ہو سکتے ہیں جو اس کی روزمرہ زندگی سے کہیں دور ہوتے ہیں، اور تقریباً اس کے ساتھ پیش نہیں آتے، اور اس کی رائے مجموعی طور پر اس قدر کم اہمیت ہوتی ہے وہ اپنے آپ کو قابلِ نظرانداز سمجھتا ہے۔ قدیم ریاستی شہروں میں یہ برائیاں بہت کم موجود تھیں، لیکن عہد جدید میں یہ برائیاں مقامی حکومت میں موجود ہوتی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ امید کی جا سکتی ہو کہ عوام قومی معاملات کے بجائے مقامی معاملات میں زیادہ دلچسپی کا اظہار کرتے، لیکن ایسا نہیں ہے، اس کے برعکس متعلقہ علاقہ جس قدر زیادہ بڑا ہو گا، تو رائے دہندوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد اپنی رائے کا اظہار کرنے کی زحمت گوارہ کرے گی۔ یہ صورت حال جزوی طور پر پیدا ہوتی ہے کیونکہ اہم انتخابات میں مخصوص نظریات کی ترویج، تبلیغ اور پرچار کے لئے زیادہ رقم خرچ کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ انتخابات کے مواقع پر اٹھائے جانے والے مسائل و معاملات بذاتِ خود زیادہ سے زیادہ پیچیدہ نوعیت کے ہوتے ہیں۔ زیادہ پیچیدہ معاملات و مسائل، جنگ اور مخالف دشمنوں کے ساتھ تعلقات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جنوری 1910 میں میری ملاقات ایک

بوڑھے دیہاتی سے ہوئی جس نے مجھے بتایا کہ وہ قدامت پسندوں (جو اس کے معاشی مفادات کے خلاف تھے) کی حمایت کرے گا کیونکہ اسے یہ یقین دلایا گیا کہ اگر آزاد خیال جیت گئے تو پھر ایک ہفتے کے اندر اندر جرمن ملک کے اندر ہوتے۔ یہ تو سمجھا ہی نہیں جا سکتا کہ اس نے بھی پیرش کونسل (Parish Council) کے انتخابات میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہو، اگرچہ ان معاملات کی اسے کچھ سمجھ بوجھ بھی حاصل ہو، یہ مسائل و معاملات اس میں تحریک پیدا کرنے میں ناکام رہے کیونکہ یہ معاملات و مسائل ایسے نہ تھے جو اس میں ہیجان اور جوش پیدا کر سکتے، یا پھر وہ ان مسائل و معاملات کی حقیقت پر یقین رکھ سکتا۔

لہٰذا اس مرحلے پر ایک مشکل صورت حال جنم لیتی ہے: جب متعلقہ جماعت چھوٹی ہو تو جمہوریت ایک شخص کو یہ احساس مہیا کرتی ہے کہ سیاسی قوت واقتدار میں اسے ایک موثر کردار و حصہ حاصل ہے، لیکن جب جماعت بڑی ہو تو ایسا نہیں ہوتا، اس کے برعکس یہ معاملات و مسائل اسے زیادہ اہم نظر آتے ہیں جب جماعت بڑی ہو، لیکن جماعت چھوٹی ہونے کی صورت میں یہ معاملات و مسائل اسے اہم دکھائی نہیں دیتے۔

جب رائے دہندگی پر مشتمل علاقہ جغرافیائی نوعیت کے بجائے، پیشہ وارانہ نوعیت کا ہو تو کچھ حد تک اس مشکل سے محفوظ رہا جا سکتا ہے، ایک حقیقی موثر جمہوریت ممکن ہوتی ہے مثلاً مزدوروں کی سوداکاری تنظیم میں یہ صورت حال بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ اس کی ہر شاخ ایک پیچیدہ سوال پر غور کرنے کے لئے باہم ملاقات کر سکتی ہے، تمام ارکان کا مفاد اور تجربہ یکساں ہوتا ہے جس کے باعث مفید اور نتیجہ خیز گفتگو ممکن ہوتی ہے۔ اس لئے مجموعی طور پر تنظیم کا حتمی فیصلہ وہ ہوگا جس میں ارکان کی زیادہ سے زیادہ تعداد نے حصہ لیا ہوگا۔

بہرحال یہ طریقہ واضح طور پر کچھ حدود و قیود میں مقید ہے۔ بہت سے مسائل و معاملات جغرافیائی حیثیت سے اس قدر زیادہ متعلق ہوتے ہیں کہ رائے دہندوں پر مشتمل جغرافیائی علاقے کی موجودگی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ عوامی ادارے، بے شمار حوالوں سے ہماری زندگیوں پر اس طور اثر انداز ہوتے ہیں کہ ایک معروف شخص جو سیاستدان نہیں ہے، ان سے زیادہ مقامی یا قومی معاملات و مسائل میں حصہ نہیں لے سکتا جو اس سے متعلقہ ہیں یا جن کے باعث وہ فکر و تردد میں مبتلا رہتا ہے۔ اس ضمن میں ممکنہ طور پر ایک بہترین حل یہ ہوتا کہ مزدوروں کی سوداکاری تنظیم

کے عہدیدار کی ذمہ داریوں میں اضافہ کر دیا جاتا جو ایک مخصوص طبقے کی نمائندگی کے لئے منتخب ہوتا۔ عہد حاضر میں، اکثر طبقے اپنی نمائندگی سے محروم ہیں۔ اگر جمہوریت نے نفسیاتی اور اس کے ساتھ ساتھ سیاسی طور پر بھی زندہ رہنا ہے، تو پھر اپنے حلقہ رائے دہندگان میں تعداد اور جذبہ و جوش کے لحاظ سے جو بھی اثر و رسوخ، ارکان رکھتے ہیں، کی طرف سے سیاسی سوداکاری کے لئے مختلف طبقات کی تنظیم مطلوب ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ نمائندے پارلیمان کا ایک متبادل ہونے چاہئیں لیکن ان کے ذریعے پارلیمان کو عوام کی خواہشات سے آگاہی ہونی چاہئے۔ ایک وفاق سے منسلک مقاصد اور جذبات کی نسبت مختلف رائے دہندگان پر مشتمل علاقوں سے منسلک مقاصد اور جذبات مضبوط ہونے چاہئیں اور اسی وقت ہی ایک وفاقی نظام کے قیام کے خواہش کی جاسکتی ہے۔ اگر پہلے کبھی ایک بین الاقوامی حکومت ہوتی تو یہ لازمی طور پر قومی حکومتوں کا ایک وفاق ہوتا جس میں مختلف قسم کے اختیارات کی تقسیم و تفویض کی قطعی طور پر وضاحت موجود ہوتی۔ مختلف مخصوص مقاصد کے لئے یہاں پہلے ہی بین الاقوامی با اختیار ادارے موجود ہیں، مثلاً ڈاک خانہ، لیکن عوام کا ان کے مقاصد کے ساتھ اس قدر تعلق نہیں جو ایک قومی حکومت کے پیش نظر ہوں۔ جہاں یہ صورت حال موجود نہ ہو تو پھر وہاں وفاقی حکومت بے شمار اکائیوں کی حکومتوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا میں جب سے پہلی بار آئین نافذ کیا گیا، اس وقت سے ہی ریاستوں پر قابو حاصل کر لیا ہے۔ جرمنی میں بھی 1871 سے لے کر 1918 تک یہی صورت حال موجود رہی۔ اگر دنیا میں قائم ایک وفاقی حکومت علیحدگی کے سوال پر خانہ جنگی میں ملوث ہو جاتی ہے، اور اس کی توقع بھی ہے، اگر اسے فتح حاصل ہو گئی تو بے شمار قومی حکومتوں کے مقابلے میں ناقابلِ فہم حد تک مضبوط ہو جائے گی۔ لہٰذا ایک مخصوص طریقے کے لحاظ سے وفاق کی افادیت واضح حدود پر مشتمل ہوتی ہے، لیکن ان حدود کے اندر رہتے ہوئے بھی یہ مطلوب اور اہم ہوتی ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ اس جدید دنیا میں بہت بڑے بڑے حکومتی علاقوں کی موجودگی قطعی طور پر ناگزیر ہے۔ کچھ بہت ہی اہم مقاصد کے لئے، خاص طور پر امن اور جنگ کے لئے، اس دنیا کا تمام علاقہ بہت ہی مناسب جگہ ہے۔ بڑے بڑے علاقوں کی موجودگی کے نفسیاتی نقصانات، خاص طور پر ایک عام رائے دہندہ میں اپنی کم تری کے احساس اور اکثر معاملات سے بے خبری کا

اعتراف لازمی طور پر کر لینا چاہئے اور ایک تو مندرجہ بالا تجویز کہ مختلف مقاصد کی تنظیم اور پھر وفاق یا اختیارات کی تقسیم کے ذریعے ہر ممکن طور پر کم سے کم کرنا چاہئے۔ کچھ معاملات کے ضمن میں افراد کی طرف سے احکامات کی بجا آوری زیادہ منظم معاشی نظام کا ناگزیر نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر جنگ کا خطرہ دور ہو گیا تو پھر مقامی مفادات اور مقاصد، موجودہ دور سے زیادہ ان کے مقاصد اور مفادات سے منسلک ہوتے کہ جن کے بارے میں انہیں زیادہ علم بھی ہوتا اور وہ ایک موثر آواز بھی اٹھا سکتے۔ کسی بھی دیگر چیز سے بڑھ کر یہ جنگ کا خطرہ ہی ہوتا ہے جس کے باعث افراد اپنی توجہ مختلف دور افتادہ ممالک اور اپنی حکومت کی اندرونی سرگرمیوں کی طرف مرکوز کر لیتے ہیں۔

جہاں نظام جمہوریت موجود ہوتا ہے، وہ ابھی بھی افراد اور اقلیتوں کو ظلم وستم سے محفوظ رکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، کیونکہ ظلم وستم بذات خود ایک جمہوری حکومت میں مطلوب نہیں ہوتا اور اس کے باعث امن و امان بگڑنے کا امکان ہوتا ہے۔ مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کی علیحدگی، نظام احتساب، بینتھم کا سیاسی نظریہ اور انیسویں صدی میں آزاد خیالیت، یہ سب کچھ اس لئے وضع کیا گیا تھا کہ اقتدار و قوت کے ظالمانہ استعمال کو روکا جا سکے۔ لیکن اس قسم کے اقدامات، استعداد کار کے لحاظ سے غیر موافق سمجھے جاتے ہیں۔ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ محکمہ جنگ اور گھوڑوں کے محافظوں کے محکمے کی علیحدگی، فوجی آمریت کے آگے مزاحمت اور رکاوٹ کی حیثیت رکھتی ہے لیکن کرائمین (Crimean) کی جنگ میں اس کے خوفناک نتائج برآمد ہوئے۔ گذشتہ ادوار میں جب مقننہ اور انتظامیہ میں اختلاف پیدا ہو جاتا تو پھر بہت ہی زیادہ تکلیف دہ تعطل نمودار ہو جاتا ہے اور اب انگلستان میں دونوں قوتوں کو یکجا کرنے کے ذریعے ہر قسم کے مقاصد کے حصول اور کابینہ میں استعداد کار یقینی بنائی گئی ہے۔ طاقت و اقتدار کے جبری استعمال کو روکنے کے لئے اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں میں مروج طرائق، ہمارے لئے موافق نہیں ہیں، اور ابھی تک مروج یہ طریقے زیادہ موثر نہیں ہیں۔ اس صورت حال کو بچانے کے لئے انتقامی اقدامات کی ضرورت ہے اور یہ بھی ضرورت ہے کہ سرکاری افسروں، پولیس، مجسٹریٹوں اور ججوں پر کڑی نظر رکھی جائے تاکہ وہ اپنے اختیارات سے تجاوز نہ کر سکیں۔ مزید برآں، عوامی سہولیات فراہم کرنے والے ہر محکمے کی اہم شاخ میں ایک مخصوص سیاسی توازن قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر اس حقیقت کے لحاظ سے جمہوریت کے لئے خطرہ موجود ہے کہ پولیس اور فضائیہ میں ایک اوسط قسم کی

رائے عامہ کا ردِ عمل، مجموعی طور پر ملک میں موجود رائے عامہ سے کہیں زیادہ شدید ہوتا ہے۔

ہر قسم کے جمہوری نظام میں، جو افراد اور ادارے جو نہایت ہی واضح طور پر مقرر انتظامی اختیارات حاصل کرنا چاہتے ہیں، اگر ان پر کڑی نظر نہ رکھی جائے، تو ان کی طرف سے ایک نہایت ہی غیر مطلوب خود مختار قوت و طاقت حاصل کرنے کا امکان ہوتا ہے۔ یہ نظریہ خاص طور پر پولیس پر بدرجہ اتم لاگو ہوتا ہے۔ ارنسٹ جیروم ہاپکنز (Earnest Jerome Hopkins) نے اپنی کتاب ''Our Lawless Police'' میں یہ بتایا ہے کہ امریکہ میں چونکہ پولیس کا انتظام و اہتمام نہایت بے ڈھنگے طریقے سے کیا جاتا ہے، اس لئے وہاں پیدا ہونے والی پریشانی نہایت شدید ہوتی ہے۔ اس صورت حال کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مجرم کی طرف سے اعتراف جرم کرانے کے لئے انعام کے طور پر پولیس کے سپاہی کو ترقی دے دی جاتی ہے، اور عدالت بھی اعتراف جرم کو جرم کا اقرار تصور کرتی ہے، اس لئے پولیس کے متعلقہ افسر کے لئے یہ بات مفید اور دلچسپی کا باعث ہوتی ہے کہ وہ ملزم سے اعتراف جرم کرانے کے لئے اسے اذیت کا نشانہ بنائے۔ یہ برائی کسی نہ کسی حد تک تمام ممالک میں پائی جاتی ہے۔ ہندوستان میں بھی یہ برائی زوروں پر ہے۔ اقبالِ جرم کرانے کی خواہش، تفتیشی اذیت رسانی کی بنیاد تھی۔ قدیم چین میں مشتبہ افراد پر اذیت رسانی ایک معمول تھا کیونکہ ایک ہمدرد شہنشاہ کا یہ فیصلہ تھا اور اس نے یہ حکم دے رکھا تھا، کہ جب تک کوئی شخص اپنے جرم کا اعتراف نہ کرے، اسے سزا نہ دی جائے۔ پولیس کے پاس موجود طاقت کو بے ضرر بنانے اور اس کی تربیت کرنے کے ضمن میں یہ امر نہایت لازمی ہے کہ اعترافِ جرم کو کسی بھی قیمت اور کسی بھی حال میں جرم کے ثبوت کی حیثیت سے قبول نہ کیا جائے۔

بہر حال، یہ اصلاحِ احوال، اگرچہ ضروری ہے لیکن کسی طور پر بھی کافی نہیں ہے۔ تمام ممالک میں رائج پولیس کے نظام کی بنیاد یہ نظریہ ہے کہ ایک ملزم کے خلاف ثبوت کی فراہمی عوامی بہبود کا معاملہ ہے لیکن ملزم کے حق میں ثبوت کی فراہمی ملزم کا اپنا نجی معاملہ ہے۔ یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ یہ امر زیادہ اہم ہے کہ مجرم کو سزا دینے کے بجائے بے گناہ کو بری کر دیا جائے لیکن تمام دنیا میں ہر جگہ پولیس کی یہ ذمے داری ہے کہ بے گناہی کا نہیں بلکہ جرم کا ثبوت ڈھونڈے۔ فرض کریں کہ آپ کو ناجائز طور پر قتل کا مجرم ٹھہرایا گیا ہے اور بدیہی طور پر یہ معاملہ آپ کے خلاف معلوم ہوتا ہے، پھر تمام ریاستی ذرائع آپ کے خلاف ممکنہ گواہ ڈھونڈنے پر لگ جائیں گے اور پھر ریاست،

قابل ترین وکیلوں کے ذریعے جیوری کی نظر میں آپ کے خلاف تعصب پیدا کر دے گی۔اسی اثناء میں آپ اپنے نجی ذرائع کے ذریعے اپنی بے گناہی کا ثبوت تلاش کرنا شروع کر دیں گے، اس ضمن میں کوئی بھی سرکاری ادارہ آپ کی مدد نہیں کرے گا۔ اگر آپ اپنی غربت کا اظہار کریں گے تو آپ کو وکیل مہیا کیا جائے گا لیکن یہ شخص ایک حکومتی وکیل کے مانند قابل اور ذہین نہیں ہوگا۔ اگر آپ اپنے لئے بریت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر آپ سینما یا اتوار کے اخبارات کے ذریعے دیوالیہ ہونے سے محفوظ ہو سکتے ہیں۔لیکن اس امر کا زیادہ امکان ہے کہ آپ کو ناجائز طور پر قتل کے جرم کا مرتکب ٹھہرایا جائے گا۔

اگر قانون کی پابندی کرنے والے شہری، ناجائز ظلم وستم سے پولیس کے ذریعے محفوظ رہنے کا حق رکھتے ہیں تو پھر دو قسم کی پولیس اور دو قسم کی سکاٹ لینڈ یارڈ ہونی چاہئے، عہد حاضر میں ایک کا کام جرم کو ثابت کرنا ہے، اور دوسری کا کام بے گناہ کا ثبوت تلاش کرنا ہے۔ مزید برآں، ایک سرکاری وکیل کے علاوہ سرکاری وکیل صفائی بھی ہونا چاہئے جن کی یکساں ممتاز قانونی حیثیت ہو۔ یہ امر نہایت واضح ہے کہ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ بے گناہ کو بری کر دینے کی نسبت مجرم کو سزا دینے کا عمل عوامی مفاد میں ہے۔ مزید برآں، ملزم کا دفاع کرنے والی پولیس کو اس وقت استغاثہ کی پولیس بن جانا چاہئے۔ جب جرم کی ایک قسم کا تعلق ہو۔ یعنی اپنے ''فرائض'' سرانجام دینے کے ضمن میں استغاثہ کی طرف سے جرائم کا ارتکاب۔ کسی اور طریقے کے ذریعے نہیں (جہاں تک میں محسوس کر سکتا ہوں) بلکہ اس طریقے کے ذریعے پولیس کی استبدادی قوت کو کم کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا حصہ

اب میں ان معاشی حالات کا ذکر کرتا ہوں جو استبدادی قوت کو کم کرنے کے لئے درکار ہیں۔ یہ موضوع بذات خود اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت اہم ہے، اور اس لئے بھی اہم ہے کیونکہ اس کے متعلق بہت سے ایسے نظریات وافکار موجود ہیں جو مبہم نوعیت کے حامل ہیں۔

سیاسی جمہوریت، ہمارے تمام مسائل کا حل نہیں بلکہ مسائل کا ایک تھوڑا سا حصہ اس کے ذریعے حل کیا جا سکتا ہے۔ مارکس نے بتایا کہ محض سیاست کے ذریعے اقتدار میں حقیقی توازن قطعی طور پر نہیں پیدا کیا جا سکتا جبکہ معاشی قوت شہنشاہی یا مطلق العنانی نوعیت کی حامل رہی۔ اس کا

مطلب یہ ہوا کہ معاشی قوت ریاست کے ہاتھ میں ہونی چاہئے اور ریاست جمہوری ہونی چاہئے۔ جو لوگ آج کے عہد میں مارکس کے پیروکار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، انہوں نے اس کے نظریے کا صرف نصف حصہ ہی اپنایا ہے اور اس مطالبے کو پرے دھکیل دیا ہے کہ ریاست کو جمہوری ہونا چاہئے۔ اس طرح انہوں نے دونوں معاشی اور سیاسی قوتوں کو ایک مخصوص طبقے کے ہاتھوں کا کھلونا بنا دیا ہے جس کے باعث یہ طبقہ ماضی کی نسبت اب زیادہ ظلم وستم روا رکھنے کے قابل ہو گیا ہے۔

قدیم قسم کی جمہوریت اور نئی قسم کا مارکسی نظام، دونوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اقتدار کو کم سے کم خطرناک بنایا جائے اور اس کی تربیت کی جائے۔ اول الذکر اس لئے ناکام ہوگئی کہ اس کی نوعیت محض سیاسی تھی اور موخر الذکر اس لئے ناکام ہو گیا کہ اس کی نوعیت محض معاشی تھی۔ دونوں کے باہمی ادغام اور امتزاج کے بغیر مسئلے کا حل ممکن نہیں ہے۔

زمین کی ریاستی ملکیت اور بڑی معاشی اداروں کی حمایت میں دلائل کی نوعیت کچھ تکنیکی ہے اور کچھ سیاسی ہے۔ فیبین سوسائٹی (Fabian Society) کے سوا کسی نے بھی سیاسی نوعیت کے دلائل پر زور نہیں دیا، اور امریکہ میں ٹینیسی ویلی اتھارٹی (Tennessee Valley Authority) کے مانند کچھ معاملات میں اس کا تعلق سیاسی دلائل کے ساتھ رہا۔ خاص طور پر برقی اور آبی طاقت کے ضمن میں۔ بہر حال وہ بہت زبردست اور طاقتور ہیں جس کے باعث قدامت پرست حکومت وہ طریقے متعارف کرانے پر مجبور ہو جاتی ہے، جو تکنیکی نقطہ نظر کے مطابق سوشلسٹ ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جدید طریقوں کے ذریعے کس طرح تنظیمیں اور ادارے ارتقاء پذیر ہوتے ہیں، آپس میں اتحاد کرتے ہیں اور اپنی ترقی کے مواقعوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس کا لازمی اور ناگزیر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ریاست کو یا تو زیادہ سے زیادہ معاشی سرگرمیوں کو بذات خود اپنا لینا چاہئے اور یا پھر جزوی طور پر ان وسیع تجارتی و کاروباری اداروں کے حق میں دستبردار ہو جانا چاہئے جو اس قدر طاقتور ہیں کہ اس کا سامنا کر سکیں یا اسے اپنے بس میں کر سکیں۔ اگر ریاست اس قسم کے اداروں پر غلبہ حاصل نہیں کرتی تو پھر ریاست ان کی کٹھ پتلی بن جاتی ہے، اور یہ ادارے حقیقی ریاست کا روپ دھار لیتے ہیں جہاں جدید مہارتیں دستیاب ہوں، وہاں کسی نہ کسی طرح معاشی اور سیاسی قوتوں کو یکجا ہو جانا چاہئے۔ اس اتحاد اور ادغام کی تحریک ناقابل مزاحمت غیر ذاتی کرداروں کی

حامل ہے جسے مارکس نے اس ترقی کا نام دیا جس کی اس نے پیش گوئی کی تھی۔ لیکن اس کا تعلق طبقاتی جنگ یا عوام کی غلطیوں سے نہیں تھا۔

ایک سیاسی تحریک کے لحاظ سے سوشلزم کا مقصد یہ ہے کہ صنعتی مزدوروں کے حالات میں بہتری پیدا کی جائے، اس کے تکنیکی فوائد مقابلتاً پردے کے پیچھے رکھے گئے ہیں۔ اس ضمن میں نظریہ یہ ہے کہ نجی کاروباری اور تجارتی سرمایہ دار اپنی معاشی قوت کے ذریعے محنت کشوں کو دبانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور چونکہ زمانہ قدیم کے دستکاروں کے مانند محنت کش اس کے پیداواری ذریعے کے مالک نہیں بن سکتے تو پھر اسے شکست دینے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ محنت کشوں کی ایک پوری جماعت اس ادارے کو اپنی اجتماعی ملکیت میں لے لے۔ یہ بھی دلیل دی گئی ہے کہ اگر نجی سرمایہ دار کو بے دخل کر دیا جاتا تو پھر محنت کشوں کی پوری جماعت ایک ریاست تشکیل کر دیتی، اور اس طرح نتیجے کے طور پر معاشی قوت کا مسئلہ اس طرح حل ہو جاتا کہ ریاست، زمین اور سرمائے کو مکمل طور پر اپنی ملکیت میں لے لیتی، اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔ یہ معاشی قوت کو بے ضرر بنانے اور اسے تربیت مہیا کرنے کے لئے ایک تجویز اور مجوزہ طریقہ ہے اس لئے یہ ہمارے موجودہ موضوع کے تحت آتا ہے۔

اس دلیل کا جائزہ لینے سے قبل میں نہایت واضح انداز میں کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں اسے اس صورت میں صحیح سمجھتا ہوں اس کا مناسب دفاع کیا جاتا ہو اور اس ضمن میں مزید دلیلیں پیش کی جاتی ہوں۔ اس کے برعکس اس قسم کے تحفظات کی غیر موجودگی اور بڑھائی میں، میں اسے بہت ہی خطرناک سمجھتا ہوں، اور ان لوگوں کے گمراہ ہونے کا امکان ہوتا ہے جو معاشی استبداد سے اس قدر مکمل آزادی حاصل کرتے ہیں کہ انہیں یہ محسوس ہوگا کہ انہوں نے بے توجہی کے عالم میں معاشی اور سیاسی استبداد اور جبر یک دم قائم کر دیا ہے جو پہلے سے کہیں زیادہ مہلک اور خوفناک ہے۔

پہلے تو یہ ہے کہ "ملکیت" اور "اختیار" دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ فرض کریں کہ یہ کہا جائے کہ ریلوے ریاست کی ملکیت ہے اور ریاست کو شہریوں کا ایک مجموعی ادارہ سمجھا جاتا ہے، اس طور اس کا مطلب یہ ہے اس امر کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ ایک عام شخص کا ریلوے پر کسی بھی قسم کا اختیار ہے۔ ایک لمحے کے لئے ہم مسٹر برے اور مسٹر مینز کی طرف جاتے ہیں کہ انہوں نے امریکی تجارتی و کاروباری کے ضمن میں ملکیت اور اختیار کے ...

بتاتے ہیں کہ ان میں سے اکثر اداروں میں، تمام ڈائریکٹر اکٹھے مل کر عام طور پر سرمائے کے صرف ایک دو فیصد حصے کے مالک ہوتے ہیں لیکن دراصل ادارے کا مکمل انتظام اور اختیار ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے:

''بورڈ آف ڈائریکٹرز کے انتخاب کے موقع پر عام طور پر حصہ دار کے پاس تین متبادل صورتیں ہوتی ہیں۔ وہ رائے دہندگی سے اجتناب کر سکتا ہے، وہ سالانہ اجلاس میں شرکت کر سکتا ہے اور ذاتی طور پر اپنے سرمائے کے لئے اپنی رائے کا اظہار کر سکتا ہے، یا پھر وہ اپنی بجائے کسی دوسرے حصہ دار کو اپنی نمائندگی کرنے کے لئے بھیج سکتا ہے۔ جب تک اس کے پاس سرمائے کا بھاری حصہ موجود نہ ہو، یا تو اس کی رائے کی قطعی اہمیت نہ ہوگی، یا پھر اس کی یہ رائے نہایت ہی قلیل اہمیت کی حامل ہوگی، تو پھر عملی طور پر اس حصہ دار کی اہمیت کم ہو کر اس متبادل کو اختیار کرنے کا باعث بنے گی کہ یا تو وہ بالکل ہی اپنی رائے کا اظہار نہ کرے، اور یا پھر اپنی رائے کا اظہار اس حصہ دار کے کہنے پر کرے جس پر اس کا کوئی اختیار نہیں ہے، یا جس کے انتخاب میں اس نے حصہ نہیں لیا۔ کسی بھی صورت میں کیا وہ کسی بھی قسم کے کوئی اختیار کے استعمال کا عملی اظہار کر سکے گا۔ اس کے بجائے اختیار ان کے ہاتھ میں ہوگا جو یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ فلاں حصے دار، اپنی غیر موجودگی میں، اپنی رائے کے اظہار کا حق کسے دے گا — چونکہ موجودہ انتظامیہ ہی اس امر کا فیصلہ کرتی ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ موخرالذکر ہی اپنے جانشینوں کی رائے پر اپنی رائے مسلط کر سکے گا۔''

مندرجہ ذیل پیرے میں مذکورہ بے بس افراد کے متعلق یہ غور کیا جانا چاہئے کہ یہ عام افراد نہیں ہیں بلکہ سرمایہ کار ہیں۔ وہ اس ادارے کے اس لحاظ سے جزوی مالک ہیں کہ انہیں یہ قانونی حقوق حاصل ہیں کہ اگر ان کی قسمت یاوری کر جائے تو انہیں مخصوص آمدن حاصل ہو جاتی ہے، لیکن چونکہ انہیں ادارے پر اختیار حاصل نہیں ہوتا، یہ آمدن نہایت ہی غیر یقینی ہوتی ہے۔ جب میں 1896 میں پہلی بار امریکا گیا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بہت سی ریلوے کمپنیاں دیوالیہ

ہیں۔ تحقیق کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ ڈائریکٹروں کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ چالاکی کے ذریعے ہوا ہے، معمولی اور عام حصہ داروں کے حصص کسی نہ کسی طرح دوسری کمپنیوں کو منتقل کر دیئے گئے ہیں جہاں سے ڈائریکٹروں کا بہت بڑا مفاد وابستہ تھا۔ یہ ایک نہایت ہی عام اور بے ہودہ طریقہ تھا اور اس عہد میں یہ سب کچھ نہایت ہی مہذب طریقے کے ذریعے کیا جاتا ہے لیکن اصول وہی ہے۔ بڑے بڑے تجارتی اور کاروباری اداروں کو اختیار و طاقت لازمی طور پر ملکیت زیادہ منقسم نہیں ہوتی جس کے ذریعے فائدے حاصل کئے جاتے ہیں، اگرچہ یہ فائدے پہلے پہل سیاسی ہوتے ہیں اور انہیں بے انتہا دولت حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ایک شریف اور مہذب سرمایہ کار کو نہایت شائستگی اور قانونی طور پر لوٹا جا سکتا ہے، اس میں صرف رکاوٹ یہ ہے کہ اپنی آئندہ بچتوں کو حصص میں لگانے کے ضمن میں اسے کوئی تلخ تجربہ نہ ہوا ہو۔

یہ صورت حال کسی بھی طرح لازمی طور پر اس صورت حال سے مختلف نہیں ہے جب ریاست اس ادارے کی جگہ لے لیتی ہے، بلا شک وشبہ، ادارے کے حجم ہی کی وجہ سے ایک عام حصہ دار بے بس ہو جاتا ہے، اس لئے ریاست کی طرف سے ادارے کی جگہ لینے کے باعث یہ معمولی حصہ دار ریاست کے سامنے مزید بے بس ہو جاتا ہے۔ ایک بحری جنگی جہاز سرکاری ملکیت ہوتا ہے، لیکن آپ اگر اسی بنیاد پر، اپنے حق ملکیت جتانے کی کوشش کرتے ہیں، تو پھر جلد ہی آپ کو اپنے مقام پر بٹھا دیا جائے گا۔ یہ سچ ہے کہ آپ کے پاس اس کا علاج اور تدارک موجود ہے، آئندہ عام انتخاب میں آپ ایک ایسے امیدوار کے حق میں اپنی رائے استعمال کر سکتے ہیں جو بحریہ کے میزانئے میں تخفیف کا حامی ہو، اگر آپ کو ایسا امیدوار مل جاتا ہے، یا پھر آپ اخبارات کے ذریعے یہ لکھ سکتے ہیں کہ جہاز رانوں کو مزید شائستہ اور مہذب ہونا چاہئے۔ لیکن اس سے زیادہ آپ کچھ نہیں کر سکتے۔

لیکن یہ کہا جاتا ہے کہ ایک بحری جنگی جہاز ایک سرمایہ دار ریاست کی ملکیت ہے، اور جب یہ محنت کشوں کی ریاست کی ملکیت میں چلا جائے گا تو ہر چیز تبدیل ہو جائے گی۔ اس نقطہ نظر کے لحاظ سے یہ حقیقت میرے لئے ناقابلِ قبول ہے ـــ اب معاشی قوت، ملکیت کے بجائے حکومت کی عملداری میں شامل ہے۔ اگر یونائیٹڈ سٹیل کارپوریشن کو امریکی حکومت اپنی تحویل میں لے لیتی ہے، تو پھر بھی اس کی کاروباری سرگرمیوں کا اہتمام کرنے کے لئے افراد کی ضرورت محسوس ہوگی،

یہ افراد یا تو وہی ہوں گے جو پہلے اس کام پر مامور تھے، یا پھر اسی قابلیت اور نقطہ نظر کے حامل کوئی دوسرے افراد ہوں گے۔ پہلے جس طرح حصہ داروں کے ساتھ ان کا رویہ ہوتا ہے، اسی طرح کا رویہ شہریوں کے ساتھ ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ وہ حکومت کے ملازم ہوں گے لیکن جب تک یہ حکومت جمہوری اور رائے عامہ کا احترام نہیں کرتی، تو پھر حکومت کا بھی تقریباً وہی نقطہ نظر ہوگا جو ان کے سرکاری افسروں کا ہوگا۔

مارکس (Marx) اور اینجلز (Engles) کی بااختیار حیثیت کے باعث مارکس کے پیروکاروں نے مختلف انداز ہائے فکر اپنا لئے ہیں جن کا تعلق گزشتہ صدی کی چوتھی دہائی سے ہے، ان کے مطابق وہ کاروبار کو انفرادی سرمایہ کار کی ملکیت سمجھتے ہیں، اور انہوں نے ابھی تک ملکیت اور اختیار کے درمیان علیحدگی کے باعث پیدا ہونے والا سبق نہیں سیکھا۔ اہم شخص وہ نہیں ہے جو کسی حد تک برائے نام ملکیت کا حامل ہو، بلکہ اہم شخص وہ ہے جسے معاشی قوت پر اختیار حاصل ہو۔ 10 ڈاؤننگ سٹریٹ وزیراعظم کی ملکیت نہیں ہے، اور پادری، کلیساؤں کے مالک نہیں ہیں لیکن اس ضمن میں اس امر کا اظہار مہمل ہوگا کہ وہ ایک اوسط درجے کے محنت کش کی نسبت زیادہ اچھے گھروں میں نہیں رہتے۔ سوشلزم کی کسی بھی قسم اور صورت کے تحت جو جمہوری نہیں ہے جن کے ہاتھ میں معاشی قوت موجود ہے، کسی بھی چیز کو اپنی ملکیت میں لئے بغیر شاندار سرکاری گھر حاصل کر سکتے ہیں، بہترین کاریں استعمال کر سکتے ہیں شاہانہ سہولیات حاصل کر سکتے ہیں، تفریحی مقامات پر سرکاری گھروں میں رہ سکتے ہیں، علیٰ ہذا القیاس۔ اور انہیں ایک معمولی محنت کش کے لئے ان لوگوں کی نسبت فکر کیوں ہو، جو اس وقت ان کے زیر اثر ہیں؟ کوئی وجہ بھی نہیں ہوسکتی کہ وہ معمولی محنت کشوں کے لئے فکر کریں بشرطیکہ معمولی محنت کشوں کے ہاتھ میں اس قدر قوت موجود ہو کہ وہ انہیں ان کے مناصب سے محروم کر سکیں۔ مزید برآں، موجودہ بڑے بڑے کاروباری اور تجارتی اداروں میں معمولی سرمایہ کار کی حکومت یہ ظاہر کر دیتی ہے کہ ایک سرکاری افسر سرمایہ داروں پر مشتمل "جمہوریت" کے باوجود کس قدر آسانی سے جمہوریت کو اپنے زیر تسلط لے آتا ہے۔

اس لئے نہ صرف جمہوریت اس لئے ضروری ہے کہ اگر معاشی اداروں پر ریاستی ملکیت اور اختیار، ایک عام شہری کے لئے کسی نہ کسی حد تک مفید ثابت ہوسکتا ہے، لیکن یہ جمہوریت نہایت مفید ہونی چاہئے، اور عہد حاضر کی نسبت اس قسم کی جمہوریت کا حصول کہیں مشکل ہوگا، چونکہ

افسر شاہی، جب تک اس کی کڑی نگرانی نہ کی جائے، ان قوتوں کو یکجا کر دے گی جو اس وقت سرکاری افراد کے علاوہ صنعتی و مالیاتی اداروں کے با اختیار افراد کے ہاتھوں میں موجود ہے، اور چونکہ حکومت کے خلاف احتجاج کرنے کے طریقے حکومت کو بذاتِ خود مہیا کرنے ہوتے ہیں کیونکہ حکومت، پراپیگنڈے کے لئے درکار لوازمات کے علاوہ جلسہ گاہوں اور اخبارات کی بھی کلی طور پر مالک ہوتی ہے۔

لہٰذا جبکہ اقتدار کو کم از کم بے ضرر بنانے اور اس کی تربیت کرنے کے لئے سرکاری ملکیت اور وسیع پیمانے پر صنعتی اور مالی اداروں پر حکومتی انتظام و اختیار، ایک لازمی شرط ہے، لیکن یہ ابھی بھی مناسب شرط نہیں ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اسے سب سے پہلے کسی بھی خالص سیاسی جمہوریت کی موجودگی کی نسبت یہ جمہوریت بھی اپنی مکمل جولانی کے ساتھ موجود ہو، افسر شاہی ظلم و ستم کے خلاف زیادہ سے زیادہ تحفظات موجود ہوں، اور پراپیگنڈے کے لئے زیادہ سے زیادہ سہولیات موجود ہوں۔

جمہوریت سے ریاستی سوشلزم کی علیحدگی کے باعث پیدا ہونے والے خطرات کا تسلسل، روس میں واقع ہونے والے واقعات کی مثل ہے۔ وہاں ایسے لوگ بھی ہیں جن کا روس کے متعلق نقطۂ نظر مذہبی اعتقاد پر مبنی ہے، ان کے لئے یہ امر پریشانی کا باعث ہے کہ وہ اس ثبوت کا شاید کچھ کر سکیں کہ ملک کی مجموعی صورت حال ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن دورِ ماضی کے جوشیلے افراد کی شہادت اور ثبوت ان لوگوں کے لئے دوبارہ پُر یقین اور موثر ہو رہی ہے جو اس موضوع پر منطقی رویہ اپنانا چاہتے ہیں۔ تاریخ اور نفسیات میں سے دلائل جن کے بارے ہم گذشتہ ابواب سے منسلک رہے ہیں، سے ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ اس امر کا ادراک کس قدر غیر محتاط ہے کہ ہم یہ توقع کرتے ہیں غیر ذمہ دار اقتدار و اختیار مفید و موثر ہو گا۔

> ”مطلق العنانیت میں سب سے زیادہ حصہ ان سینکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں بڑے اور چھوٹے مطلقیت پسند کارکنوں کا ہوتا ہے جہاں وہ اس حالت میں ہوتے ہیں کہ زندگی اور اظہار رائے کے تمام ذرائع پر ان کی اجارہ داری ہوتی ہے، مثلاً کام اور خوشی، انعامات اور سزائیں۔ ایک مرکزی مطلق العنان حکومت کو لازمی طور پر تفویض شدہ اختیار پر مشتمل

انسانی مشینری کے ذریعے اپنی سرگرمیاں انجام دینی چاہئیں۔ جس میں افسر شاہی کے مختلف درجے ہوتے ہیں جن میں سے ہر درجہ اپنے سے بڑے درجے کا محکوم اور اپنے سے کم درجے پر حاوی ہوتا ہے۔ جب تک جمہوری انتظام کو وقوع پذیر کرنے کے لئے حقیقی اور اصلی طریقے موجود نہیں ہوتے اور ہر شخص کے لئے سخت گیر اور کٹر قواعد وضوابط کی اصلاح نہیں ہوتی، اور خدا کی حمد وثنا نہیں ہوتی، تو پھر اقتدار وقوت، ظلم وستم کے ہتھیار میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جب صرف ایک ہی آجر یعنی ریاست ہوتی ہے تو پھر عاجزی وانکساری، معاشی بقاء کا پہلا اصول ہوتا ہے جہاں سرکاری افسروں کا وہی گروہ خفیہ گرفتاروں اور سزاؤں، اداروں کی توڑ پھوڑ، افراد کے لئے روزگار کی فراہمی اور پھر ان کی بے روزگاری، زندگی بسر کرنے کے لوازمات کے ضمن میں مخصوص حصے کی فراہمی کے ذریعے اپنے لئے طاقت وقوت حاصل کرتا ہے۔ صرف ایک احمق، غبی یا کوئی ایسا شخص جو جان دینے کو تیار ہو، ان کی چالیں سمجھنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔"

اگر ایک واحد ادارے —— یعنی ریاست میں اقتدار وقوت کا ارتکاز، ایک انتہائی صورت میں ظلم وستم پر مبنی برائیاں پیدا نہیں کرتا ہے، تو پھر یہ امر نہایت ضروری ہے کہ اس ادارے کے اندر اقتدار واختیار مختلف افراد کو تفویض کر دیا جائے اور پھر ماتحت گروہوں کے پاس بہت زیادہ تعداد میں اختیار ہونا چاہئے۔ جمہوریت کے بغیر اختیار کی تقسیم وتفویض اور ماورائے قانون سے مدافعت اور بچاؤ، معاشی اور سیاسی قوت کی یکجائی، ظلم وستم کے ایک نئے خوفناک ہتھیار کے سوا کچھ نہیں ہے۔ روس میں اگر ایک کسان اپنے ہی کھیت میں اُگائے ہوئے اناج میں سے کچھ لے لیتا ہے تو وہ موت کی سزا کا حقدار ہوتا ہے۔ یہ قانون اس وقت بنایا گیا تھا جب روس میں لاکھوں کسان بھوک اور ان وبائی بیماریوں کے باعث ہلاک ہو رہے تھے جنہیں حکومت نے جان بوجھ کر پھیلنے سے نہیں روکا تھا۔

تیسرا حصہ

میں، اب اقتدار کو کم سے کم بے ضرر بنانے اور اسے تربیت مہیا کرنے کے ضمن میں

تبلیغ و پرچار (پراپیگنڈہ) کے موضوع کے ذکر کی طرف آتا ہوں۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ شکایات کی تشہیر لازمی طور پر ممکن ہونی چاہیئے، آزادانہ احتجاج کا بھی حق حاصل ہونا چاہیئے لیکن اس کے ذریعے قانون کی خلاف نہیں اکسایا جانا چاہیے، اور ان سرکاری افسروں کو سزا دینے کے طریقے موجود ہونے چاہئیں جو اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ موجودہ حکومت کو اپنی مستقل حیثیت کی حفاظت کرنے کے لئے رائے دہندگان کو ڈرانے دھمکانے اور اسی قسم کے مزید حربے استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔ ممتاز اور مشہور افراد کی جانب سے مثبت اور تعمیری تنقید کے باعث ان کے لئے سرکاری یا غیر سرکاری سزا نہیں ہونی چاہیئے۔ اور سب سے بڑھ کر جمہوری ممالک میں جماعتی حکومت کو محفوظ و مامون بنانے کے اقدامات کے ذریعے برسرِ اقتدار سیاست دانوں کو تقریباً نصف قوم کی طرف سے کڑی تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کڑی اور جارحانہ تنقید کے باعث ان کے لئے ایسے بے شمار جرائم کا ارتکاب ناممکن ہو جاتا ہے، جن کے وہ کڑی اور جارحانہ تنقید کی عدم موجودگی میں مرتکب ہوتے۔

اور یہ سب کچھ زیادہ اہم ہو جاتا ہے جب نظام سرمایہ داری کی نسبت جمہوری نظام میں معاشی قوت و طاقت پر ریاست کی اجارہ داری قائم ہو جاتی ہے کیونکہ ریاستی طاقت وقوت میں بہت زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔ اس ضمن میں ایک اچھی اور موثر مثال ملاحظہ فرمایئے۔ ایک سرکاری ادارے میں کچھ خواتین ملازم ہوتی ہیں۔ اس وقت انہیں ایک شکایات محسوس ہوتی ہے کیونکہ ان کی تنخواہ کی شرح مردوں کے مقابلے میں کم ہوتی ہے، اور ان کے پاس اپنی اس شکایت سے دوسروں کو آگاہ کرنے کے قانونی اور جائز طریقے بھی موجود ہوتے ہیں، اور ان طریقوں کو استعمال کرنے کے ضمن میں انہیں سزا کا رکا مرتکب ٹھہرانا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ اور اس امر کی وجہ بھی نظر نہیں آتی کہ یہ تصور کر لیا جائے کہ سوشلزم کو اپنانے کے باعث موجودہ عدم مساوات لازمی طور پر ختم ہو جاتی، لیکن اس کے متعلق احتجاج کرنے کے طریقے ختم ہو جاتے بشرطیکہ اس قسم کے حالات سے نمٹنے کے لئے واضح قانون سازی نہ کی جاتی۔ اخبارات اور مطبع خانے، یہ تمام حکومت کی ملکیت ہوتے، اور وہی کچھ طبع ہوتا جس کے متعلق حکومت احکامات جاری کرتی۔ کیا یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ کیا حکومت اپنی حکمت عملی کے خلاف حملوں کے متعلق مواد طبع کرے گی؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر چھپائی کے طریقوں کے ذریعے سیاسی احتجاج کے طریقے بھی وضع نہ ہوتے۔ عوامی

جلسوں کا انعقاد بھی بہت مشکل ہوتا کیونکہ جلسہ گاہیں بھی حکومت کی ملکیت ہوتیں۔ اور پھر سیاسی آزادی کی حفاظت کے لئے جب تک نہایت محتاط انداز میں حکمت عملی وضع نہ کی جاتی، تو پھر عوام کی شکایات سننے اور ان سے باخبر ہونے کے لئے کوئی طریقہ موجود نہ ہوتا، اور جب حکومت ایک دفعہ منتخب ہو جاتی، اسی طرح ہی مطلق العنان ہوتی جیسے ہٹلر اور حکومت کی مدت ختم ہو جانے کے بعد اپنے آپ کو نہایت آسانی سے منتخب کروانے کا اہتمام کر لیتی۔ ممکن ہے کہ جمہوریت، حکومت کی ایک قسم کے طور پر برقرار رہ سکے۔ لیکن رومی سلطنت میں رائج مقبول حکومت کی اقسام کی نسبت اس کی کوئی حقیقت اور اہمیت نہ ہوتی۔

چونکہ اسے محض سوشلسٹ یا کمیونسٹ کا نام دیا گیا ہے، اگر اسے غیر ذمہ دار اقتدار کہا جائے، تو پھر یہ نہایت معجزانہ طریقے کے ذریعے ماضی میں موجود، استبدادی قوت کی بری خصوصیات سے آزاد ہو جائے گی، محض بچگانہ نفسیات ہے، نیک شہزادہ، بد شہزادے کو باہر نکال دیتا ہے اور پھر سب کچھ صحیح ہے۔ اگر ایک شہزادے پر بھروسا کرنا مقصود ہو، تو پھر یہ لازمی طور پر اس لئے ایسا نہیں ہے کہ وہ ''نیک'' ہے، بلکہ اس لئے یہ ''بد'' کے مفاد کے خلاف ہے۔ یہ امر یقینی بنانے کے لئے کہ اقتدار و اختیار کو بے ضرر بنایا جائے، یہی صورت حال سامنے آئے گی لیکن اسے ان اشخاص کو تبدیل کرنے کے ذریعے بے ضرر نہیں بنایا جا سکے گا جن کے متعلق ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ غیر ذمہ دار آمروں کے لئے ''اچھے'' ہیں۔

بی بی سی ایک ایسا ریاستی ادارہ ہے جو یہ دکھاتا ہے کہ پراپیگنڈے کی آزادی اور حکومت کی اجارہ داری کو ساتھ ساتھ لے کر کیا کچھ دکھانا ممکن ہے۔ ''عام ہڑتال'' کے مانند اس وقت ہمیں یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ پراپیگنڈہ غیر جانبدار نہیں رہتا، لیکن عام حالات میں یہ مختلف نقطہ ہائے نظر کی نمائندگی کرتا ہے اور یہ نمائندگی ان کی عددی طاقت کے قریب قریب ہوتی ہے۔ ایک سوشلسٹ ملک میں جلسوں کے لئے جلسہ گاہیں فراہم کرنے اور اختلافی مواد طبع کرنے کے حوالے سے غیر جانبداری پر مبنی انتظامات فراہم کرنے ہوں گے۔ یہ طریقہ بھی قابلِ قبول ہو سکتا ہے کہ مختلف جماعتوں کے نقطہ ہائے نظر کی نمائندگی کے لئے مختلف اخبارات کے بجائے صرف ایک اخبار ہو جس کے مختلف صفحات مختلف جماعتوں کے نظریات کے لئے مختص کر دیئے جائیں۔ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ قارئین سب جماعتوں کے نقطہ ہائے نظر سے

باخبر ہو جاتے اور بہت کم کسی کی یکطرفہ طرفداری کرتے، اور پھر اس وقت انہیں اخبار میں ایسی کوئی چیز نظر نہ آتی جس کے ساتھ انہیں اختلاف ہوتا۔

زندگی کے کچھ شعبے ایسے بھی ہیں، مثلاً آرٹ اور سائنس (سرکاری احکامات کی اجازت کے ساتھ)، اور جماعتی سیاست، جہاں ان کے درمیان مطابقت اور موافقت نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی مطلوب ہے۔ یہ ایک شعبے میں جہاں مسابقت ایک جائز اور قانونی عمل ہے، اور یہ امر بہت ہی اہم ہے کہ عوامی جذبات ایسے ہونے چاہئیں کہ کسی ناراضی یا اشتعال کے بغیر اختلافات اور تنقید برداشت کی جا سکے۔ اگر جمہوریت کو کامیاب ہونا ہے اور اسے پنپنا بھی ہے تو اس کے لئے تحمل و برداشت درکار ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ تشدد کے لئے نہ تو اس قدر زیادہ نفرت ہونی چاہئے اور نہ ہی اس کے لئے اس قدر محبت ہونی چاہئے۔ لیکن اقتدار کی تربیت اور اسے کم سے کم بے ضرر بنانے کے لئے یہ چیز ہمیں نفسیاتی حالات اور ماحول فراہم کرتی ہے۔

چوتھا حصہ

اقتدار و اختیار کو کم از کم بے ضرر بنانے اور اسے تربیت مہیا کرنے کے ضمن میں نفسیاتی حالات و شرائط، بہت سے پہلوؤں کے لحاظ سے بہت ہی مشکل ہیں۔ اقتدار کی نفسیات کے لحاظ سے ہم نے یہ دیکھا کہ ڈر، خوف، غصہ، طیش اور تمام قسم کے متشدد بھڑکنے والے جذبات، ایک راہنما کی اندھا دھند تقلید پر مجبور کرتے ہیں جو اکثر اوقات اپنے پیروکاروں کے بھروسے اور اعتماد سے فائدہ اٹھا کر ایک ظالم و جابر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ لہٰذا یہ امر بہت ہی اہم ہے کہ اگر ہم جمہوریت کی نشوونما چاہتے ہیں تو پھر ان حالات سے اجتناب کرنا ہوگا جن کے باعث عوام کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں، اور اس کے ساتھ ساتھ عوام کی اس نہج پر تربیت کی جائے کہ وہ اس قسم کا رویہ کم از کم اپنائیں۔ جب آمریت کے لئے شدید خواہش موجود ہو، تو پھر کوئی ایسی رائے جس سے عوام اختلاف کریں، اس کے باعث امن و امان کے لئے خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ سکول کے طالب علم اس طالب علم کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں جو ان کے ساتھ اختلاف کرتا ہے، اور کئی بالغ افراد کی ذہنی سطح بھی سکول کے ان طالب علموں جیسی ہوتی ہے۔ ایک غیر مرتکز آزاد خیال جذبہ جس میں شک کا عنصر پایا جاتا ہے، سماجی تعاون کو بہت ہی کم مشکل بنا دیتا ہے، اور اس طرح

آزادی زیادہ سے زیادہ ممکن ہو جاتی ہے۔

جذبہ و جوش کا احیاء کرنے والے افراد، جس طرح نازی ہیں، توانائی اور ظاہری ذاتی بے نیازی، جو اس کے ذریعے پیدا ہوتی ہے، کئی طریقوں کے ذریعے تعریف وتوصیف کرتی ہے۔ تکلیف، درد، حتیٰ کہ موت سے بھی لاتعلقی، جیسے اجتماعی جذبات، تاریخی لحاظ سے عام ہیں۔ جہاں یہ صورت حال موجود ہوتی ہے، وہاں آزادی ناممکن ہوتی ہے۔ پُر جوش اور سرگرم افراد کو صرف قوت کے ذریعے ہی روکا جا سکتا ہے، اور اگر انہیں روکا نہ جا سکے، تو وہ دوسروں کے خلاف قوت و طاقت استعمال کریں گے۔ میں 1920 میں پیکنگ میں ایک بالشویک سے ملا تھا، جو کمرے میں اِدھر اُدھر پھرتے ہوئے مکمل سچائی بیان کر رہا تھا "اگر ہم فلاں شخص کو ہلاک نہیں کرتے، تو وہ ہمیں ہلاک کر دے گا۔" اس طرح کا رویہ، اگر راستے کے ایک طرف اپنایا جائے، تو اس کے باعث راستے کے دوسری طرف بھی یہی رویہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر ایک جنگ اختتام تک جاری رہتی ہے، جس میں ہر فرد فتح کے آگے سر جھکا دیتا ہے۔ جنگ کے دوران، حکومت فوجی وجوہات کی بنا پر ظالمانہ قوت حاصل کر لیتی ہے، اور بالآخر اگر یہ فتحیاب ہوتی ہے، تو پھر یہ اپنی قوت کو باقی رہ جانے والے دشمنوں کو کچلنے کے لئے استعمال کرتی ہے، اس کا نتیجہ اس مقصد سے بالکل مختلف ہوتا ہے جس کے لئے سرگرم اور پُر جوش افراد نے جنگ کی۔ جوش و جذبہ، جس کے ذریعے مخصوص نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں، نے کبھی بمشکل ہی اپنے مطلوبہ نتائج حاصل کئے۔ اجتماعی جوش و جذبے کی تعریف، ناعاقبت اندیشی اور غیر ذمہ دارانہ ہے کیوں کہ اس کے ذریعے نہایت ہی بھیانک نتائج جنگ، اموات اور غلامی پیدا ہوتے ہیں۔

آمریت کو جنم دینے میں جنگ سب سے اہم کردار ادا کرتی ہے، اور اس نظام کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے جس کے تحت غیر ذمہ دارانہ اقتدار و قوت کے حصول سے ہر ممکن اجتناب کیا جاتا ہے۔ اس لئے، جنگ کی روک تھام، ہمارے مسئلے کا ایک لازمی حصہ ہے — میں کہتا ہوں کہ ایک بہت ہی لازمی حصہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی نظام حکومت یا معاشی نظام کے قطع نظر، اگر دنیا ایک دفعہ جنگ کے خطرے سے بے نیاز ہو جاتی، تو وہ بذاتِ خود اپنے حکمرانوں کے ظلم و ستم سے نجات حاصل کرنے کے طریقے ڈھونڈ لیتی۔ اس کے برعکس، ہر قسم کی جنگ، خاص طور پر جدید جنگ کے باعث ایک بزدل قوم کی طرف سے اپنا قائد تلاش کرنے اور

معاشرے میں سے بہادرانہ جذبات ختم کرنے کے ذریعے آمریت کا راستہ ہموار کرتی ہے۔

جنگ کے خطرے کے باعث وسیع پیمانے پر ایک خاص قسم کی نفسیاتی فضا پیدا ہو جاتی ہے، اور اسی طرح، باہمی طور پر یہ فضا جہاں جہاں بھی موجود ہوتی ہے، وہاں جنگ کے خطرے کے علاوہ آمریت کی موجودگی کا امکان بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس لئے ہمیں اس قسم کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنا ہوگا، جس کے باعث معاشروں میں اجتماعی ہیجان پیدا ہونے کا کم از کم امکان موجود ہو، اور اکثر لوگ جمہوریت کے کامیاب عملی نفاذ اور مشق کے قابل ہو جائیں۔

جمہوریت کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ ان دو خصوصیات کو وسیع پیمانے پر پھیلا دیا جائے جو ابتدائی طور پر باہم متضاد معلوم ہوتی ہیں۔ ایک طرف تو افراد کو لازمی طور پر چاہئے کہ وہ ایک مخصوص حد تک خود انحصاری حاصل کریں، اور اپنے فیصلوں کی حمایت کرنے کے لئے ایک خاص حد تک آمادہ ہوں۔ مزید برآں، سیاسی نظریات کی مختلف اطراف میں تبلیغ و پرچار ہونا چاہئے جس میں کئی ایک لوگ حصہ لیں۔ دوسری طرف افراد کو اکثریت کا اپنے خلاف فیصلہ بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ ان میں سے دونوں شرائط بے سود ثابت ہو سکتی ہیں، عوام بہت زیادہ اطاعت گزاری کا رویہ اپنا سکتے ہیں، اور بہت سے لوگ ایک ظالم و جابر راہنما کی تقلید کر سکتے ہیں جو آمریت پر منتج ہو، یا پھر ہر جماعت شیخی باز اور گھمنڈی ہو، جس کے باعث قوم ابتری اور افراتفری کا شکار ہو جاتی ہے۔

اس حوالے سے تعلیم کیا کردار ادا کر سکتی ہے، اس کے متعلق دو عنوانات کے تحت غور کیا جا سکتا ہے۔ پہلا، کردار، خوبی اور جذبات کے لحاظ سے، دوسرا، تدریس اور تعلیم کے لحاظ سے۔ آیئے، پہلے اول الذکر کا جائزہ لیتے ہیں۔

اگر جمہوریت کے ضمن میں اس کی قابلِ عمل صورت مطلوب ہے، تو افراد کو چاہئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ نفرت اور غیر تعمیری اقدامات سے دور رہیں، اس کے علاوہ خوف، ڈر اور خوشامد کو بھی اپنے قریب نہ پھٹکنے دیں۔ یہ احساسات ممکنہ طور پر معاشی حالات کے باعث پیدا ہو سکتے ہیں، لیکن جس کا میں ذکر اور اس پر غور کرنا چاہتا ہوں، وہ تعلیم ہے جو افراد کو ان احساسات میں ملوث ہونے سے زیادہ سے زیادہ کردار ادا کرتی ہے۔

کچھ والدین اور کچھ سکول، ابتدا میں بچوں کو مکمل اطاعت گزاری سکھانے کی کوشش کرتے

ہیں، یہ ایک ایسی کوشش ہوتی ہے جس کے ذریعے ایک بچہ یا تو غلام بن جاتا ہے، اور یا پھر ایک باغی اور انقلابی، اور ان دونوں اقسام کے افراد جمہوریت کو مطلوب نہیں ہیں۔ جہاں تک تحت قواعد وضوابط کے تحت تعلیم کے اثرات کا تعلق ہے، میرا موقف یہی ہے جو یورپ کے تمام آمروں کا تھا۔ جنگ کے بعد، یورپ کے تقریباً تمام ممالک میں ایسے آزاد خیال سکول قائم ہو گئے تھے جہاں نہ زیادہ قواعد وضوابط نافذ تھے، اور نہ ہی اساتذہ کا زیادہ احترام کیا جاتا تھا۔ لیکن ایک ایک کر کے فوجی مطلق العنان حکمرانوں بشمول عوامی جمہوریہ روس نے سکولوں میں تمام قسم کی آزادی سلب کر لی اور پرانے معمول کی طرف واپس لوٹ گئے اور اساتذہ کو حقیر مقام دیا جانے لگا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آمر، سکولوں میں ایک خاص حد تک آزادی کا احترام کرتے ہیں تا کہ جمہوریت کے لئے مناسب تربیت مہیا کی جائے، اور سکولوں میں موجود مطلق العنانیت، ریاست میں مطلق العنانیت کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

جمہوریت میں ایک مرد یا عورت کو نہ تو غلام اور نہ ہی باغی ہونا چاہئے بلکہ ایک شہری ہونا چاہئے۔ یعنی ایک شخص نے دوسروں میں کچھ حد تک حکومتی اندازِ فکر پیدا کیا ہوتا ہے، اس کے علاوہ وہ اس ضمن میں بھی لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ وہ خود میں حکومتی اندازِ فکر پیدا کریں۔ جب جمہوریت موجود نہیں ہوتی، تو پھر حکومت کا اندازِ فکر اور رویہ ایسا ہوتا ہے جیسے ایک آقا، اپنے غلام کے ساتھ رویہ اپناتا ہے، لیکن جہاں جمہوریت موجود ہوتی ہے، وہاں برابر کی بنیاد پر تعاون پایا جاتا ہے کہ جہاں ایک شخص ایک خاص حد تک اپنے رویے کا اظہار کر سکتا ہے۔

اس کے باعث بہت سی جمہوریتوں میں مسائل جنم لیتے ہیں۔ جنہیں ''اصول'' کہا جاتا ہے۔ اکثر لوگ اصول، ایثار، ایک مقصد کے لئے جرأت مندانہ عزم ولگن وغیرہ کے متعلق بات کرتے ہیں، کے متعلق قدرے پر تشکیک انداز میں جائزہ لیا جاتا ہے۔ ایک معمولی سے نفسیاتی تجزیے کے ذریعے اکثر یہ ظاہر ہو جائے گا کہ ان نفیس ناموں کے ذریعے جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے، واقع بہت مختلف ہوتا ہے، مثلاً فخر، یا نفرت، یا انتقام کی خواہش، جو ایک مثال کی حیثیت اختیار کرنے کے علاوہ، مثالیت کی ایک شائستہ قسم کے طور پر جمع کیا جاتا ہے اور اسے انفرادی حیثیت دی جاتی ہے۔ ایک جنگجو محبِ وطن، جو اپنے ملک کے لئے لڑنے پر آمادہ بلکہ مشتاق ہوتا ہے، اس میں ہلاکت خیزی سے حاصل ہونے والی خوشی ومسرت ایک معقول حد تک موجود ہونے کا شبہ محسوس ہوتا

ہے۔ ہمدردانہ جذبات رکھنے والے عوام، وہ عوام جنہیں اپنے بچپن میں ہمدردی ملی ہوتی ہے، اور وہ خوش رہے ہوتے ہیں، اور جنہوں نے اپنی جوانی کے ایام میں دنیا کو ایک پُرسکون اور طمانیت بخش مقام کی حیثیت سے اختیار کیا ہوتا ہے، ان میں اس قسم کی مثالیت پیدا نہ ہوتی جسے حب الوطنی کہتے ہیں، یا طبقاتی جنگ، یا اور کوئی چیز نہیں، اکٹھے ہو کر بے شمار افراد کو قتل کرنے پر مشتمل ہے۔ میرا خیال ہے کہ مثالیت کی ظالمانہ صورتوں کی طرف رجحان بچپن میں مسرت وخوشی سے محرومی کے باعث بڑھ جاتا ہے اور اگر جذباتی طور پر ابتدائی تعلیم، اس طرح ہوتی جس طرح ہونی چاہئے تھی، تو پھر یہ کم ہو جاتا۔ مختلف قسم کا تعصب اور جوش وخروش، ایک ایسا نقص اور کمزوری ہے جو کچھ تو جذباتی اور کچھ علمی وفکری نوعیت کی ہے، اور اسے زائل کرنے کے لئے ایک ایسی قسم کی خوشی ومسرت کی ضرورت ہے جو افراد کے دلوں میں مہربانی اور رحم دلی کا جذبہ پیدا کرتی ہے، اس کے علاوہ ایک خاص قسم کی ذہانت بھی پیدا ہوتی ہے جو ذہنی طور پر ایک سائنسی عادت کے ارتقاء کا باعث ہوتی ہے۔

جمہوریت کو کامیاب بنانے کے لئے عملی زندگی میں جس مزاج اور طبع کی ضرورت پیش ہوتی ہے، عین اسی طرح علمی اور فکری دنیا میں سائنسی مزاج اور طبع کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، اور یہ چیز شک وشبے اور بنیاد پرستی کا درمیانی راستہ ہے۔ اس کے ساتھ منسلک سچائی نہ تو قطعی طور پر قابلِ حصول اور نہ ہی مکمل طور پر ناقابلِ حصول ہوتی ہے، یہ ایک خاص حد تک قابلِ حصول ہوتی ہے، اور اس میں بھی بہت مشکل محسوس ہوتی ہے۔

مطلق العنانیت اور جبر واستبداد، اپنی جدید شکل میں ہمیشہ عقیدے کے ساتھ منسلک ہوتا ہے، مثلاً جیسے ہٹلر، مسولینی اور سٹالن کے زمانے میں صورت حال موجود تھی۔ جب بھی کہیں مطلق العنانیت اور جبر واستبداد موجود ہوتا ہے، تو پھر عقائد کا ایک مجموعہ نوجوان نسل کے ذہنوں میں ان کے سوچنے کے قابل ہونے سے پہلے ہی ٹھونس دیا جاتا ہے اور یہ عقائد اس قدر تسلسل اور مستقل طور پر سکھائے اور پڑھائے جاتے ہیں کہ یہ امید کی جا سکتی ہے کہ بعد ازاں بچپن میں سکھائے گئے ان عقائد کی اثر پذیری سے فرار ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہ عقائد ونظریات، انہیں سچ سمجھنے کے لئے کسی وجہ کے بغیر ہی بچپن ہی میں بچوں کے ذہنوں میں سرایت کر دیئے جاتے ہیں۔ انہیں طوطے کی طرح رٹایا جاتا ہے، اس کے علاوہ وسیع پیمانے پر خوف وہیجان اور تبلیغ وپرچار کے

ذریعے بھی یہ عقائد عوام کے اذہان میں جذب کر دیئے جاتے ہیں۔ جب اس انداز میں جو متضاد نظریات و عقائد پڑھائے جاتے ہیں، تو پھر دو قسم کے خیالات پیدا ہوتے ہیں جن کا آپس میں ٹکراؤ ہوتا ہے۔ ہر قسم کی خود کار اثر پذیری اس نظریے کو جنم دیتی ہے کہ ہر چیز جو بہت ہی مقدس و محترم ہے، وہ اس گروہ کی فتح ہی سے مشروط ہے، اور ہر خوفناک و بھیانک چیز مخالف گروہ ہی سے متعلق ہے۔ اس قسم کے متعصب اور کٹر گروہ پارلیمان میں ملاقات نہیں کر سکتے اور نہ ہی کہہ سکتے ہیں: ''ہم دیکھتے ہیں کہ کس کے پاس اکثریت ہے۔'' ان کا یہ رویہ قطعی طور پر گھٹیا اور عامیانہ ہوتا کیونکہ ہر گروہ ایک مقدس مقصد کے دعوے دار ہوتا ہے۔ اگر آمریت کی روک تھام مقصود ہے تو پھر اس قسم کے تعصب اور کٹر پن سے نجات حاصل کرنا ہوگی اور اس ضمن میں اٹھائے جانے والے اقدامات تعلیم کا ایک لازمی حصہ تصور کیے جا سکتے ہیں۔

اگر تعلیم و تربیت کا انتظام و اہتمام میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں اپنے بچوں کو ہر قسم کے حالات حاضرہ کے متعلق گہری معلومات مہیا کرتا اور ان کو فصیح البیانی کے ذریعے ان کا ادراک و احساس کرنے کا سبق دیتا، اور وہ اپنے اپنے اسکولوں کی جانب سے بی بی سی کے ذریعے بیان کرتے۔ پھر استاد کو چاہیے کہ وہ ان بچوں کو پیش کیے جانے والے دلائل کا خلاصہ پیش کرنے کو کہے اور پھر نہایت ہی نرمی اور شائستگی سے انہیں بتائے کہ فصیح البیانی اور ٹھوس دلیل کے درمیان براہِ راست تعلق ہے۔ ایک جمہوری ملک کے شہریوں کے لئے فصیح البیانی میں مہارت کا حصول بہت ہی زیادہ اہم ہے۔

آج کے اس جدید دور میں اپنے نظریات کی تبلیغ و پرچار کرنے والوں نے یہ طریقہ منظم اشتہاری مہم چلانے والے افراد سے سیکھا ہے۔ جنہوں نے غیر منطقی عقائد و نظریات کی ترویج و تبلیغ کے لئے راستہ ہموار کیا۔ تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ فطری خوش اعتقادی سے اَن پڑھ افراد کی بداعتقادی کا سامنا کر سکے۔ یعنی جب وہ ایک معقول وجہ کی موجودگی میں بھی ایک بیان کو مسترد کر دیں۔ اس کی مثال کے طور پر میں چھوٹے بچوں کے ایک سکول کا ذکر کرتا ہوں کہ جہاں بچوں کو ٹافیوں کی دو اقسام کے درمیان فیصلہ کرنا ہے۔ ایک ٹافی بہت اچھی، اور دوسری ٹافی نہایت خراب ہے۔ جسے اشتہار بازی کی مکمل اور بہترین مہارت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں انہیں دو مقامات کے متعلق فیصلہ کرنے کا کہتا ہوں جہاں وہ چھٹیاں گزارنے جا سکتے ہیں۔

ایک نہایت ہی اچھی جگہ ہے جسے ایک نقطے کے ذریعے دکھایا گیا ہے اور ایک نہایت ہی بُرا مقام ہے جسے نہایت ہی خوبصورت اور بہترین پوسٹروں کے ذریعے دکھایا گیا ہے۔

ممکن ہے کہ تاریخ کی تدریس بھی اسی جذبے کے تحت کی جاتی ہو۔ ماضی میں بہت سے ممتاز مقرر اور مصنفین تھے جنہوں نے نہایت دانائی اور دانش کے ذریعے ان تصورات و نظریات کا دفاع کیا جن پر آج کل کے زمانے میں کسی کو بھی یقین نہیں ہے، مثلاً جادوگروں کی حقیقت، غلامی کا وظیفہ وغیرہ۔ میں نوجوانوں کو کہوں گا کہ وہ فصیح البیانی میں مہارت حاصل کریں، اور ان کی طرف سے موثر اور بھدی تقریر کی بھی ساتھ ساتھ تعریف کروں۔ اور پھر آہستہ آہستہ مجھے حالات حاضرہ کے متعلق آگاہ کرنا چاہئے۔ ان کی تاریخ کے متعلق مجھے انہیں سپین (یا اس وقت جو بھی سب سے زیادہ اختلافی مسئلہ موجود ہو) کے متعلق سب سے پہلے یہ بتانا چاہئے کہ ''ڈیلی میل'' نے کیا لکھا ہے اور پھر بعد میں یہ بتانا چاہئے کہ ''ڈیلی ورکر'' نے کیا لکھا ہے۔ اور پھر مجھے ان سے پوچھنا چاہئے کہ دراصل واقعات کیا پیش آئے اور نتیجہ کیا برآمد ہوا۔ بلا شک وشبہ، ایک جمہوری ملک کے شہریوں کے لئے تحقیق وجستجو میں مہارت حاصل کرنے کی نسبت اخبارات کے مطالعے کے ذریعے کچھ چیزوں کے متعلق معلومات حاصل کر لینی چاہئے کہ اس وقت کیا واقعات پیش آئے۔ اس مقصد کے لئے یہ ضروری ہوتا کہ جنگ عظیم کے دوران اہم اور مشکل لمحات کے متعلق اخبارات میں ذکر اور بعدازاں سرکاری طور پر مذکور واقعات کے درمیان تقابل کیا جاتا۔ اور پھر جنگ کا اخبارات کے ذریعے پیش کیا گیا جنگی پاگل پن آپ کے شاگردوں کے ذہنوں پر بہت زیادہ مہلک اثر مرتب کرتا تو آپ کو چاہئے کہ انہیں خبردار کریں کہ جب تک وہ اپنے ذہن میں ایک متوازن اور محتاط انداز فکر نہیں اپناتے، تو وہ پھر ابتدا ہی میں راتوں رات، حکومت کی طرف سے پھیلائی گئی دہشت اور خون ریزی کے ضمن میں پاگل پن کا شکار ہو جائیں گے۔

بہر حال میں نہیں چاہتا کہ میں ایک خالص منفی جذباتی رویے کے حق میں بیان دوں۔ میں یہ بھی نہیں کہہ رہا کہ تمام اچھے اور پختہ احساسات کو غیر تعمیری تجزیے کا رہین منت ہونا چاہئے۔ میں اس رویے کی صرف ان جذبات کے لحاظ سے حمایت کر رہا ہوں جو جذباتی پاگل پن کی بنیاد ہیں، وہ جذباتی پاگل پن جس کے باعث جنگیں اور آمریتیں جنم لیتی ہیں۔ لیکن دانش اور دانائی محض علمی و فکری نہیں ہوتی، علم و فکر راہنمائی مہیا کر سکتا ہے لیکن وہ قوت پیدا نہیں کر سکتا جو عملی قدم

اٹھانے کے لئے درکار ہے۔ یہ قوت لازمی طور پر جذبات میں سے پیدا کرنی چاہئے۔ مطلوبہ سماجی نتائج و حالات کے حامل جذبات اس طرح بآسانی پیدا نہیں کئے جا سکتے جس طرح نفرت، طیش اور خوف پیدا ہوتا ہے۔ ان جذبات کی تخلیق کا زیادہ تر انحصار ابتدائی بچپن اور پھر معاشی حالات پر ہوتا ہے۔ بہر حال وہ مفید اور موثر معلومات مہیا کرنے کے لئے جن کی بنیاد پر اچھے اور بہترین جذبات پنپ سکیں، معمولی اور عام تعلیم کی فراہمی کے لئے کچھ بھی کیا جا سکتا ہے اور اس امر کا ادراک حاصل کیا جا سکتا ہے کہ انسانی زندگی کے لئے کیا چیز اہم اور لازمی ہو سکتی ہے۔

ماضی میں یہ سب کچھ مذہب کا ایک مقصد رہا ہے۔ بہر حال کلیساؤں کے اور بھی مقاصد تھے اور ان کی جبر و استبدادیت کے باعث مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ وہ لوگ جن کے لئے روایتی مذہب پر مزید ایمان ممکن نہیں ہے، دوسرے ذرائع اور طریقے بھی موجود ہیں۔ کچھ لوگوں کو اپنی مطلوبہ طمانیت اور سکون، موسیقی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، اور کچھ لوگ شاعری کے ذریعے اپنے لئے طمانیت حاصل کرتے ہیں اور کچھ لوگوں کے لئے علم فلکیات، ان کے اس مقصد کی تکمیل کر دیتا ہے۔ جب ہم اس تاروں بھری کائنات کے حجم اور قدیمی حیثیت پر غور کرتے ہیں، تو پھر قدرے غیر اہم سیاروں کے متعلق اختلافات، اپنی کچھ اہمیت کھو بیٹھتے ہیں اور ہمارے اختلافات کی شدت ایک معمولی اور عامیانہ مضحکہ خیز صورت حال نظر آتی ہے۔ اور جب ہم اس منفی جذبے سے نجات حاصل کر لیتے ہیں، تو پھر ہم زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ ادراک و احساس کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں کہ موسیقی یا شاعری، تاریخ یا سائنس، حسن یا دکھ، غم کے ذریعے ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ انسانی زندگی میں حقیقی اہم چیزیں، انفرادی حیثیت کی حامل ہیں، بلکہ وہ چیزیں نہیں ہیں جو میدانِ جنگ میں واقع ہوتی ہیں یا ایک بیرونی طور پر مسلط کردہ مقصد کے لئے سیاست میں ٹکراؤ ہوتا ہے، اور یا پھر دو فوجیں آپس میں جنگ کرتی ہیں۔ ایک معاشرے کے لئے ایک منظم زندگی بہت ضروری ہے، لیکن یہ منظم زندگی، ایک خودکار عمل کے مانند ضروری ہے، اور اس چیز کے مانند ضروری نہیں جس کی اپنی طور پر کوئی اہمیت نہیں۔ انسانی زندگی میں سب سے زیادہ اہم چیز کی سب سے بہترین مثال وہ ہے جس کے متعلق تمام عظیم مذہبی پیشواؤں نے تعلیم دی ہے۔ جو لوگ کاروباری یا اجتماعی ریاست پر یقین رکھتے ہیں، ان کا موقف یہ ہے کہ ہماری اعلیٰ [illegible] ی سرگرمیاں [illegible] بہرحال میں یہ کہتا ہوں ہم سب لوگ اپنی اپنی بہترین کامیابی مختلف طریقوں کے ذریعے حاصل

کرتے ہیں اور ایک گروہ کی طرف سے جذباتی یگانگت، صرف کم سطح پر ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔

ایک وسیع النظر و آزاد خیال اور مطلق العنان ریاست میں یہ لازمی فرق ہے کہ اول الذکر کی نظر میں ریاست کی فلاح و بہبود بالآخر افراد کی فلاح و بہبود میں مضمر ہوتی ہے جبکہ موخرالذکر کے نقطہ نظر کے مطابق ریاست کی باری سب سے آخر میں آتی ہے اور افراد کو محض لازمی اجزاء کی حیثیت دی جاتی ہے جن کی فلاح و بہبود عارفانہ اور زاہدانہ مطلق العنانیت کے ماتحت ہونی چاہئے جو حکمرانوں کے مفادات کا محافظ ہوتا ہے۔ قدیم رومیوں کا کچھ حد تک نظریہ "ریاستی وفاداری" تھا لیکن مسیحیت نے شہنشاہوں سے جنگ کی اور بالآخر جیت گئی۔ افراد کی اہمیت کے یقین کے لحاظ سے آزاد خیالی، مسیحیت کی روایت کی تقلید کر رہی ہے، اس کے مخالفین بعض مسیحی نظریات و عقائد کا احیاء کر رہے ہیں۔

ابتدا ہی سے ریاست کے پیروکاروں نے تعلیم کو کامیابی کی کلید سمجھا ہے۔ مثال کے طور پر اس نظریئے کو فشٹ (Fichte) کی کتاب "Address to the German Nation" جس میں تعلیم کے متعلق سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے:

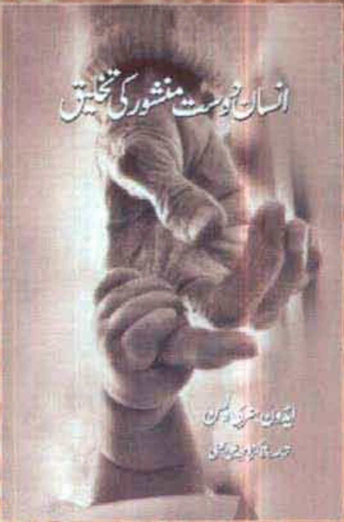
"اگر کوئی یہ کہتا ایک شخص جو اپنے شاگرد کو صحیح چیز بتا سکتا ہے اور نہایت زوردار انداز میں اسے اپنانے کے لئے کہہ سکتا ہے، تو پھر کوئی شخص اس سے زیادہ تعلیم کیسے طلب کر سکتا ہے، خواہ وہ یہ تجاویز اپنے ذاتی معاملات کے ضمن میں استعمال کرتا ہے، اور اگر وہ استعمال نہیں کرتا، یہ اس کا اپنا قصور ہے، وہ اپنی مرضی کا مالک ہے جسے کسی قسم کی کوئی بھی تعلیم اس سے نہیں چھین سکتی۔" تعلیم کے متعلق جس طرح میں سوچتا ہوں، اس سے کہیں بہتر طور پر تعلیم کی خصوصیات بیان کرنے کے لئے مجھے جواب دینا چاہئے کہ محض اس کی پہچان اور نشاندہی کے لئے اور شاگردوں کی اپنی مرضی کی نگرانی کرنے کے لئے تعلیم کی پہلی غلطی موجود ہوتی ہے اور اپنی کمزوری اور محرومی کا خاص طور پر اعتراف کر لیتا ہے۔ جب انسان اس چیز کا اعتراف کر لیتا ہے، اور پھر اس کی طرف سے زبردست اور شدید کارروائی کے بعد، اس کی خواہش پر کوئی قدغن نہیں رہے گی، یعنی وہ "اچھائی" اور "برائی" کے درمیان غیر ارادی طور پر لڑھکتا رہتا ہے، یہ

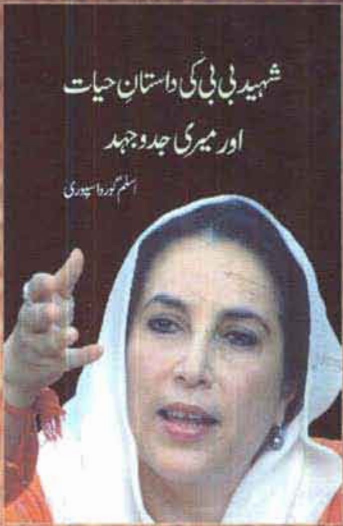
> اعتراف کر لیتا ہے کہ اس نے نہ تو اپنی خواہش تبدیل کی اور نہ ہی اسے تبدیل کر سکتا ہے، یا چونکہ خواہش، انسان کا لازمی بنیادی حصہ ہے، بذات خود انسان کے لئے اور وہ اسے قطعی طور پر ناممکن سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس نئی تعلیم کے باعث آزادی کا اس لحاظ سے قلع قمع ہوتا جو اس نے اپنے پیش نظر رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔"

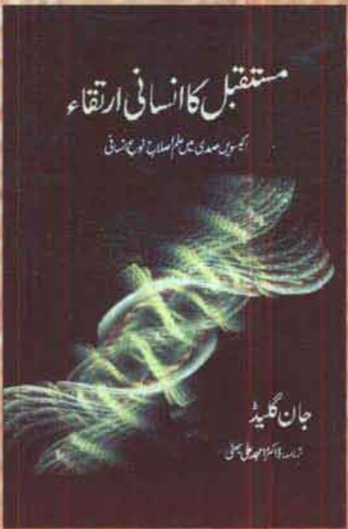
''اچھے افراد'' تخلیق کرنے کی اس کی خواہش کی یہ وجہ نہیں ہے کہ وہ بذات خود ''برے'' افراد سے بہت اچھے ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''صرف ان اچھے افراد کے باعث ہی جرمن قوم زندہ رہ سکتی ہے ''برے'' افراد کی موجودگی میں یہ لازمی طور پر غیر ممالک سے اتحاد کرے گی۔''

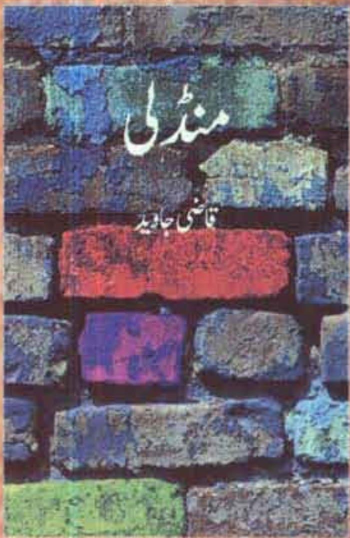
اس تمام احوال کو اس امر کی قطعی مخالفت کا اظہار کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے جو آزاد خیال معلم حاصل کرنے کا خواہش مند ہوگا۔ جہاں تک اپنی مرضی سے محروم ہونے کا تعلق ہے، اس کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ انفرادی رویے کو مضبوط کرے، وہ علم اور معلومات حاصل کرنے کے لئے جس قدر ممکن ہوگا، سائنسی علم حاصل کرے گا، وہ اپنے عقائد و نظریات کو شہادت کے لحاظ سے عارضی اور اثر پذیر بنانے کی کوشش کرے گا، وہ اپنے شاگردوں کے سامنے خود کو ہر فن مولا ظاہر نہیں کرے گا اور نہ ہی وہ اس خواہش میں مبتلا ہوگا کہ وہ قطعی طور پر اچھی چیزوں کی تلاش میں ہے۔ خواہش اقتدار و قوت، ایک معلم کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے، جہاں تک سیاست دان کا تعلق ہے، جس شخص پر تعلیم کے ضمن میں بھروسا کیا جا سکتا ہے، اسے لازمی طور پر چاہئے کہ اپنے شاگردوں کی خاطر ان کی دیکھ بھال کرے، محض یہ نہ ہو کہ جیسے پراپیگنڈہ کرنے والی فوج کے سپاہی، اپنے مقصد کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ فشٹ اور طاقتور افراد جن کے لئے مثالی کردار زمانہ ماضی سے ہی موجود ہیں، جب وہ بچوں کو یہ سوچتا ہوا دیکھتے ہیں کہ ''یہاں ایک ایسا مواد اور سامان موجود ہے جسے میں کام میں لا سکتا ہوں، جس کے متعلق میں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس سے ایک مشین کے مانند کام لیا جائے، اضطراری طور پر مجھے زندگی سے لطف محسوس کرنے سے روکا جا سکتا ہے، کھیلنے کی میری خواہش کے آگے بند باندھا جا سکتا ہے [illegible] باطنی مقاصد کے لئے زندگی گزارنے سے منع کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب چیزیں میری مرضی کے بغیر مجھ پر مسلط کی جاتی ہیں، لیکن یہ سب چیزیں، سالہا سال سکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد جو

میں خود پر مسلط کروں گا، ختم ہو جائیں گی، سحر انگیزی، تخیل و تصور، فن، آرٹ، اور سوچنے کی قوت کو اطاعت اور فرمانبرداری کے باعث ختم ہونا ہی ہوگا، جب خوشی انسان سے روٹھ جائے گی، تو اس کے پاگل ہونے کے امکانات بڑھ جائیں گے اور پھر آخر میں، میں اپنے جسمانی وجود کو اس طرح پاؤں گا جس طرح پتھر کی کان سے نکلا ہوا ایک پتھر یا کوئلے کی کان سے لگا ہوا کوئلہ۔ جن جنگوں کی میں قیادت کروں گا، کچھ افراد ہلاک ہو جائیں گے، کچھ زندہ رہیں گے، وہ افراد جو ہلاک ہوتے ہیں، نہایت خوشی سے بہادروں کے مانند مر جائیں گے، جو افراد زندہ رہیں گے، میرے غلاموں کے مانند زندہ رہیں گے، اور ان کی غلامانہ ذہنی کیفیت ایسی ہوگی جس طرح میرے سکول عادی ہوں گے۔ جس شخص کو نوجوانوں سے فطری محبت ہے، اس کے لئے یہ تمام کچھ بہت ہی ہولناک ہے، عین اسی طرح جس طرح ہم اپنے بچوں کو یہ بتاتے ہیں کہ اگر ان کے لئے ممکن ہے تو وہ موٹر کاروں سے خود کو ختم ہونے سے بچالیں، لہٰذا ہمیں ان کو یہ بھی بتانا چاہیے کہ ظالم تعصب اور پاگل پن سے ان کو بچنا چاہیے، اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہمیں ذہنی آزادی پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، جو کسی حد تک مشکوک ہو اور قطعی طور پر سائنسی ہو، اور جہاں تک ممکن ہو، صحت مند بچوں کے لئے درکار زندگی کا فطری لطف محفوظ رکھنا چاہیے۔ یہ سب کچھ آزاد خیال تعلیم کا فرض اور ذمے داری ہے: برتری اور حاکمیت کے علاوہ دیگر امور کو اہمیت دینے کا احساس، ایک آزاد معاشرے سے منسلک دانا اور دانش مند افراد تخلیق کرنے میں مدد و معاونت اور پھر انفرادی تخلیقیت کے لحاظ سے آزادی کے ساتھ شہریت کے امتزاج اور ادغام کے ذریعے انسانوں کو اس صلاحیت کی فراہمی جس کے ذریعے ان کی زندگی اس قدر شاندار اور پُرشکوہ ہو جس کے متعلق صرف چند لوگوں کو یقین ہے کہ اسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔









فکشن ہاؤس
18- مزنگ روڈ لاہور
E-mail: fictionhouse2004@hotmail.com
Ph:042-7249218, 7237430
ISBN 978-9146-02-0